طنز و مزاح

آپ بھی شرمسار ہو

عطاء الحق قاسمی

آپ بھی شرمسار ہو

(طنز و مزاح)

عطاء الحق قاسمی

فضل الرحمن ''مولانا'' کے بغیر!

اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے' کچھ عرصے سے مولانا فضل الرحمان کا نام کہیں پڑھتا ہوں تو میرے ذہن میں مجاہد اردو فضل الرحمان لاہوری کا خاکہ ابھرتا ہے' شاید اس لئے کہ جس طرح کا جہاد مجاہد اردو فضل الرحمن لاہوری اردو کے لیے کر رہے ہیں' کچھ اسی قسم کا جہاد مولانا فضل الرحمان اسلام کے لیے کرنے میں مشغول ہیں۔ اگر مولانا کو میرا یہ جملہ پڑھ کر غصہ نہیں آیا تو اس کی وجہ یہی ممکن ہے کہ انہوں نے فضل الرحمان لاہوری کو نہیں دیکھا۔ آج بیٹھے بیٹھے مولانا کی یاد اخبار کے مطالعہ کے دوران ستائی جب میں نے یہ خبر پڑھی کہ اپوزیشن ارکان نے بجٹ کی کاپیاں زمین پر پھینکیں تو مولانا نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اپوزیشن کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ ان پر بسم اللہ لکھی ہوئی تھی۔

میں سوچا کرتا تھا کہ ملتی محمود کے عالم دین صاحب زادے نے ایک ایسی خاتون وزیراعظم کے پیچھے کیسے ''نیت'' باندھ لی جو بہت لبرل اور سیکولر ٹائپ خاتون ہیں' مولانا کے متذکرہ بیان سے میرا یہ عقدہ حل ہو گیا ہے۔ دراصل مولانا خود ہی کچھ ایسے تنگ نظر نہیں ہیں' انہیں اس کے کوئی غرض نہیں کہ بجٹ کے اندر کیا ہے' اس پر عوام کا بھرکس کس طرح نکالا گیا ہے' ان کے لیے یہی کافی ہے کہ باہر بسم اللہ لکھ دیا گیا ہے'' رند خراب حال'' آج تک خواہ مخواہ جناب واعظ کو برا بھلا کہتے رہے ہیں' میرے نزدیک یہ باہمی رابطے کی کمی کی وجہ سے ہے چنانچہ اس دیرینہ مخاصمت کو ختم کرنے کے لیے رند حضرات کو چاہیے کہ وہ مولانا فضل الرحمان سے رجوع کریں اور ان سے فتویٰ طلب کریں کہ اگر شراب کی بوتل کے باہر بسم اللہ لکھ دیا جائے تو کیا بوتل کو مقدس حیثیت حاصل نہیں ہو جائے گی؟ اسی طرح حرام مال کھانے والے خواہ مخواہ معاشرے کی تنقید کا نشانہ بنتے رہتے ہیں بلکہ ان دنوں جگہ جگہ انہیں کمینہ' ذلیل اور نجانے کیا کیا لکھا ہوتا ہے' حالانکہ ان حرام مال کھانے والوں میں سے اکثر نے اس کمائی سے جو عظیم الشان محل تعمیر کرائے ہیں' ان پر ''ہذا من فضل ربی'' کے الفاظ درج ہوتے ہیں' مولانا سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا ایسے پاکیزہ گھروں میں رہنے والوں پر ''تبرا'' جائز ہے؟ ''فضل ربی'' اور ''فضل الرحمان'' کا تو ویسے بھی مطلب ایک ہے۔ چنانچہ مولانا پر اس کی وضاحت کی زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مجھے کچھ اچھی طرح یاد نہیں کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی تحریک میں مولانا کا کیا کردار رہا ہے۔ غالباً وہ اس کے خلاف ہوں گے کیونکہ قادیانیوں نے اپنے سینوں پر کلمہ طیبہ سجایا ہوا ہے اور یوں مولانا کی منطق کی رو سے انہیں غیر مسلم قرار دے کر ان کی توہین نہیں

کی جاسکتی۔ غرضیکہ بجٹ کی کاپی پر محض "بسم اللہ" لکھے ہونے کی وجہ سے مولانا نے اسے جس طرح قابل احترام قرار دیا ہے' اس سے ایک نہیں' بے شمار مسئلے حل ہو گئے ہیں اور اگر مولانا حوصلے سے کام لے کر ان سب امور کے بارے میں جن کا ابھی ذکر ہوا ہے' اس کشادہ دلی کا مظاہرہ کریں جس کا مظاہرہ انہوں نے بجٹ کے ضمن میں فرمایا ہے تو گنہ گاروں اور پارساؤں کے درمیان ایک عرصے سے جو خواہ مخواہ کی خلیج حائل ہے وہ دور ہو جائے گی۔ ویسے بھی آئندہ انتخابات میں مولانا کو مذہبی حلقوں سے ووٹ ملنے کی امید کچھ کم کم ہے' لہٰذا کیوں نہ وہ اپنے "حلقہ انتخاب" کو مضبوط بنائیں' "دین داری" سے انہیں امور خارجہ کمیٹی کی چیئرمینی ملی ہے' ممکن ہے "دنیاداری" سے ان کے "درجات" مزید بلند ہوں کہ مسئلہ تو اب درجات بلند ہونے کا ہے' دین یا دنیا کی حیثیت تو صرف سیڑھیوں کی رہ گئی ہے۔

جو بات میں نے ابھی ابھی عرض کی ہے وہ بلا جواز نہیں' اس کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں' "اصلی تے وڈے" مسلم لیگی اقبال احمد خان نے دنیا کو سیڑھی بنایا تو "دین" تک رسائی حاصل کی یعنی "اسلامی نظریاتی کونسل" کے چیئرمین بن گئے۔ مولانا فضل الرحمن نے دین کو سیڑھی بنایا تو انہیں دنیا حاصل ہو گئی یعنی امور خارجہ کی کمیٹی کی چیئرمینی ان کے ہاتھ آئی۔ ہماری محترمہ بے نظیر بھٹو بھی "دنیا" کے رستے "دین" تک پہنچی ہیں' بلکہ انہیں تو "دین" اور "دنیا" دونوں کی نعمتیں میسر آئی ہیں' وہ ملک کی وزیراعظم بھی ہیں اہل مغرب کے سیاسی اور نظریاتی سانچے میں ڈھلی ہوئی بھی ہیں اور جید علماء پوری طرح مؤدب ہو کر ان کے پیچھے ہاتھ باندھے بھی کھڑے ہیں۔ بے نظیر کے ہاتھ میں تسبیح اور ان علماء کے ہاتھوں میں درخواستیں ہیں۔ سو اب یہ بھول جائیں کہ کون دین دار ہے اور کون دنیادار۔ اب اصل چیز کمانداریا مالدار ہونا ہے۔ الحمدللہ مولانا فضل الرحمن اور دوسرے علماء اب اپنے اسلاف کی طرح فاقے نہیں کرتے اور استعمار کے سامنے سینہ سپر نہیں ہوتے۔ انہیں جینا آ گیا ہے اور یہ شعر بھی ان کے ذہن نشین ہو گیا ہے۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

اور آرام سے ایسے ہی نہیں گزرتی' اس کے لیے حکومتی پارٹی کے بنائے ہوئے بجٹ تک کو مقدس قرار دینا پڑتا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے مولانا فضل الرحمان نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر جو منطق وضع کی ہے' وہ اتنی ناقابل توجہ بھی نہیں ہے۔ اگر وہ ایک مقدس لفظ کے اضافہ سے پورے پیکر کو مقدس قرار نہ دیں تو وہ خود بھی صرف "فضل الرحمان" رہ جاتے ہیں' ذرا سوچیں فضل الرحمان مولانا کے بغیر کیا چیز نظر آ سکتے ہیں؟

◆◆◆

قصہ ایک شاعرہ اور ایک پاگل کا!

بات پرانی ہے لیکن خدا جانے میرے ذہن میں ابھی تک کیوں تازہ ہے؟ آپ نوشی گیلانی کو جانتے ہیں نا؟ ایک گڑیا سی لڑکی ہے اور خوب صورت شعر کہتی ہے اسلام آباد میں اس کے اولین شعری مجموعے کی تقریب رونمائی ہوئی تو اگلے روز قومی اسمبلی کے بعض اراکین نے اس بات پر خاصی لے دے کی کہ اس تقریب میں پانچ مرکزی وزراء آخر کس خوشی میں شریک ہوئے؟ نیز یہ کہ خبرنامے میں اس تقریب کو اتنی کوریج کیوں دی گئی؟ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وزیراعظم نے اس معاملے کی تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ قومی اسمبلی کے ارکان کے اعتراض اور اس اعتراض کی پانچ کالمی خبر کے پیچھے الحمد والے عزیزی صفدر کا ہاتھ ہے کہ اس سے نوشی گیلانی اور ان کی کتاب کی خوب پبلسٹی ہوئی ہے ویسے میں یہ خبر پڑھ کر خاصا محظوظ ہوا کیونکہ جس روز یہ تقریب منعقد ہوئی اس روز اتفاق سے میں بھی اسلام آباد میں موجود تھا تقریب میں جو "کالعدم" وزراء موجود تھے ان میں سے ایک تو جناب فخر امام تھے جو تقریب کی صدارت کر رہے تھے دوسرے جناب عبدالستار لالیکا تھے تیسرے جناب جناب صدیق کانجو اور چوتھے جناب جاوید ہاشمی تھے۔ یہ چار وزیر تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان کی تقریریں بھی سنیں پانچواں وزیر وہاں مجھے کوئی نظر نہیں آیا حالانکہ شیخ رشید کی گنجائش موجود تھی۔ اور ہاں اکیڈمی آف لیٹرز کے چیئرمین جناب غلام ربانی آگرو اور ڈائریکٹر جنرل جناب افتخار عارف بھی مقررین میں شامل تھے۔ جناب چیئرمین نے تو اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے محترمہ نوشی گیلانی کو کتاب اور قلم کا تحفہ بھی پیش کیا جس سے اہل محفل کو اندازہ ہوا کہ ادبی تنظیم "آئینہ" نے یہ تقریب دراصل اکیڈمی آف لیٹرز کے تعاون سے منعقد کی تھی۔ وزراء اور اکیڈمی کے ادیب افسران کے علاوہ متعدد دانشوروں نے بھی اس محفل میں خطاب کیا۔ حاضرین کی بہت بڑی تعداد بھی یہاں موجود تھی فاضل ایم این اے نے قومی اسمبلی میں یہ سوال بھی اٹھایا کہ وزراء کے علاوہ اکیڈمی کے افسران' دانشور اور اتنے سارے حاضرین اس تقریب میں کیا کر رہے تھے؟ میرے خیال میں اس سوال کی گنجائش بھی موجود تھی اگر پوچھ لیا جاتا تو کیا حرج تھا؟

اتفاق سے اس تقریب کی کوریج بھی میں نے اسی روز ٹیلی وژن سے دیکھی جس میں نوشی گیلانی کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلائی گئی تھی۔ یعنی حسب معمول یا حسب پالیسی یہ خبر بھی دراصل وزیر نامہ تھی اور اس میں کسی دانشور کا نام میں لیا گیا تھا بعض "کمزور دل" خواتین و حضرات اپنی تقریرات میں وزراء کو بلاتے ہی اس لیے ہیں کہ ٹی وی پر کوریج ممکن ہو سکے کیونکہ صدارت اگر پاکستان کا

سب سے قابل احترام ادیب بھی کر رہا ہو تو ٹی وی پر اس کی کوریج ٹی وی کی اخلاقیات کے منافی ہے۔ لالیکا صاحب کو بھی غالباً اسی لیے بلایا گیا تھا اس روز لالیکا صاحب کی تقریر سے اندازہ ہوا کہ علم و ادب سے انہیں خاصا گہرا لگاؤ ہے اور ظاہر ہے اس میں نوشی گیلانی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ویسے ارباب حکومت میں اگر کوئی دانشور ہو تو اسے ٹی وی کی اس واہیات پالیسی کا نوٹس ضرور لینا چاہیے ورنہ یہی سمجھا جائے گا کہ دانشوروں میں آ کر دانشوروں جیسی بات کرنے والا شخص ہی اندر سے بس وزیر ہوتا ہے۔

تاہم یہ کالم میں ایک اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے لکھ رہا ہوں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اہل سیاست ادب و دانش کو ایک گھٹیا اور کم تر چیز کیوں سمجھتے ہیں اپنی تقریروں کو خوب صورت لفظوں اور شعروں سے مزین کرنے والے سیاست دانوں کا رویہ عمومی طور پر اہل دانش کے ضمن میں زیادہ سے زیادہ مربیانہ ہی ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی علمی و ادبی تقریب میں شمولیت فرمائیں تو ان کا سارا زور بیان اہل دانش کو مشورے دینے ہی پر صرف ہوتا ہے کہ انہیں یہ لکھنا چاہیے اور یہ نہیں لکھنا چاہیے۔ حالانکہ یہ اہل دانش ہیں جن کے لفظوں سے اہل سیاست کو روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ قومی اسمبلی میں اٹھائے جانے والے سوال کے پس منظر میں بھی یہی لاشعوری سوچ کارفرما تھی کہ وزراء حضرات ان "ویلوں" کے ٹبر میں کیوں گئے جو لوگوں کو مثالی معاشرے کے خواب دکھاتے ہیں اور یوں اہل سیاست کی نیندیں حرام کرتے ہیں وزراء حضرات روزانہ جیسیوں تقریبات میں شرکت کرتے ہیں جن میں سے بیشتر جہالت کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن ان کی کوریج پر کبھی تنقید نہیں ہوئی مخالف دائرے کی طرف سے صرف یہ کہا جاتا ہے کہ فروغ جہالت کے ضمن میں ان کی کوششوں کو بھی ٹی وی نظر انداز نہ کرے اس ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ دانش کے علاوہ خواتین کو بھی ہمارے ہاں کم تر درجے کی مخلوق سمجھا جاتا ہے اور ان کی عزت افزائی پوری طرح ہمیں ہضم نہیں ہوتی اور یوں اگر دیکھا جائے تو "کالعدم" وزرائے کرام نے اسلام آباد کی جس محفل میں شرکت کی تھی اس میں بیک وقت دو "لعنتیں" اکٹھی تھیں ایک یہ کہ یہاں علم و دانش کا تذکرہ تھا اور دوسرے یہ محفل ایک خاتون کی شعری کاوشوں کے حوالے سے تھی چنانچہ قومی اسمبلی میں ان وزراء کے پٹی بند سیاست دانوں کی طرف سے ان کی کچھائی ہونا ہی چاہیے تھی کہ سائیاں کدھر تے ودھائیاں کدھرے؟ ان حالات میں خود ادیبوں اور دانشوروں کو سوچنا چاہئے کہ ان کی عزت ارباب سیاست کا مقتدی بننے میں ہے یا ان کی حیثیت امام کی سی ہے۔ ان میں سے جونسی حیثیت وہ اپنے لیے خود منتخب کریں گے زمانہ اسی کے مطابق ان سے برتاؤ کرے گا۔

میں نہیں جانتا کہ سابق وزیر اعظم نے اس "سکینڈل" کے ضمن کیا اقدامات کئے یوں تو یہی مضحکہ خیز صورت حال کی لیپا پوتی کے لیے اہل سیاست کو گول مول سی باتیں کرنا پڑتی ہیں کہ یہ بھی اہل سیاست کی خود ساختہ مجبوری ہے ورنہ سابق وزیر اعظم اعتراض کرنے

والے رکن اسمبلی سے کہہ سکتے تھے کہ بھائی پہلی دفعہ میرے وزراء کسی ڈھنگ کی محفل میں گئے ہیں اور یوں انہیں عقل کی باتیں سننے اور کرنے کا موقع ملا ہے تم نے اس پر بھی اعتراض کر دیا؟ ایک وزیر صاحب پاگل خانے کے دورے پر گئے جب وہ پاگلوں سے خطاب فرما رہے تھے ایک پاگل اپنی جگہ سے اٹھا اور وزیر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "تم جھوٹ بولتے ہو" جلسے کے اختتام پر وزیر صاحب پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ پر برس پڑے کہ تم نے اس پاگل کو روکا کیوں نہیں۔ تو پیارے قارئین سپرنٹنڈنٹ نے وزیر صاحب کو وہی جواب دیا جو میں نے تھوڑی دیر پہلے سابق وزیر اعظم صاحب کی طرف سے اعتراض کرنے والے اسمبلی کے ممبران کے لیے تجویز کیا ہے!

◆◆◆

اب ایک فیصلہ مجھے بھی کرنا ہے!

میں یہ سطریں بہت دکھ کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں۔

جب میں چھوٹا سا تھا تو میرے والد نے میرے ذہن میں یہ بات بٹھانا شروع کر دی کہ رزق حلال سے بہتر کوئی رزق نہیں اور یہ کہ کبھی کسی دوسرے کی شان و شوکت سے متاثر نہ ہونا۔ والد ماجد نے یہ بات اتنے تواتر سے میرے ذہن میں بٹھائی کہ ان کی یہ نصیحت میرے شعور اور لاشعور کا حصہ بن گئی۔ والد ماجد کی تنخواہ چند سو روپے ماہوار تھی اور ہم دس افراد خانہ تھے' روکھی سوکھی کھاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔ میرا بچپن اور جوانی ماڈل ٹاؤن میں گزرا ہے' میرے تمام دوست کروڑ پتی والدین کے بیٹے تھے اور میں' اپنے والد کی اعلیٰ تربیت کے طفیل ان کے درمیان سر اونچا کر کے چلتا تھا' مجھے اپنے ان دو دھاری پاجاموں پر کبھی ندامت محسوس نہیں ہوئی تھی' جو میں بغیر استری کے سکول پہن کر جایا کرتا تھا!

پھر میری شادی ہوئی' بچے ہوئے اور میں نے وہی "زہر" اپنی بیوی اور بچوں کے کان میں پگھلانا شروع کر دیا کہ رزق حلال سے بہتر کوئی رزق نہیں چنانچہ میری بیوی نے مجھ سے کبھی زیور کی فرمائش نہیں کی اور میرے بچوں نے مجھ سے کبھی وہ چیز طلب نہیں جو میں اپنی محدود آمدنی میں سے ان کے لیے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ جب میرے رشتے کی بات چل رہی تھی' ہمارے دفتر کے ایک دوست نے کروڑ پتی آڑھتی کے اکلوتی بیٹی کا رشتہ میرے لئے تلاش کیا تھا مگر اس طرح کے "دوسرے نسخوں" کی طرح میں نے راتوں رات کروڑ پتی بننے کا یہ نسخہ بھی استعمال کرنے سے انکار کر دیا' میں نے فیصلہ کیا کہ نہ جہیز لوں گا نہ جہیز دوں گا اور نہایت سادگی سے شادی کی رسم انجام ہو گی' میں نیا نیا امریکہ سے آیا تھا' چنانچہ چند افراد پر مشتمل بارات کے ساتھ جن میں جناب مجید نظامی' آغا شورش کاشمیری' علامہ احسان الٰہی ظہیر اور مولانا عبدالرحمان (جامعہ اشرفیہ) بھی شامل تھے' نسبت روڈ کی ایک گلی میں اپنے سسرال گیا اور ڈولی لے کر گھر آ گیا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے اولاد دی تو میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ میں اپنے بیٹوں کو بھی "نیلام گھر" میں کھڑا نہیں کروں گا' ان کی شادیاں سفید پوش گھرانوں میں سادگی سے ہوں گی' میں ان کی شادیوں پر کوئی رقم خرچ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں' میں بچیوں کے والدین کو بھی کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ میں اپنے خاندان میں سب سے زیادہ "غریب" ہوں۔ میرے پاس کار ہے' رنگین ٹیلی وژن ہے' وی

سی آر ہے' ٹیلی فون ہے' دس مرلے کا گھر ہے' دو کمروں میں ائیر کنڈیشنر ہیں ان سب چیزوں کے لیے مجھے تین نوکریاں کرنا پڑتی ہیں' میری بیوی بھی ملازمت کرتی ہے چونکہ یہ سب خون پسینے کی کمائی ہے اور اس میں رزق حرام کی ذرا سی بھی آمیزش نہیں' اس لیے میں چار تنخواہوں کے باوجود ایک سو روپے ماہوار بچت کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں ہر ماہ مہینے کے آخر میں کبھی دفتر سے اور کبھی کسی دوست سے مجھے قرض لینا پڑتا ہے۔ میرے بچے اب بڑے ہو رہے ہیں' پہلے میں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں منعقد ہونے والی شادیوں میں شرکت کرتا تھا تو وہاں اٹھنے والے لاکھوں روپے کے اخراجات دیکھ کر مجھے تشویش نہیں ہوتی تھی مگر جب سے میرے بچے بڑے ہوئے ہیں' میں انہیں اس طرح کی شادیوں میں لے جانے سے گریز کرنے لگا جہاں دو ہزار افراد کے کھانے کا اہتمام ہوتا ہے' پورے بازار میں چراغاں کیا گیا ہوتا ہے۔ دلہن کو کئی کئی کلو زیور پہنایا جاتا ہے" مجرے کی محفل برپا ہوتی ہے اور لاکھوں روپے گانے والیوں کے سروں پر سے وار دیئے جاتے ہیں۔ یہ شادیاں اگر جاگیرداروں' صنعت کاروں' کاروباری لوگوں یا خاندانی رئیسوں کے بیٹوں بیٹیوں کی ہوتیں تو میں اپنے بچوں کو ان شادیوں میں لے جانے سے اجتناب نہ کرتا لیکن یہ شادیاں انکم ٹیکس' کسٹم' ایل ڈی اے' پولیس' ایف آئی اے' محکمہ انسداد رشوت ستانی اور اسی طرح کے دوسرے محکموں سے وابستہ گریڈ گیارہ سے گریڈ سترہ تک کے ملازمین کی ہیں' جن کی تنخواہیں میری تنخواہ سے دس گنا کم ہیں میرے بچے جانتے ہیں یہ حرام کا پیسہ ہے جس کی کھلم کھلا نمائش کی جا رہی ہے۔ الحمدللہ انہیں یہ بھی علم ہے کہ اس کے سحر میں مبتلا نہیں ہوتا لیکن کیا ان لوگوں نے میرے بچوں کو ایک بہت بڑے ذہنی ابتلاء اور بحران میں مبتلا نہیں کر دیا؟ جب وہ ان شادیوں میں شرکت کے لیے مجھ سے صرف نئے جوتوں کی فرمائش کرتے ہیں تو کیا مجھے صرف اتنی فرمائش پوری کرنے کے لیے بھی اپنا بجٹ دیکھنا چاہیے؟ ان شادیوں میں پانچ پانچ دس دس ہزار روپے کی سلامی دی جاتی ہے' میری بیوی اس کے لئے مجھ سے صرف پانچ سو روپے طلب کرتی ہے تو کیا اس وقت میں حلال حرام کا فلسفہ لے کر بیٹھ جاؤں؟ کیا میں اپنے تمام احباب سے قطع تعلق کر لوں؟ کیا میں اس پورے معاشرے سے اپنا تعلق توڑ لوں جہاں کردار کی عزت نہیں ہے بلکہ سلامیوں اور "برابر کی سطح" پر میل جول ہی سے ساری عزت کا دارومدار ہے۔

میرے بچے اب بڑے ہو رہے ہیں اور دو چار سال میں' میں نے ان کی شادیاں کرنی ہیں اور اب یہ شادیاں اس سادگی سے نہیں ہو سکتیں جس طرح میں نے سوچا تھا۔ میں ان دو چار سالوں میں اگر کفایت شعاری کی حد کروں گا تو پچاس ساٹھ ہزار روپیہ سیو کر لوں گا مگر پچاس ساٹھ ہزار روپے تو میرا دوست عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی ایک اسی طرح کی تقریب میں شرکت کے لیے لیتا ہے۔ ابھی تو خدا کا بہت فضل ہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے مگر میں نے ابھی تک جن اخراجات کا ذکر کیا ہے وہ میں نے بیٹوں کی شادی پر اٹھتے دیکھے

ہیں' تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں اپنے بیٹوں کو نیلام گھر میں کھڑا کر دوں؟ اچھے پیسے مل جائیں گے۔ انہیں متذکرہ محکموں میں سے کسی محکمے میں بھرتی کرا دوں؟ کئی نسلیں معزز کہلائیں گی خود بھی "معزز" بن جاؤں؟ سب کے گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔ میرے دوست مجھ سے ناراض ہیں کہ تم اپنی کالم نگاری کا نہ خود کوئی فائدہ اٹھاتے ہو نہ ہمارے کام آتے ہو جبکہ تمہارے کچھ بھائی بند کروڑوں میں کھیل رہے ہیں' میں نے اپنے ان دوستوں کی باتوں پر کبھی دھیان نہیں دیا تھا لیکن میں اب کہیں جا کر محسوس کرنے لگا ہوں کہ یہ معاشرہ دولت کا پجاری ہو چکا ہے' اس میں وہی صاحب عزت ہے جو صاحب ثروت ہے۔ خاندان کے چھوٹے دولت کی وجہ سے بڑے بن جاتے ہیں اور خاندان کے بڑے ان کے سامنے چھوٹوں کی طرح مئودب ہو جاتے ہیں' یہ کوئی نہیں پوچھے گا کہ تم نے یہ دولت کہاں سے لی نہ حکومت نہ معاشرہ' لیکن اگر تم نے خود پر رزق حرام کے دروازے بند کر لیے ہیں تو تمہیں ہزاروں چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا ضرور کرنا پڑے گا۔ مجھے والد مرحوم کی سب باتیں یاد ہیں لیکن اب میں سوچنے لگا ہوں کہ کیا وہ اس دور میں پریکٹیکل رہ گئی ہیں؟ اور جو کچھ میں اپنے بچوں کو سکھا رہا ہوں' اس کے نتیجے میں وہ اس معاشرے میں کہیں حقارت بھری نظروں کا نشانہ بن کر تو نہیں رہ جائیں گے؟ ان دنوں مجھے ان تمام معاملات کے بارے میں نئے سرے سے سوچنا ہے اور پھر حتمی فیصلہ کرنا ہے!

◆◆◆

غیر تربیت یافتہ ڈرائیور اور "تربیت یافتہ" ٹریفک پولیس!

آج میں ٹریفک کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ آج تک میں نے جن مسائل پر لکھا ہے الحمدللہ وہ سب حل ہو گئے مثلاً بے روزگاری' رشوت ستانی' منشیات' بلیک میلنگ' جہالت' سیاسی بوالعجبیاں' معاشی چیرہ دستیاں وغیرہ میرے کالموں کی وجہ سے معاشرے سے ناپید ہو گئی ہیں! اب صرف ٹریفک کا مسئلہ رہ گیا ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ مسئلہ میرے کالم سے بھی حل نہیں ہوگا کہ دراصل میں خود اسے حل نہیں کرنا چاہتا۔ مثلاً جب میں گھر سے نکلتا ہوں اور میرے سامنے والی گاڑی کا ڈرائیور، نہ کیئر نوٹا ہو ہونے کی وجہ سے دایاں ہاتھ باہر کو نکالتا ہے تو بقول شفیق الرحمان میں سمجھتا ہوں شاید وہ اپنے کسی دوست کو بلا رہا ہے ایک خیال یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ ممکن ہے وہ یہ چیک کرنا چاہ رہا ہو کہ کہیں باہر بارش تو نہیں ہو رہی؟ اگر کوئی خیال ذہن میں نہیں آتا تو وہ یہ کہ وہ دائیں ہاتھ مڑنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب وہ دائیں مڑ رہا ہوتا ہے میں اس کی پسلیوں میں گھس رہا ہوتا ہوں!

خواتین و حضرات! مجھے ایک عادت جلد بازی کی بھی ہے۔ فلائٹ اناؤنس ہوتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور جہاز میں سوار ہونے والا پہلا مسافر ہوتا ہوں چنانچہ ایک گھنٹہ بند جہاز میں بیٹھ کر اباسیاں لیتا رہتا ہوں' سینما میں فلم ختم ہونے سے پہلے باہر گیٹ پر پہنچ چکا ہوتا ہوں کہ مجھے پتہ نہیں کس بات کی جلدی ہوتی ہے۔ اور ٹریفک سگنل ابھی سرخ ہوتا ہے تو میں اپنی گاڑی آہستہ آہستہ کھسکاتا چوک کے عین درمیان میں پہنچ جاتا ہوں جس سے دوسری طرف سے آنے والا ٹریفک بند ہو جاتا ہے۔ مجھے اپنی گاڑی کسی غلط جگہ پر پارک کرنے کا بھی شوق ہے جس سے ٹریفک میں معقول حد تک خلل واقع ہو گئی دفعہ پھاٹک وغیرہ بند ہونے پر میں اپنی گاڑی مخالف لین میں لے آتا ہوں تاکہ پھاٹک کھلتے ہی میں زن سے اپنی گاڑی نکال کر لے جاؤں' میری تقلید میں باقی حضرات بھی اپنی گاڑیاں میرے پیچھے لگا دیتے ہیں چنانچہ جب پھاٹک کھلتا ہے' ٹریفک بند ہو جاتا ہے۔ خواتین و حضرات یہ اور اس طرح کی بہت سی دوسری حرکتیں ہیں جس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ میں ٹریفک کے مسائل حل نہیں کرنا چاہتا۔

ٹریفک کے مسائل حل طلب رکھنے کی خواہشمند ایک پارٹی اور بھی ہے اور وہ مختلف سرکاری محکمے ہیں جو سارا سال مختلف حیلوں بہانوں سے سڑکیں کھودنے میں لگے رہتے ہیں لگتا ہے جیسے انہیں کسی خزانے کی تلاش ہے۔ مثلاً دو سال مسلسل احتجاجی مظاہروں کے بعد ملتان روڈ حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی اور اب پھر کسی محکمے نے اس کی کھدائی شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ایک طویل عرصے تک اس

سڑک کو ٹریفک کے لیے تقریباً بند ہی سمجھیں۔ ٹریفک دشمنی میں میرے اور سرکاری محکموں کے علاوہ مندرجہ بھی پیش پیش ہیں جو صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میاں بیوی میں بہت سلوک ہے بچے پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں اوپر سے منشیات کی کمائی اور رشوت کے نرخوں میں اضافے کی وجہ سے کاریں اور موٹر سائیکل بھی بہت ہو گئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں سڑکیں آبادی اور بڑھتی ہوئی ٹرانسپورٹ کے بوجھ سے کراہنے لگی ہے۔ چنانچہ یہ تیسرا فریق ہے جو ٹریفک کے مسائل حل کرنے کا خواہشمند ہیں!

مگر خواتین و حضرات ایک فریق اور بھی ہے جو ٹریفک کے مسائل حل نہیں کرنا چاہتا اور وہ محکمہ ٹریفک ہے۔ یہ میرا خیال نہیں ہے بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ ٹریفک پولیس کی موجودگی میں بلکہ ان کی نگرانی میں ویگنوں اور بسوں والے ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے منتھلی لی ہوتی ہے یا یہ کہ یہ بسیں اور ویگنیں ان کی اپنی ہوتی ہیں یا یہ کہ کسی بااثر سیاسی شخصیت کی ہوتی ہیں۔ میں یہ کچھ نہیں مانتا۔ ایک بچہ اپنی ماں سے کہنے لگا ماں میں اپنے ایک دوست سے یہ شرط لگا آیا ہوں کہ کوا سفید ہوتا ہے۔ ماں نے کہا بیٹے تم تو یہ شرط ہار جاؤ گے کیونکہ سب جانتے ہیں کوا کالا ہوتا ہے۔ بیٹے نے کہا ماں شرط تو میں تب ہاروں گا اگر میں مانوں گا کہ کوا کالا ہوتا ہے۔ سو میں بھی نہیں مانتا کہ ٹریفک کی بدحالی میں ٹریفک کے محکمے کا بھی کوئی قصور ہے! میں تو یہ بھی مانتا کہ محکمہ ٹریفک کی پلاننگ میں بھی کوئی کمی ہے کہ اس پلاننگ کی وجہ سے خاصی رونق لگی رہتی ہے۔ کبھی کوئی راؤنڈ اباؤٹ بنا دیا جاتا ہے کبھی ڈھا دیا جاتا ہے چنانچہ لکشمی چوک اور ایم اے او کالج کے راؤنڈ اباؤٹ توڑنے سے ایک نہایت نصیحت آموز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ آپ لکشمی چوک یا ایم اے او کالج کے چوک کا ایریل ویو لیں تو آپ کو لگے گا جیسے روز محشر کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ چنانچہ اللہ سے ڈرنے والے لوگ عبرت پکڑنے کے لیے ان دنوں قبرستان کا چکر لگاتے ہیں یا ان مقامات کا رخ کرتے ہیں جن کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے اسی طرح بچوں کی دلچسپی اور تفریح کے لیے بعض سڑکوں پر بھول بھلیاں بھی بنائی گئی ہیں۔ مثلاً سرکلر روڈ خصوصاً مسلم مسجد کا قریبی علاقہ اب بھول بھلیوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ بچوں اور بڑوں کے لیے تفریحی مقامات کی تعمیر ٹی ڈی اے کا کام تھا مگر یہ ٹریفک والوں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اب جوابی خیر سگالی کے اظہار کے طور پر ٹریفک کا کام ایل ڈی اے والوں کو سنبھالنا چاہیے۔

ٹریفک پولیس والوں سے عوام کو ایک شکایت یہ ہے کہ ٹریفک کا انتظام کرنے میں انہیں جہاں ذرا سی بھی دشواری کا امکان نظر آئے وہ اس سے بچنے کے لئے پوری سڑک کو بلاک کر دیتے ہیں چنانچہ دس افراد کا جلوس بھی سڑک پر نظر آئے تو پر ہجوم ٹریفک کا رخ تنگ گلیوں کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور یوں وہ ہر قسم کی ذمہ داری سے فرار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ساری ہو لیکن مجھے تو ٹریفک والوں کی یہ ادا پسند ہے کہ وہ بندہ بندہ کو پہچانتے ہیں اور اس کے مطابق ڈیلنگ کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ہفتہ ٹریفک

کے دوران ریگل چوک میں میں نے ٹریفک کے ایک کانسٹیبل کو دیکھا کہ میگا فون ہاتھ میں پکڑے وہ شہریوں کو ٹریفک کے آداب سے آگاہ کر رہا تھا۔ اعلانات ملاحظہ ہوں!

سفید ٹیوٹا والے صاحب! براہ کرم اپنی گاڑی زیبرا کراسنگ سے پیچھے رکھیں۔ شکریہ

ویسپا والے صاحب! تھوڑا سا صبر بھی کر لیا کریں آگے مٹھائی تقسیم نہیں ہو رہی۔ ذرا پیچھے ہٹیں، شکریہ

اوئے سائیکل والے! اندھا ہو گیا ہے۔ تجھے زیبرا کراسنگ نظر نہیں آتا۔ یہ پھٹے ہوئے جوتے جیسی سائیکل پیچھے رکھو۔ شکریہ!

([illegible])

دو ملاؤں میں مرغی حرام!

ہزارہ کے ایک عالم مولانا عبدالرحیم ہزاروی نے اداکارہ ریما سے شادی کرنے کے پختہ عزم کا اظہار کیا ہے۔ مولانا نے کہا کہ ''مسجد میں طالب علموں کو پڑھانے اور دیگر امور کے صرف آٹھ سو روپے ماہوار ملتے ہیں جس سے میرا اپنا گزارہ مشکل ہے' اگر ریما سے میری شادی ہوگئی تو اس کی آمدنی میری پوری زندگی کے لیے کافی ہوگی۔'' مولانا نے کہا کہ ''اگر لوگ مجھے پاگل کہیں تو بے شک کہیں' میں بہرحال ریما سے شادی کروں گا بلکہ کسی اور مولوی نے اگر میرا نکاح نہ پڑھایا تو میں خود اپنا نکاح پڑھوں گا۔ میرا یہ مشن ضرور کامیاب ہوگا اور شاید میں بھی فلمی دنیا کا ہیرو بن جاؤں۔ پہلی بیوی کو چار سال پہلے طلاق دے چکا ہوں کیونکہ وہ کان تھی۔ آئندہ طلاق کا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ میری آئندہ بیوی ریما ہوگی!''

میں نے مولانا کا یہ اخباری بیان بڑی دلچسپی سے پڑھا اور شرعی حوالے سے اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے کیونکہ بیان کسی عام آدمی کا نہیں' اخباری اطلاع کے مطابق ایک ممتاز مذہبی گھرانے کے عالم دین چشم چراغ ہے۔ شریعت کی رو سے مرد کو دوسری شادی کی اجازت ہے اور یوں مولانا عبدالرحیم ہزاروی کی دوسری شادی کی خواہش کو غیر شرعی بہرحال قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کسی اداکارہ سے بھی شادی کرنے میں کوئی ہرج نہیں' اس پر اگر اعتراض ہو سکتا ہے تو معاشرے کو ہو سکتا ہے شریعت کو نہیں کہ شریعت کی رو سے تو کسی غیر مسلم اہل کتاب خاتون سے بھی شادی جائز ہے البتہ مولانا نے ریما کی آمدنی پر جو نظر رکھی ہے' اس سے ان کی نیت کے خلل کا اندازہ ہوتا ہے' یک تو شرعاً بیوی اپنی محنت کی کمائی کی خود مالک ہے اور دوسرے مولانا نے اپنی متوقع بیوی کی آمدنی کا ذکر کر کے اپنے اصل عزائم سے پردہ اٹھا دیا ہے چنانچہ لگتا ہے مولانا کا ارادہ نکاح کا نہیں' کاروبار کا ہے تاہم میرا یہ بیان غلط بھی ہو سکتا ہے کیونکہ شادی کے بعد میاں بیوی میں اگر ''من تو شدم'' ''تو من شدی'' والی محبت ہو جاتی ہے تو پھر میاں یا بیوی کی کوئی چیز بھی اپنی نہیں رہتی بلکہ مشترکہ ملکیت بن جاتی ہے اور میر نہیں ہے کہ مولانا عبدالرحیم ہزاروی کے ذہن میں شاید یہی بات ہے جس کی بنا پر انہوں نے متذکرہ بیان دیا ہے!

میں ابھی تک عبدالرحیم ہزاروی صاحب کو بے دریغ ''مولانا'' لکھتا جا رہا ہوں' یہ تحقیق کیے بغیر کہ وہ مولانا ہیں بھی یا نہیں۔ کیونکہ اخبار والے تو محض خوش وقتی کے لیے بسا اوقات بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ ویسے مجھے ذاتی طور پر ہزاروی صاحب کے مولانا

ہونے میں شبہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ موصوف نے داڑھی رکھی ہوگی اور بچوں کو قرآن پڑھاتے ہوں گے ورزشی طور پر تھوڑے بہت بلے بھی ہوں گے۔ یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ ہمارے مولوی حضرات پارسائی اور تقوے کے کوہ ہمالیہ ہیں اور دوری پر عاشق نہیں ہوسکتے بلکہ میرے نزدیک وہ صرف اس کا اظہار نہیں کرسکتے بقول ذوق

خلاف شرع تو یوں شیخ تھوکتے بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتے بھی نہیں

جو کام لوگوں کی نظروں میں چھپ کر کیے جائیں اور جو کھلم کھلا کیے جائیں ان میں زمین آسمان کا فرق ہے چنانچہ کسی مولوی سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی مرضی سے خود کو پبلک کے سامنے ایکسپوز کردے۔ "مولانا" عبدالرحیم ہزاروی نے اگر ایسا کیا ہے تو وہ مولانا نہیں ہیں بلکہ سادہ لوح ہیں۔ بچوں کو رنگین فلمی ایڈیشن سے محفوظ رکھنے کے لیے سے سرہانے کے نیچے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ اس سے ایک تو بچوں کا اخلاق خراب نہیں ہوتا اور دوسرے رات کو تکیے میں پورے سکون سے اس کا مطالعہ بھی ممکن ہے۔

بہرحال صورت حال جو بھی ہے مولانا عبدالرحیم ہزاروی کو میرا مشورہ ہے کہ ان کا جذبہ صادق سہی' لیکن شادی بیاہ کے معاملات اخبار میں طے نہیں ہوا کرتے بلکہ اس کے لیے تھوڑا پاپڑ بیلنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مولانا کو چاہیے کہ وہ اداکارہ ریما کی والدہ سے رابطہ قائم کریں یا براہ راست ریما کی منشاء دریافت کریں' اگر انہیں ان مراحل میں کامیابی ہو تو انہیں احتیاطاً گوجر خان کے مولانا صدیقی سے بھی مذاکرات کر لینے چاہئیں کہ ایک اخباری اطلاع کے مطابق وہ بھی ریما کے دعویدار ہیں۔ ورنہ یوں خدشہ ہے کہ کہیں دو ملاؤں کے درمیان مرغی حرام نہ ہو جائے۔ اسی طرح اگر مولانا مزید احتیاط کرنے کی پوزیشن میں ہوں تو بہتر ہوگا جام معشوق علی سے بھی رابطہ کریں۔ جام معشوق علی جس کے باپ کے فرزند ہیں کوئی پتہ نہیں اس کا دل "مولانا" کی حالت دیکھ کر پسیج جائے اور وہ ان کے لیے کوئی بڑی سے بڑی قربانی دینے پر تیار ہو جائیں۔

اقبال کے گانے کا عاشق!

میر ایک لاہور یا دوست حج کرنے گیا تو وہاں سخت بیمار پڑ گیا اس نے خانہ کعبہ میں بیٹھ کر اپنے دوست کو خط لکھا کہ میں شدید بیمار ہوں آپ داتا دربار جا کر میرے لیے دعا کریں۔ مجھے یہ واقعہ آج ایک دوست صاحب کا بیان پڑھ کر یاد آ گیا ہے۔ جنہوں نے عہد حاضر کے ادیبوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ملت کی ڈوبتی کشتی بچانے کے لیے اپنے قلم کو چپو بنائیں اور اس کشتی کو منجدھار سے نکال لے جائیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ ہمارے عہد میں ایسے ادیب موجود ہیں جن کا مقام بہت ارفع و اعلیٰ ہے لیکن جس قوم نے اقبال جیسے شاعر اور فلسفی کے کلام کو قوالی تک محدود کر دیا ہو اسے راہ راست پر لانے کے ضمن میں آج کا ادیب کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟ ہمارے ریڈیو اور ٹی وی کے کارپردازان کا تو یہ حال ہے کہ وہ اقبال کو بھی فانی بدایونی قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا کلام جن دھنوں پر گایا جاتا ہے وہ سب کے سب مرثیے کی دھنیں ہیں۔ آپ ان پر سینہ کوبی تو کر سکتے ہیں دل میں کوئی ولولہ اور جوش محسوس نہیں کر سکتے!

خواتین و حضرات! ہماری قوم ویسے بھی ایک عرصے سے سینہ کوبی کی عادی ہو چکی ہے اور یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہم نے یہ سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کا نتیجہ ایوب خاں کے مارشل لاء کی صورت میں نکلا۔ پھر یحییٰ خان ہمارا مقدر بنے ان سے جان چھوٹی تو ذوالفقار علی بھٹو کی صورت میں ہمیں سول مارشل لاء کا تحفہ دیا گیا۔ لیکن چلیں یہ حکومت جیسی بھی تھی اس میں سوں کا دم چھلا تو لگا ہوا تھا مگر پھر یوں ہوا کہ بھٹو کے خلاف اتحاد بنے اور ایک دفعہ پھر سینہ کوبی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ ضیاء الحق کا مارشل لاء ہمارے حصے آیا۔ آج کل پھر سیاسی جماعتیں سینہ کوبی میں مشغول ہیں۔ دیکھیں اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے ویسے آج تک تو یہی ہوتا آیا ہے کہ ہم خواب مدینے کا دیکھتے ہیں اور تعبیر کوفے کی صورت میں نکلتی ہے۔ ایک سردار جی ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے بہت نیک نام تھے ایک سائل ان کے پاس ڈرتا ڈرتا آیا اور عرض کی کہ اس کے اکلوتے بیٹے پر قتل کا الزام ہے اور مقدمہ آپ کی عدالت میں ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اسے پھانسی کی بجائے عمر قید کی سزا دیں۔ سردار جی کا دل پسیج گیا انہوں نے کہا کہ میرے ساتھ دو جج اور بھی ہیں۔ میں اکیلا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ تمہارا بیٹا پھانسی سے بچ جائے۔ چنانچہ جب مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا تو ملزم کو پھانسی کی بجائے عمر قید کی سزا دی گئی تھی۔ ملزم کا باپ شکریہ ادا کرنے کے لیے سردار جی کے پاس گیا تو سردار جی نے کہا

''میں نے بہت مشکل سے باقی دو ججوں کو عمر قید سزا پر راضی کیا ہے۔ ورنہ وہ تو تمہارے بیٹے کو بری کرنے پر تلے ہوئے تھے!''

ہمارے سیاست دان بھی کچھ عرصہ سے قوم کے ساتھ ہی ہاتھ کر رہے ہیں۔ یعنی جب کبھی قوم کی نجات کی امید پیدا ہوتی ہے یہ سے بڑی کوششوں سے کسی فوجی آمر کی قید میں دے دیتے ہیں لیکن وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ

پلٹنا' جھپٹنا' جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے ایک بہانا

تو ہمارے یہ سیاست داں فوجی آمر کو کمزور پڑتے دیکھ کر لہو گرم رکھنے کے لئے بعد میں اس کے خلاف بھی اتحادی سیاست کا آغاز کر دیتے ہیں حالانکہ اسے لانے والے بھی یہی ہوتے ہیں۔ افسوس ہمارے کسی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے انہیں اقبال کا یہ شعر نہیں سنایا۔

روز حساب میرا جب پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

لیکن جس طبقے کا ذکر میں کر رہا ہوں وہ شرمسار ہونا نہیں جانتا۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ ہم سب لوگ شرمسار ہونا بھول چکے ہیں۔ ہم لوگوں کے قول و فعل میں اتنا شدید تضاد ہے کہ گلشن سے آنے والی ہوائیں بھی ہم تک پہنچتے پہنچتے بادِ صرصر کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ہمارے عشق میں کھوٹ ہے۔ ساری عمر ''میرے مولا بلا لو مدینے'' کا ورد کرتے رہتے ہیں اور جب بیس ہزار روپے ہاتھ میں آتے ہیں تو مدینے کی بجائے سیدھا ہال روڈ کا رخ کرتے ہیں اور رنگین نیلی وژن اٹھا لیتے ہیں۔ قرآن اور حدیث سے زیادہ منبع ہدایت کوئی نہیں لیکن ان پر عمل کے دوران جہاں مشکل مقامات آتے ہیں یعنی ہماری جان و مال پر رد پڑنے لگتی ہے ہم کنی کترا جاتے ہیں۔ ایسے ہی بد باطن لوگوں کے لیے بعض علماء کا یہ فتویٰ موجود ہے کہ انکم ٹیکس چوری کرنا جائز ہے۔ نیز یہ کہ سونے کی اسمگلنگ از روئے شریعت حرام نہیں ہے۔ گذشتہ چودہ سو برسوں میں صرف ان دو امور میں ''اجتہاد'' کیا گیا ہے جبکہ اس دوران سینکڑوں ایسے مسائل جنم لے چکے ہیں جن کے ضمن میں اجتہاد کی اشد ضرورت ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات میں جتنا زور اجتہاد پر دیا ہے اتنا شاید ہی کسی اور بات پر دیا ہو۔

میرے نزدیک وہ تمام چیزیں جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود نہیں تھیں اور جن کے بارے میں کوئی واضح حکم بھی موجود نہیں انہیں یک قلم مسترد کرنے کی بجائے ان پر غور و فکر اور اجتہاد کی ضرورت ہے۔ کوئی قانون اندھا دھند نافذ نہیں کیا

جا سکتا بلکہ اس سے پہلے تمام معروضی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ ایک بدو حضور نبی اکرم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ روزے کے دوران مجھ سے ایک ایسی حرکت سرزد ہو گئی جس سے روزہ ساقط ہو گیا ہے اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضور اکرم نے فرمایا "ایک غلام آزاد کر دو" بدو نے کہا کہ "حضور میرے پاس کوئی غلام ہے ہی نہیں" آپ نے فرمایا۔ "ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔" بدو نے عذر پیش کیا کہ اس میں اتنی استطاعت نہیں۔ حضور اکرم نے ارشاد فرمایا "تیس روزے رکھ لو" بدو بولا "حضور میں تو ایک روزہ نہیں سنبھال سکا مزید تیس روزے کیسے سنبھال سکوں گا؟" اتنے میں ایک صحابی حضور نبی اکرم کے پاس کھجوروں کا تحفہ لے کر آئے۔ آپ نے بدو سے کہا کہ یہ کھجوریں لے جاؤ اور مستحقین میں تقسیم کر دو" بدو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "حضور جس خدا نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے مجھے اس خدا کی قسم ہے کہ ان کھجوروں کا مجھ سے زیادہ کوئی مستحق نہیں" اس پر رحمۃ اللعالمین کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور فرمایا "ٹھیک ہے تم یہ اپنے بچوں میں تقسیم کر دو" میرے خیال میں حضور نبی کریم کا یہ عمل ہمارے فقہا کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام ایک محدود زمانے اور کسی مخصوص طبقے کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ تمام زمانوں اور تمام طبقوں کے لیے ہے۔ اسلام امن ہے محبت ہے رحمت ہے خدا کے لیے لوگوں کے سامنے اس کی بھیانک تصویر پیش نہ کریں۔ اگر آپ یہ تسلیم نہیں کرتے تو کم از کم اتنا کرم ضرور کریں کہ جو آپ سے اختلاف کرے اسے منکر اسلام قرار نہ دیں کہ وہ منکر اسلام نہیں بلکہ اسے صرف آپ کی اسلام کی انٹرپریٹیشن سے اختلاف ہے۔ اسلام کی جو انٹرپریٹیشن آج کی جا رہی ہے اقبال اس کے سب سے بڑے مخالف ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ قانون ساری کا حق علماء کو نہیں پارلیمنٹ کو دیتے ہیں ہماری پوری قوم عاشق اقبال ہے۔ ان میں ہمارے علماء بھی شامل ہیں جو اقبال کے شعروں سے اپنی تقریر اور تحریریں مزین کرتے ہیں۔ لیکن اقبال کا کہا نہ حکمران مانتے ہیں نہ سیاست دان نہ عوام نہ علماء اس کی جو بات ہمیں "سوٹ" کرتی ہے ہم اس کا گھونٹا لگانے میں رہتے ہیں اور جو ہمارے مفادات سے ٹکراتی ہے اسے ردی کے کاغذ کی طرح پرے پھینک دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ٹیلی وژن سے اقبال کے یہ شعر کبھی نہیں سنے ہوں گے۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی طرح یہ مصرعے اور شعر بھی کسی منبر سے آپ نے نہیں سنے ہوں گے۔

دین ملا فی سبیل اللہ فساد

؎

اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

؎

بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

یہ سب کچھ ہم نے اس لئے نہیں سنا کہ جنھوں نے سنایا تھا وہ اگرچہ عاشق اقبال تھے لیکن انہیں یہ سوٹ نہیں کرتا۔ جہاں اقبال کی بات مان کر ہمیں جان کا زیاں محسوس ہو وہاں ہم کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ ایک شخص کا پہاڑی سے پاؤں پھسلا ہو مگر خوش قسمتی سے ایک درخت کی شاخ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اب وہ درخت سے لٹکا ہوا تھا اس نے اس جنگل میں بے بسی سے پکار "کوئی ہے؟" غیب سے آواز آئی "میں تیرا خدا ہوں بول تو کیا چاہتا ہے؟" درخت سے لٹکے ہوئے شخص نے کہا "میری جان خطرے میں ہے مجھے بچائے!" اللہ نے کہا "جو میں کہتا ہوں تم کرو جو شاخ تم نے پکڑی ہوئی ہے وہ چھوڑ دو" یہ سن کر اس شخص نے یک دو لمحے توقف کیا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر بلند آواز پکارا "کوئی اور ہے؟" یہی حال ہماری پوری قوم کا ہے۔ ہم خدا اور اس کے رسول کے ماننے والے ہیں عاشق اقبال بھی ہیں لیکن روایات کی وہ شاخ چھوڑنے کو تیار نہیں جو عارضی طور پر ہمارا سہارا بنی ہوئی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں۔

یہ امت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی

مگر ضروری تو نہیں کہ جس سے ہم محبت کرتے ہوں اس کی بات بھی مانیں۔

ہم محبت میں دونوں آنکھیں بند نہیں کرتے' ایک آنکھ کھلی رکھتے ہیں' ہم کانے عاشق ہیں اور خواتین و حضرات یہی ہمارا اصل پرابلم ہے!

([illegible])

کالا موتیا!

ماہرین چشم کے مطابق ہر انسانی آنکھ میں ایک "بلائنڈ سپاٹ" ہوتا ہے چنانچہ آنکھ کے اتنے حصے کے سامنے کا منظر آنکھ والوں کو بھی نظر نہیں آتا اس کا مشاہدہ ماچس کی ایک تیلی سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ آپ یہ تیلی کسی کی آنکھ کے سامنے آہستہ آہستہ گھمائیں۔ تو اس تیلی کا ایک گوشہ ایسا ہوگا جسے آنکھ والا نہیں دیکھ سکے گا۔

یہ عجیب و غریب بات بہت عرصہ پہلے میں نے کہیں پڑھی تھی اور اس کے بعد سے بہت شرمندہ و شرمندہ پھرتا ہوں۔ میرا خیال تھا میں آنکھوں والا ہوں اور یوں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں مگر پتا چلا کہ اس کائنات کو تو چھوڑیں میں دو فٹ کے فاصلے پر دھری چیزوں کو بھی پوری طرح دیکھ سکنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کی "دیدہ وری" پر رشک آنا شروع ہو گیا ہے جو خدا کو اس لئے نہیں مانتے کہ خدا انہیں نظر نہیں آتا! شاید انہیں یقین ہے کہ ان کی آنکھ میں کوئی بلائنڈ سپاٹ نہیں ہے مجھے تو اب ان تمام لوگوں پر حیرت ہونے لگی ہے جو اپنی آنکھ پر اعتبار کرتے ہیں اور دکھائی دینے والے منظر کو اتنا حتمی اور مکمل تصور کرتے ہیں کہ اس کے کسی دھورے پن پر بات تک کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اب مجھے عدم کا یہ شعر پہلے سے کہیں اچھا لگنے لگا ہے۔

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

شاید اس لئے کہ یہ پرندے اپنی آنکھ میں بلائنڈ سپاٹ کی موجودگی کے قائل نہیں ہوتے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے فضائی اور زمینی حادثوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی لیکن اگر سامنے سے آنے والی بلا آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو حادثوں پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ 1971ء میں ہمارے ساتھ یہی ہوا اور اب ایک دفعہ پھر یہ کہانی دہرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بعض اوقات حادثوں کو بلائنڈ سپاٹ کا نتیجہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ ہوس اقتدار میں اندھا ہو جانے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹروں کا بلائنڈ سپاٹ والا نظریہ میرے دل کو اس لئے بھی بھاتا ہے کہ اس کے بہت سے شواہد عام زندگی میں دیکھنے کو آتے ہیں۔ ہماری حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی آنکھوں میں بھی بلائنڈ سپاٹ ہے۔ دونوں کو بہت کچھ نظر آتا ہے صرف وہ نظر نہیں آتا

جو اس اسپاٹ کی زد میں آ جاتا ہے۔ ہمارا لیفٹ اور رائٹ بھی اس عارضے کا شکار ہے رائٹ والے بھٹو کی فسطائیت کے خلاف لڑتے رہے اور بجا طور پر لڑتے رہے لیکن انہیں ہنری کسنجر کی یہ دھمکی نظر نہ آئی کہ ہم اس شخص کو دنیا کے لیے عبرتناک نمونہ بنائیں گے۔ جب ضیاء الحق اور پاک فوج کے جرنیلوں کی ایک بڑی تعداد کو ہوا میں بلاسٹ کر دیا گیا تو لیفٹ والوں نے خوشی سے بھنگڑے ڈالے۔ انہیں اپنے بلائنڈ سپاٹ کی وجہ سے اس سزا کے اصل محرکات دکھائی نہ دیے۔ بے نظیر کو 1990ء میں اقتدار سے الگ کیا گیا تو یہ ناانصافی ان کے مخالفوں کے نظر نہ آئی اور نیو ورلڈ آرڈر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نواز شریف کو جس طرح وزارت عظمیٰ سے ہٹایا گیا' وہ نواز شریف کے مخالفین اپنے "بلائنڈ سپاٹ" کی وجہ سے نظر انداز کر گئے۔

یہ بلائنڈ سپاٹ ہمیں جگہ جگہ دھوکہ دیتا ہے۔ ذاتی سطح پر بھی' معاشی اور معاشرتی سطح پر بھی' روحانی اور رومانی سطح پر بھی' ورلڈ اور قومی سطح پر بھی! اب تو مجھے کچھ یوں لگنے لگا ہے کہ ہم خود کو دھوکہ دینے اور دوسروں سے دھوکہ کھانے کے کچھ عادی سے ہو چلے ہیں۔

کج شہر دے لوک وی عالم من
کج میتوں مرن دا شوق وی سی

کچھ دھوکے معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں جو برداشت کیے جا سکتے ہیں مثلاً ہر آنکھ میں بلائنڈ سپاٹ کی موجودگی کے باوجود نظر کا صرف ایک حصہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے جبکہ ہمارا معاملہ اس سے بہت مختلف ہے۔ اگر ہماری دو آنکھوں میں بھی معمولی سا بلائنڈ سپاٹ ہوتا تو جہاں ساری دنیا کا نظام چل رہا ہے وہاں ہمارا نظام بھی چلتا رہتا لیکن قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری آنکھوں میں کالا موتیا اتر آیا ہے اور ہم اس سے بے خبر اور یا پھر بے نیاز ہیں۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ ہم ساری دنیا کو دیدہ بینا عطا کریں گے' یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا؟

ہم نے پھولوں کی آرزو کی تھی
آنکھ میں موتیا اتر آیا

موتیے کے پھول کی بجائے کالا موتیا ہمارا مقدر کیوں بنا؟ اب ہمارے درمیان اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنے والے بھی شاید بہت کم رہ گئے ہیں۔ کہیں آنکھوں کے علاوہ ہمارے ذہنوں میں بھی بلائنڈ سپاٹ آنا تو شروع نہیں ہو گئے؟

◆◆◆

ہم شکل!

ہماری فلموں کا ایک پسندیدہ موضوع جڑواں بھائیوں کی کہانی بھی ہے جو اتنے ہم شکل ہوتے ہیں کہ ان کی علیحدہ شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ ان فلموں میں قدرے مبالغے سے کام لیا جاتا ہے تاہم حقیقی زندگی میں بھی ایسے بہت سے افراد موجود ہیں جن میں سے ایک کو دیکھیں تو اس پر دوسرے کا گمان ہوتا ہے۔ ہمارے ماڈل ٹاؤن لاہور میں دو ایڈووکیٹ بھائی ثناء اللہ خان شاہد اور ظفر اللہ خان شاہد رہا کرتے تھے (غالباً اب بھی وہیں رہتے ہیں) ایک تو ان کی شکل ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی تھی اور پھر اوپر سے وہ لباس بھی ہو بہو ایک جیسا ہی پہنتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بھائی کی قمیض پر روشنائی گر گئی تو دوسرے نے بھی اپنی قمیض پر عین اسی جگہ روشنائی گرا لی۔ لوگ ان بھائیوں کو "ح" "خ" کہتے تھے یعنی ان میں اگر فرق تھا تو صرف ایک نقطے کا تھا۔ اسی طرح میری ایک عزیزہ کے دو جڑواں بیٹے فاروق اور عثمان مبالغے کی حد تک ہم شکل ہیں۔ اس درجہ ہم شکل کہ ان کے والدین دھوکہ کھا جاتے ہیں اور یہ بچے بھی جب شرارت کے موڈ میں ہوں تو اپنا نام غلط بتا کر صورت حال کا لطف لیتے ہیں۔ میرے دوست جمیل نیازی اور ان کے بھائی اصغر نیازی بھی چونکہ ہم شکل ہیں چنانچہ وہ بسا اوقات ایک دوسرے کے حصے کی مبارکباد بھی وصول کرتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح آج کل ٹی وی اداکار نعیم شریف پوری سنجیدگی سے مبارکبادیں وصول کرنے میں مشغول ہیں وہ مجال ہے کسی کو بتائیں کہ بھئی میں ظفر اقبال نہیں ہوں لہٰذا اردو سائنس بورڈ کی سربراہی کی داد مجھے نہ دو اور ایسا وہ انتقاماً کر رہے ہیں کیونکہ برادرم ظفر اقبال ایک عرصے تک ان کے ڈراموں کی داد وصول کرتے رہے ہیں!

ہم شکلی کے ضمن میں میں نے ایک عجیب و غریب چیز مشاہدہ کی ہے اور وہ یہ کہ اگر میاں بیوی میں محبت غیر معمولی طور پر بڑھ جائے تو ان کی شکلیں بھی اس حد تک ملنے لگتی ہیں کہ وہ بہن بھائی لگتے ہیں۔ اس ضمن میں بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ایسا کرنا کچھ مناسب نہیں لگتا۔ ایک اور چیز جو میں نے مشاہدہ کی وہ یہ کہ اگر کوئی خوبصورت خاتون کسی بد شکل مرد سے بیاہی جائے تو آہستہ آہستہ اس کی خوب صورتی کو گہن لگنا شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے میاں کے مانند ہو جاتی ہے۔ یہ ناپسندیدگی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ

"محبت علاج ترا علاج کند"

دانا کار ورا اپنی ہر آفرینی دکھاتا ہے!

ایک اور چیز ہم شکلوں کا جغرافیہ تبدیل کرتی ہے وہ غربت یا امارت ہے' غریبوں کے خوبصورت بچے پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے روبہ زوال ہونے لگتے ہیں' ان کے خدوخال مدھم پڑنے لگتے ہیں اور نین نقش ٹیڑھے میڑھے ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس امراء کے بچے جو بہتر غذا' بے فکری اور آسودگی کے ماحول میں پرورش پاتے ہیں' اگر جیلے جیلے بھی ہوں تو رفتہ رفتہ روشن روشن لگنے لگتے ہیں۔ اگر کسی کے گھر "دانے" زیادہ ہونے سے اس کے "کملے" بھی سیانے ہو سکتے ہیں تو شکلیں "ری کنڈیشنڈ" کیوں نہیں ہو سکتیں؟

بات ہم شکل سے چلی تھی اور صورتحال یہ ہے کہ یہ ہم شکل زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے مثلاً دیندار اور دنیادار طبقے میں بظاہر کتنی دوری ہے لیکن سیاست میں آ کر یہ کس درجہ ہم شکل ہو گئے ہیں۔ اب مولانا فضل الرحمان اور محترمہ بے نظیر بھٹو میں کیا فرق رہ گیا ہے؟ دو فرقہ پرست خواہ آپس میں کتنا لڑیں جھگڑیں لیکن عمل اور سوچ کے آئینے میں ان کی صورتیں ایک جیسی ہیں۔ ہمارے روشن خیال دوست مذہب سے وابستہ افراد پر "ملا" کی پھبتی کستے ہیں۔ کبھی ان کے جامد نظریات پر نظر ڈالیں تو یہ ان سے بڑے "ملا" نظر آئیں گے اور تو اور شاعری میں بڑے بڑے ترقی پسند شاعر "اجتہاد" کی بجائے اپنے موقف کی حمایت میں میر' غالب اور اقبال کی سند بالکل اسی طرح پیش کرتے ہیں جس طرح ہمارے علماء اکابر علماء کی سند پیش کرتے ہیں۔ اور بیچارے اپنے اس رویے کی وجہ سے "ملا" کہلاتے ہیں۔ یہ ہم شکل زندگی کے تمام شعبوں میں موجود ہے۔

کیا حکومت اور اپوزیشن کے بہت سے ارکان اپنی کرتوتوں کے آئینے میں ہم شکل نہیں ہیں؟ کیا قانون شکن اور قانون کے محافظ ہم شکل ہو کر نہیں رہ گئے؟ کیا ہمارے دانشوروں اور جاہلوں کی شکلیں اب ایک جیسی نہیں ہیں؟ کیا سیکولر اور مذہبی حکومتوں کے رویوں میں کوئی فرق باقی رہ گیا ہے؟

پاکستان میں اگر کسی مسیحی باشندے پر مذہب کی بنیاد پر مقدمہ بنتا تو امریکہ اور برطانیہ کی حکومتیں یک دم "مسیحی" مملکتوں کی صورت اختیار کر کے پاکستان کے خلاف مورچہ بند ہو جاتی ہیں۔ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین اگر اسلام کا تمسخر اڑاتے ہیں تو وہ دنیا بھر کی مسیحی حکومتوں کے چہیتے بن جاتے ہیں۔ کیا سیکولر اور "بنیاد پرستوں" کی شکلیں ایک جیسی ہو کر نہیں رہ گئیں؟ روس اور برطانیہ کے خدوخال بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یوسینا میں یہ ایک دوسرے سے اتنے مشابہ ہیں کہ ان میں فرق مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ "ہم شکلیں" دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں اور ان کا کوئی "توڑ" بھی نظر نہیں آتا۔ ایسے مواقع پر زیادہ سے زیادہ اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

مگر شعر سے ان ''درویشوں'' اور ان عیاروں کا راستہ تو نہیں روکا جا سکتا!

◆◆◆

بے نظیر صاحب ریکارڈ درست کرلیں!

وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو نے "نیشنل میگزین" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ہمیشہ سے اردو اور انگریزی اخبارات پڑھتی آئی ہیں اخباروں میں سابق اور موجودہ جمہوری وزرائے اعظم کے خلاف تو بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے لیکن ضیاء الحق کے خلاف کسی کو لکھنے کی جرات نہیں ہوئی کیونکہ ایسا کرنے پر کوڑے پڑ سکتے تھے!

مجھے حیرت ہے کہ محترمہ نے یہ خلاف واقعہ بات کیسے کہہ دی' دراصل حق گوئی ایک مزاج کا نام ہے اس مزاج کے حامل لوگ سچ بولتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ حکمران دائیں بازو کا ہے یا بائیں بازو کا' وہ آمر ہے یا خود کو جمہوریت کا علمبردار کہتا ہے بلکہ ان کے نزدیک ان کا "فعل" ان کے "قول" کی تصدیق یا تردید کرتا ہے۔ چنانچہ ضیاء الحق کے دور میں سچ بولنے والے لوگ وہی تھے جنہوں نے ایوب خان' یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بھی سچ بولا اور اس کا خمیازہ بھگتا۔ انہیں لوگوں نے نواز شریف کے دور حکومت میں بھی حق گوئی کی روایت نبھائی اور یہی لوگ آج بے نظیر کے دور میں بھی کلمہ حق کہہ رہے ہیں!

میری صحافتی تربیت مجید نظامی نے کی ہے اور میں نے انہیں ہر دور میں جابر سلطانوں کے سامنے سچ بولتے دیکھا ہے خصوصاً مرحوم ضیاء الحق پر تو مجید صاحب بہت "رواں" رہے ہیں' مجید نظامی ان کے روبرو جس کڑوے لہجے میں بات کرتے تھے اور اداریوں میں جس طرح ان پر تنقید کرتے تھے' اس سے مجید نظامی صاحب کی حق گوئی و بیباکی ہی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا بلکہ اس سے مرحوم صدر کے صبر اور تحمل کا ثبوت بھی ملتا تھا' تاہم محترمہ کے بیان کے جواب میں بڑے "جوڑوں" کو سامنے لانے کی کیا ضرورت ہے' اس کے ابطال کے لیے "چھوٹے جوڑ" ہی کافی ہیں' میں ایک معمولی لکھنے والا ہوں' میں بہادر بھی بالکل نہیں ہوں' ایک کمزور سا انسان ہوں لیکن میں نے ضیاء الحق پر اس وقت بھی تنقید کی جب وہ کھلم کھلا آمر تھے اور اس وقت بھی جب انہوں نے "صدارتی چوغہ" پہنا۔ جن دنوں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب ضیاء الحق نے اخبارات پر سنسر نافذ کر رکھا تھا اور انفارمیشن والے اخبارات کی کاپیاں چیک کر کے پریس میں بھجواتے تھے۔ ان دنوں میں میرے دو کالم سنسر کر دیئے گئے' ایک کا عنوان "بے سرا مؤذن" اور دوسرے کا "جنگ احد" تھا' سنسر والوں نے "بے سرا مؤذن" میں سے مولانا روم کی صرف وہ حکایت رہنے دی گئی جس میں وہ ایک بے سرے مؤذن کو روایت کرتے ہیں جس کی آواز بہت بری تھی چنانچہ ایک یہودی کی بیٹی جو اسلام کی حقانیت پر ایمان لا کر مسلمان ہو چکی تھی وہ بچے

باپ کی بزار تر غیبات کے باوجود واپس اپنے مذہب میں آنے پر تیار نہ تھی' اس سب پر سے مؤذن کی وجہ سے اسلام سے بیزار ہو جاتی ہے اس کے بعد کا حصہ سنسر کر دیا گیا جس میں اس حکایت کا اطلاق جناب ضیاء الحق کے ان اقدامات پر کیا گیا تھا جو لوگوں کو اسلام سے بیزار کرنے والے تھے تاہم اس حکایت کی اشاعت ہی سے قارئین کی رسائی نفس مضمون تک ہو گئی۔ موخر الذکر کالم میں میں نے جنگ احد کا واقعہ بیان کیا تھا اور مسلمانوں کی شکست کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی تھی۔ جن لوگوں کی ڈیوٹی درے کی حفاظت پر تھی' وہ اس سے ہٹ گئے۔ میں نے لکھا تھا آج بھی جن کی اصل ڈیوٹی درے کی حفاظت ہے' وہ اس سے ہٹیں گے تو مسلمانوں کی شکست کا باعث بنیں گے اس کالم کا بیشتر حصہ بھی سنسر کا شکار رہا' تاہم مفہوم اس کا بھی لوگوں پر آشکار ہو گیا کہ نوائے وقت کے قارئین سیاسی طور پر پوری طرح تربیت یافتہ ہیں'

جناب ضیاء الحق کے آمرانہ اقدامات کے حوالے سے میرے بے شمار علامتی کالم نوائے وقت میں شائع ہوئے جن میں علامت اتنی واضح تھی کہ ایک چھوٹی سی بات بھی نفس مضمون تک بآسانی پہنچ جاتا تھا ان میں سے اس وقت میرے ذہن میں (6 دسمبر 1982ء) کی چنگیز (؟) جنگل کا بادشاہ (25 نومبر 1985ء) بول میری مچھلی (4 جون 1985ء) چڑھتے آفتاب (26 مارچ 1987ء) تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو (15 مئی 1983ء) اور قسائیوں اور بکروں کے حوالے سے لکھے گئے متعدد کالم میرے ذہن میں آ رہے ہیں' ان کے علاوہ جن کالموں میں براہ راست انداز اختیار کیا گیا تھا ان میں سے فی الوقت بھائی جان ضیاء الحق کی باتیں' ایک سندھی دوست کا خط' چھوٹے مارشل لاء کی مکمل تقریر (18 جون 1985ء) وغیرہ کی طرف میرا دھیان گیا ہے' تاہم جب صدر ضیاء الحق نے وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی حکومت کو برطرف کیا' اس وقت خصوصاً پاکستانی قوم کی تذلیل کا احساس بہت زیادہ ہوا اور میرے لہجے میں اتنی تلخی آ گئی کہ مجید نظامی صاحب نے ایک روز مسکراتے ہوئے کہا ''لگتا ہے جونیجو صاحب کی نہیں' آپ کی حکومت برطرف کی گئی ہے'' اسی طرح مرحوم ضیاء الحق کی وفات کے چند ہفتوں بعد بے نظیر صاحبہ کے موجودہ سیکرٹری اطلاعات حسین حقانی (ضیاء کی باقیات؟) نے میرے ایک کالم کے جواب میں مرحوم صدر ضیاء الحق کے دفاع میں نوائے وقت میں ایک مضمون لکھا' جس کے جواب میں میں نے ایک اور کالم تحریر کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مرحوم صدر نے اسلام کا نا مصرف اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا' اداروں کو تباہ کیا اور قوم کو منافقت کا تحفہ دیا جس کی زد میں وہ خود بھی آ گئے میرے یہ کالم 26 ستمبر 1988ء اور 7 اکتوبر 1988ء میں شائع ہوئے!

میں اپنے قارئین سے اس تفصیل کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن یہ تفصیل نہیں نہایت ''مختصر'' خلاصہ ہے جو میں نے وزیر اعظم

پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کے خلاف وہ قصہ بیان کی حقیقت واضح کرنے کے لیے پیش کیا ہے۔ اس جواب سے مقصود اپنی بہادری کا سکہ بٹھانا نہیں بلکہ اس کا مقصد صرف ریکارڈ درست رکھنا ہے چنانچہ محترمہ سے درخواست ہے کہ وہ ریکارڈ درست کر لیں اس دھمال کے بیان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آج جو "ترقی پسند" اہل قلم خود کو ضیاء الحق کا مخالف قرار دیتے ہیں اس دور میں اس دور کے حوالے سے انہوں نے اگر کچھ لکھا ہو تو وہ سامنے لائیں ورنہ کم از کم ان لوگوں پر زبان طعن دراز نہ کریں جو "مارشل لائی" اور "جمہوری" دونوں قسم کے آمروں کے خلاف سینہ سپر رہے ہیں! مرحوم ضیاء الحق نے 1978ء میں راولپنڈی کے سی این سی ہاؤس میں قومی اتحاد کی حکومت کے عہدیداروں کے اعزاز میں افطار ڈنر دیا تو وہاں پہلی دفعہ مرحوم ضیاء الحق سے میری ملاقات ہوئی۔ قطار میں کھڑے لوگوں سے ہاتھ ملاتے ملاتے ان کی نظر اچانک دائیں جانب پڑی جہاں میں ممتاز شاعر اور اس وقت کے ٹیلی وژن کے ایم ڈی ضیاء جالندھری کے ساتھ کھڑا تھا' مرحوم سب لوگوں کو چھوڑ کر سیدھے میری طرف آئے' میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا' انہوں نے معانقے کے لیے اپنے بازو وا کر دیے' اس کے ساتھ ہی انہوں نے جملہ کسا "قاسمی صاحب تصویر میں تو آپ بہت نوجوان نظر آتے ہیں" پھر ہنستے ہوئے میرا کندھا تھپتھپایا اور کہا "دل چھوٹا نہ کریں' آپ ماشاء اللہ ویسے بھی نوجوان ہیں" ان کا اگلا سوال میرے لیے بہت ناقابل فہم قسم کا تھا' کہنے لگے "قاسمی صاحب آپ کی اسلام کے ساتھ محبت کہاں گئی' پاکستان کے ساتھ آپ کی محبت کو کیا ہوا؟" ایک لمحے کے لیے مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں' تاہم اگلے ہی لمحے میں ان کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا' مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف چلائی گئی قومی اتحاد کی تحریک میں' میں نے بھٹو صاحب کے خلاف بہت شدید کالم لکھے تھے اور ان کی حکومت کے آخری دنوں میں ایف ایس ایف کے مسعود محمود کی طرف سے مجھے یہ دھمکی بھی موصول ہوئی کہ "انسان کے بچے جو زندگی بہت خوب صورت چیز ہے" مرحوم ضیاء الحق نے جو بات کہی' اس کا مفہوم یہ تھا کہ آپ نے بھٹو کے خلاف جو کچھ لکھا وہ اسلام اور پاکستان کی محبت میں لکھا' اب جب کہ اسلام اور پاکستان کے محافظ کے طور پر برسر اقتدار آیا ہوں تو آپ میری حمایت کی بجائے میری مخالفت میں ہی لکھ رہے ہیں۔ یہ وہی ریفرنڈم والی منطق تھی کہ اگر آپ اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں تو آپ کا ووٹ ضیاء الحق کے حق میں سمجھا جائے گا' بات سمجھ آنے پر میں نے بغیر کسی توقف کے کہا "سر! بھٹو صاحب کے زمانے میں' میں نے جو کچھ لکھا' اپنے خدا اور اپنے ضمیر کو گواہ بنا کر لکھا' آج بھی جو کچھ لکھ رہا ہوں اور آئندہ بھی جو لکھوں گا' اپنے خدا اور اپنے ضمیر کو گواہ بنا کر لکھوں گا" مرحوم اس پر خاموش ہو گئے اور کہا "کھانے کے بعد آپ جائیے گا نہیں' آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں" اس ملاقات کی تفصیل میں پھر کبھی بیان کروں گا' مگر اس ملاقات کے دوران انہوں نے تین مرتبہ زور دے کر مجھ سے کہا "کوئی خدمت ہو تو بتائیں؟" یہ واقعہ بیان کرنے

سے مقصد یہ ہے کہ مرحوم کے دور میں نہ صرف یہ کہ کلمۂ حق کہنے والے موجود تھے بلکہ انہوں نے اس کلمۂ حق کی قیمت وصول کرنے سے بھی انکار کیا اور اس کلمۂ حق کو منصب بننے کے لئے سیڑھی کے طور پر بھی استعمال نہ کیا۔ سو بے نظیر صاحبہ سے درخواست ہے کہ وہ اگر واقعی اردو اخبارات کا مطالعہ بھی کرتی ہیں تو یہ مطالعہ مخصوص عینک کے ساتھ نہ کریں۔ پیپلز پارٹی کی مخالفت کا یہ مطلب نہیں کہ مارشل لاء کی حمایت کی جائے اور مارشل لاء کی مخالفت کا یہ مطلب نہیں کہ پیپلز پارٹی کی فسطائی پالیسیوں کی حمایت کی جائے۔ دورِ استبداد اگر جمہوری قبا میں بھی پائے کوب ہے تو اسے آزادی کی نیلم پری نہیں سمجھا جاسکتا!

◆◆◆

تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر!

علامہ اقبال ٹاؤن کے مین بلیوارڈ پر ایک رکشہ چند قدم کے فاصلے پر میرے بائیں ہاتھ فراٹے بھرتا جا رہا تھا' اچانک رکشہ ڈرائیور نے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور اس یقین کے ساتھ کہ "بادشاہ سلامت" کے اس ادنیٰ سے اشارے پر پیچھے آنے والا ٹریفک فوری طور پر جامد و ساکت ہو گیا ہے' اپنا رکشہ دائیں جانب موڑ دیا' یعنی موصوف عین میری گاڑی کے سامنے آ گئے' میں نے اپنے پاؤں بریک میں گاڑ دیے مگر گاڑی کا مکینزم تو میرے تابع نہیں تھا چنانچہ اس نے میرے "فرمان" کی اتنی ہی تعمیل کی تھی جتنی اس کے انجینئر نے اس میں رکھی ہوئی ہے جس کے نتیجے میں گاڑی رکتے رکتے بھی آہستہ سے رکشے سے جا ٹکرائی مگر اس آہستگی کے باوجود گاڑی کے بائیں ہاتھ کی بتی اور جالی ٹوٹ گئی اور بونٹ اندر کو دھنس گیا' رکشے کو خراش تک نہ آئی کہ اس کے پچھلے حصے میں لوہے کی جالیاں وغیرہ لگی ہوئی تھیں' میں نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے رکشے والے کو نیچے اترنے کے لیے کہا' اس نے نیچے اترتے ہی "عام معافی" کا مطالبہ کر دیا اور دلیل یہ دی کہ وہ غریب آدمی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اس گاڑی کے علاوہ میرے امیر ہونے کی کوئی دلیل اگر تمہارے پاس ہے تو وہ پیش کرو جس پر وہ خاموش رہا۔ میرے نقصان کی مالیت تقریباً چھ ہزار روپیہ تھی جو میری آدھی تنخواہ کے برابر ہے۔ رکشے والا بھی مہینے کے تقریباً اتنے ہی پیسے کماتا ہے' جتنی میری تنخواہ ہے۔ میں بچت کی پوزیشن میں نہیں ہوں کیونکہ میں نے رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہنا ہے جبکہ رکشے والے کو اس طرح کا کوئی پرابلم نہیں چنانچہ وہ بچت کے حوالے سے مجھ سے کہیں زیادہ بہتر پوزیشن میں ہے' میں مہنگائی کے پیش نظر اپنی تنخواہ میں اضافہ بھی نہیں کر سکتا جبکہ رکشے والا اپنی آمدنی میں مسلسل اضافہ کرتا رہتا ہے گاہکوں سے منہ مانگے دام وصول کرتا ہے اور یوں اس پہلو سے بھی اس کا پلہ بھاری ہے۔ میں نے یہ سب باتیں اپنے دل میں سوچیں مگر ان کا اظہار نہیں کیا کہ اس سے پبلک میں "امیج" خراب ہوتی تھی چنانچہ میں نے صرف اتنا کہا کہ میرا جو نقصان ہوا ہے اس میں تم شرکت کرو' میرے اس مختصر مطالبے کا اس نے ایک بار پھر مختصر سا جواب دیا جو یہ تھا "معاف کر دیں' میں غریب آدمی ہوں" اس کے اس جملے سے میرا دل ہل جاتا تھا مگر میرے پاس بینک میں حسب معمول ایک سو روپے سے زیادہ نہیں تھا اور گاڑی چھ ہزار کے لیے اپنا بھاڑ سا منہ کھولے کھڑی تھی۔ چنانچہ میں

نے رکشے والے سے نظریں ملائے بغیر نقصان میں شرکت کا مطالبہ دہرا دیا۔ اتنے میں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے ایک نوجوان نے کہا "قاضی صاحب! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قصور رکشے والے کا ہے لیکن اللہ نے آپ کو عزت دی ہے' آپ اسے معاف کر دیں"۔ میں نے کہا "مجھے کسی ایسی ورکشاپ کا پتہ بتاؤ جہاں گاڑی کی مرمت عزت سے ہو سکتی ہو" اس نوجوان کو یقیناً ایسے کسی ورکشاپ کا علم نہیں تھا ورنہ وہ مجھے اس کا پتہ ضرور بتاتا۔ تاہم مجھے سب سے زیادہ مضبوط دلیل' ان نوجوان کی محسوس ہوئی جس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی جس نے اپنا ویسپا اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے پاس آیا' اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا "قاضی صاحب! سچی بات یہ ہے کہ نہ قصور آپ کا ہے اور نہ رکشے والے کا' بلکہ یہ سڑک ہی "بھاری" ہے۔ یہاں دن میں تین چار حادثے ہوتے ہیں' آپ کہیں گے کہ کوئی وجہ ہوتی ہوگی' کوئی وجہ نہیں جب یہاں سڑک نہیں تھی بلکہ چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے اس زمانے میں ایک "ذی" چنگا بھلا ادھر سے گزر رہا تھا وہ چلتے چلتے گرا اور پھر پھڑک کر مر گیا" اتنے قابل قدر خیالات کا مالک یہ نوجوان یقیناً ناقدری زمانہ کا شکار ہے ورنہ اسے کم از کم علاقہ مجسٹریٹ تو ہونا ہی چاہیے تھا"

اس سلسلے میں مزید کارروائی کے بیان سے قارئین کو خواہ مخواہ بور نہیں کروں گا' قصہ مختصر یہ کہ میں نے رکشے والے کو معاف کر دیا' اس نے شکریہ ادا کیا' رکشے کو ایڑ لگائی اور ایک بار پھر ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تاہم یہ سوال میرے ذہن میں ابھی تک موجود ہے کہ جب بھی کسی سڑک پر اس قسم کا حادثہ ہوتا ہے' عموماً یہی منظر کیوں دیکھنے میں نظر آتا ہے جو میں نے اوپر بیان کیا ہے؟ لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں جن میں سے زیادہ تر اردگرد کے دکاندار ہوتے ہیں اور ہمیشہ یہی جملہ سننے میں آتا ہے "معاف کر دیں' غریب آدمی ہے" جب کہ یہی غریب آدمی انہیں دکانداروں میں سے کسی کے پاس کپڑا خریدنے جاتا ہے تو وہ دکاندار اس غریب آدمی کے ساتھ ایک پیسے کی رعایت نہیں کرتا۔ وہ سبزی خریدنے جاتا ہے تو اس سے دوگنی قیمت وصول کی جاتی ہے یہ غریب آدمی دوا خریدنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو کوئی اس کی غربت پر ترس کھا کر اسے مفت دوا نہیں دیتا' لیکن جب یہی غریب آدمی قانون شکنی کرتا ہے کسی کی جان لیتا ہے یا کسی کا مالی نقصان کرتا ہے تو یہی سب لوگ جمع ہو جاتے ہیں کہ جناب معاف کر دیں غریب آدمی ہے' حلوائی کی دکان پر دادا جی کی فاتحہ پڑھنے کی یہ رسم بہت پرانی ہے لہٰذا اسے "کلچر" کا حصہ سمجھ کر قبول کرنا ہی پڑے گا! بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہم اسے قبول کر چکے ہیں' اسی لئے پروین شاکر کی جان لینے والا بس ڈرائیور قانون کی گرفت سے آزاد ہو چکا ہے ممتاز دانشور پروفیسر مجتبیٰ حسین کے قاتل ٹرک ڈرائیور کو معاف کر دیا گیا تھا کہ وہ غریب آدمی تھا چنانچہ وہ پورے اطمینان سے اپنی پوری زندگی بسر کر رہا ہے سڑکوں پر روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں مسافروں کو ہلاک کرنے والے غریب ڈرائیور' اکثر موقع واردات

سے فرار ہو جاتے ہیں یا ان رحم دل راہگیروں کی سفارش پر معاف کر دیے جاتے ہیں جو خود یا ان کا کوئی عزیز اس نقصان کی زد میں نہیں آیا ہوتا۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ جس قانون شکنی کو ہمارا معاشرہ "کلچر" کے طور پر قبول کر چکا ہے اسے ایک آرڈیننس کے ذریعے قانونی شکل دے دی جائے۔ غریب ڈرائیور اپنی غربت اور امیر ڈرائیور اپنی امارت کی وجہ سے بچ جاتے ہیں، باقی مڈل کلاس رہ جاتی ہے جس نے اپنے سینے پر

"تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر"

کی تختی لٹکا رکھی ہے اور میں مڈل کلاس کے نمائندے کے طور پر اس قانون کی پیشگی "منظوری" دیتا ہوں!

◆◆◆

بالائی طبقہ!

مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کثر بالائی طبقہ کا ذکر کرتے ہیں یہ بالائی طبقہ آخر چیز کیا ہے جس نے ہم سب کی نیندیں حرام کی ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں سوال کنندہ کو علم ہے کہ بالائی طبقہ کیا ہوتا ہے اگر انہیں واقعی علم نہیں ہے تو ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ طبقہ وہ ہے جو دودھ پر سے "بالائی" اتار کر کھا جاتا ہے اور باقی جو "پھوک" بچتا ہے اس میں پھٹکڑ کا پانی ملا کر بارہ کروڑ عوام میں تقسیم کر دیتا ہے! تاہم یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میرا اشارہ گجروں کی طرف نہیں ہے کیونکہ گجر تو بڑے بھلے مانس لوگ ہوتے ہیں وہ دودھ میں پانی ملاتے ہیں تو گاہکوں کو بتا کر ملاتے ہیں' نیز اپنی بڑائی کا کوئی دعویٰ بھی نہیں کرتے بلکہ خود کو گنہ گار سمجھتے ہیں اور اپنے اس گناہ کی تلافی کے لیے ہر سال داتا صاحب کے عرس پر زائرین کو خالص دودھ مفت سپلائی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بالائی طبقہ دودھ پر سے بالائی اتارنے اور بچے کھچے دودھ نما چیز میں پھٹکڑ کا پانی ملانے کے باوجود خود کو ملک و قوم کا محسن بھی قرار دیتا ہے' معزز بن کر اعلیٰ مسند پر فائز بھی ہوتا ہے حب الوطنی اور غداری کے سرٹیفکیٹ بھی بانٹتا ہے اور فرائین مصر کے بعد یہ واحد طبقہ ہے جس کے افراد کو یقین ہے کہ انہوں نے مرنا نہیں ہے اور خدا کے حضور بھی پیش نہیں ہونا' یہی وجہ ہے کہ اس طبقے کے افراد اس لوں سے خدا کے لہجے میں بات کرتے ہیں' بہت سے انسان تو انہیں خدا سمجھ بھی بیٹھتے ہیں چنانچہ ان کے قصیدے لکھتے ہیں اور ان کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں لیکن جب سجدے سے سر اٹھاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا "خدا" تو مر چکا ہے۔ پھر انہیں افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک خالی انسان کے قصیدے کیوں لکھے ان کی تو ساری مناجاتیں ضائع چلی گئیں مگر حیرت ہے کہ اس کے باوجود وہ کسی نئے "خدا" کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور از سر نو مناجات کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں!

بالائی طبقے کے فرد کی موت کے حوالے سے جو تحقیق ہوئی ہے اس کے مطابق ان کی موت بھی زیادہ تعداد میں بالائی کھانے سے ہوتی ہے جب تک یہ تھوڑا تھوڑا کھاتے رہتے ہیں یہ چاق و چوبند رہتے ہیں اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے عوام کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہتے ہیں کہ ملک و قوم کی بقا کے لیے ان کی بالادستی ضروری ہے لیکن جب یہ دونوں ہاتھوں سے کھانا شروع کرتے ہیں اور عوام نان جویں کے لیے بھی ترسنے لگتے ہیں تو ایک طرف عوام میں ان کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے، اور دوسری طرف زیادہ بالائی کھانے سے ان کے جسم اور دماغ پر اتنی چربی چڑھ جاتی ہے کہ وہ عوام کو بے وقوف بنانے والے فیصلے عقل مندی سے کہیں کر

پاتے جس کے نتیجے میں ان کے خلاف بغاوت ہو جاتی ہے اور تخت کی جگہ تختہ ان کا مقدر بنتا ہے۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ روس' چین' ایران' فرانس اور دوسرے بہت سے ملکوں میں بالائی طبقے کی موت زیادہ بالائی کھانے کی وجہ سے ہوئی ان واقعات کے نتیجے میں بالائی طبقہ پر دنیا کی بے ثباتی کا اس درجہ اثر ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے بچے کھچے دن قوم کی بچی کھچی بالائی پر بھی ہاتھ صاف کرنے میں بسر کر دیتے ہیں کہ اگر مرنا ہی ہے تو کیوں نہ بالائی کھا ہوئے مرا جائے۔ یہ سوچ ان کی کم فہمی کا نتیجہ ہے کیونکہ عوام کے بیدار ہونے پر یورپ کے بہت سے ممالک کے بالائی طبقے نے بالائی میں سے عوام کو بھی حصہ دینا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں عوام بھی موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے اور یہ طبقہ بھی اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا' مگر پسماندہ ممالک کا بالائی طبقہ بھی ذہنی طور پر پسماندہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آخری گھنٹی بجنے پر بھی وہ ہوش میں نہیں آتا جس کا خمیازہ اسے بہرحال بھگتنا پڑتا ہے۔

بالائی طبقے کے بارے میں بتانے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں کچھ عرصے سے اس طبقہ کے افراد خود کو عوامی ثابت کرنے کے لیے نچلے طبقے کے چند افراد کو بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں اس نچلے طبقے کے افراد اپنے طبقے کے مفادات کی حفاظت کی بجائے اپنے آقاؤں کے مفادات کے محافظ بن جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ عوام کو یہ یقین دلانے میں لگے رہتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں بالائی طبقہ ان کے حقوق پر چھاپہ نہیں مار سکتا۔ کچھ عرصہ تک ان نمائشی پہلوانوں کی حکمت عملی بہت کامیاب رہتی ہے یعنی عوام انہیں اپنا سمجھتے رہتے ہیں لیکن ایک وقت آتا ہے کہ ان کٹھ پتلیوں کی حقیقت عوام پر واضح ہو جاتی ہے مگر اس وقت تک نچلے طبقے کے یہ افراد نفیس بالائی طبقے میں تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں اور یوں بچارے عوام صرف دانت کچکچا کر رہ جاتے ہیں!

یوں تو بالائی طبقے کے بارے میں بتانے کی اور بہت سی باتیں ہیں لیکن طوالت سے بچنے کے لیے آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ بالائی طبقہ کسی ایک طبقے کا نام نہیں بلکہ اس میں بہت سے مفاداتی اور طاقت ور گروپ شامل ہوتے ہیں' اس کے متنوع ہونے کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ بالائی طبقہ بیک وقت چوروں اور "سادھوں" پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے اور یہ ان کی بقا کے لیے ضروری ہے! تاہم واضح رہے کہ بقا صرف خدا کی ذات کو ہے' باقی سب کو فنا ہونا ہے اور ایمان والوں کو اس میں کوئی شک نہیں!

◆◆◆

کلیرنس سیل!

ان دنوں تجارتی مراکز میں جگہ جگہ کلیئرنس سیل کے بینر لگے نظر آتے ہیں اور خریدار ہیں کہ دکانوں پر دوڑے چلے آتے ہیں جہاں انہیں کلیئرنس سیل کی تختی نظر آتی ہے۔ کلیئرنس سیل آؤٹ آف سیزن ان چیزوں کی لگتی ہے۔ دکاندار سوچتے ہیں کہ ان اشیاء کو اگلے سیزن تک یونہی دکانوں میں سنبھال کرنا سرمایہ بلاک کرنے کے مترادف ہے لہٰذا کچھ کم منافع پر انہیں ٹھکانے لگا دیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔

ویسے ہم لوگ تو اس معاملے میں یورپ سے بہت پیچھے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں تو صرف اشیاء ہی کی سیل لگتی ہے جبکہ ترقی وتہذیب کے گہوارہ یورپ میں تو بوڑھے والدین کی کلیئرنس سیل کا رواج بھی عام ہے چنانچہ وہاں جب بڈھا اور بڈھی کام کے نہیں رہتے تو ان کے بچے انہیں فوراً ''سپوز آف'' کر دیتے ہیں۔ اور انہیں اولڈ پیپلز ہوم میں پہنچا دیتے ہیں دراصل ان والدین نے بھی ماضی میں یہی سلوک اپنے بچوں کے ساتھ روا رکھا ہوتا ہے دورِ شباب میں وہ شادیاں کرتے اور طلاقیں دیتے چلے جاتے ہیں اور ان کے بچے سڑکوں پر کلیئرنس سیل لگاتے ہیں۔ ہم فی الحال اس پوزیشن میں نہیں کہ اس معاملے میں یورپ کی تقلید کر سکیں۔ الحمد للہ ہم نے ایک عرصہ سے افراد کے بجائے قومی اداروں کی کلیئرنس سیل لگائی ہوئی ہے اور کیسے کیسے قومی ادارے اس کلیئرنس سیل میں کوڑیوں کے مول بکے ہیں۔

سو ثابت ہوا کہ اس معاملے میں چنداں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ کلیئرنس سیل کے معاملے میں ہم یورپ سے صرف مشترکہ خاندانی نظام کے حوالے سے ہی کمتر ہیں۔ یعنی وہاں خاندانی نظام تتر بتر ہو رہا ہے جب کہ ہمارے ہاں ابھی تک اس کی نبض چل رہی ہے۔ مگر اس حوالے کے علاوہ ہم نے اپنے ہاں جن جن اشیاء کی سیل لگائی ہے بے چارے یورپ والے تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہمارے ہاں کسی زمانے میں تعلیم کا حصول خاصا مشکل کام تھا مگر جب سے ہمارے ہاں تعلیم کی سیل لگی ہوئی ہے۔ بی اے، ایم اے بلکہ پی ایچ ڈی بھی بازار میں نہایت ارزاں نرخوں دستیاب ہیں۔ گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے لئے کمرہ امتحان میں ایک عدد پستول اور کمرہ امتحان سے باہر روپوں کی ایک تھیلی کی ضرورت ہوتی ہے البتہ پی ایچ ڈی کی ڈگری محض تعلقات کے بل بوتے پر بھی مل سکتی ہے۔ ایک وقت تھا جب لوگ عزت اور شہرت کے لیے ایک طویل عرصہ تک جدوجہد کرتے تھے مگر اب اخباروں

ریڈیو اور ٹیلی وژن نے "صارفین" کی سہولت کے لیے عزت اور شہرت کی ایسی کلیئرنس سیل لگائی ہے کہ جسے چاہیں راتوں رات عزت اور شہرت کے بام بلند تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہمارے بہت سارے سیاست دانوں نے عزت اور شہرت اسی قسم کی کلیئرنس سیلوں ہی سے خریدی ہے ورنہ گروہ جدوجہد پر بھروسہ کرتے تو اس مقام سے محروم رہتے جو انہیں ایک کلیئرنس سیل کی بدولت ملا ہے ہم تو ایسے سیاستدان کو بھی جانتے ہیں جس نے ایک کلیئرنس سیل میں عزت اور شہرت حاصل کی اور پھر دوست کے حصول کے لیے یہ عزت اور شہرت ایک دوسری کلیئرنس سیل میں فروخت بھی کر دی۔ شفیق الرحمان نے اپنے نلی کے سفرنامے میں لکھا ہے کہ جب وہ بازار سے لوٹے تو ایک دوست نے پوچھا کہ آج کیا خرید و فروخت کی؟ جس پر انہوں نے جواب میں کہا کہ صرف خرید کی ہے الحمد للہ کوئی چیز فروخت کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ہمارے ہاں بھی عام لوگ خود کو صرف خرید تک محدود رکھتے ہیں خرید و فروخت کا کام صرف سیاستدان کرتے ہیں اور بے شک

"انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد"

اور اب اگر سیاستدانوں کا معاملہ درمیان میں آ ہی گیا ہے تو ہم ایک تجویز ان کاموں میں پیش کر ہی دیں جو ایک عرصے سے ہمارے ذہن میں کلبلا رہی ہے اور وہ تجویز یہ ہے کہ جس طرح دکاندار آؤٹ آف سیزن اشیاء کی کلیئرنس سیل لگاتے ہیں اور کم منافع پر حاضر سٹاک سے نجات حاصل کر لیتے ہیں اسی طرح سیاستدانوں کی بھی کلیئرنس سیل کا اہتمام ہونا چاہیے جنہیں عوام آؤٹ آف سیزن قرار دے چکے ہیں اس کلیئرنس سیل میں عوام کو مختلف "رنگ و نسل" کے سیاست دان بازار سے ارزاں نرخوں پر دستیاب ہو جائیں گے۔ امریکی' روسی' برطانوی' بھارتی غرضیکہ ہر Shade کے سیاستدان اس سیل میں شوکیسوں میں سجے نظر آئیں گے یہ ایک طرح سے سیاستدانوں کی بڑی مارکیٹ ہوگی عوام یہاں سے سیاستدان خریدیں گے اور پھر ان کا جو مصرف انہیں سمجھ میں آئے گا وہ اسے اس کے مطابق استعمال میں لائیں گے۔

تاہم یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہم یہ تجویز رواج زمانہ سے ناواقفیت کی بنا پر پیش نہیں کر رہے' کیونکہ رواج زمانہ تو یہ ہے کہ سیاستدان عوام کو فروخت کرتے آئے ہیں چنانچہ یہ تجویز اگر قابل عمل بھی ہے تو اسے محض دکھی دل کی پکار سمجھ کر سن لینا چاہیے کیونکہ اب سیاستدان جن "وردیوں" میں سامنے آ رہے ہیں یہ ان کا پہلے سے زیادہ بھیانک روپ ہے' سو ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم لوگ پہلے سے زیادہ چوکس ہو جائیں چنانچہ پیشتر اس کے یہ کہ لوگ ہم بے نواؤں کے بچوں کا بھی سودا کر دیں ہم خود پہل کر کے ان کی کلیئرنس سیل لگا دیں۔ گھوڑے کو دوڑ کھلانے کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کھوکھلے بانس کے ایک ٹکڑے میں دوا رکھ کر ایک سرا گھوڑے

کے منہ سے لگا دیا جاتا ہے اور دوسرا سر اپنے منہ سے لگا کر زور سے پھونک ماری جاتی ہے جس سے دوا گھوڑے کے حلق میں چلی جاتی ہے مگر اس میں احتیاط یہ کرنا پڑتی ہے کہ کہیں گھوڑا پہلے پھونک نہ مار دے ہم لوگوں کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے تاہم اس دفعہ ہمیں پہلے پھونک مار دینی چاہیے!

◆◆◆

گندہ نالہ

گندے نالے کو ہماری معاشرتی زندگی میں بہت باعزت مقام حاصل ہے چنانچہ کم از کم ایک گندہ نالہ قریباً ہر شہر کے بیچ و بیچ ہو کر گزرتا ہے جس طرح وینس میں لوگ نہر کے کنارے رہتے ہیں یا ایمسٹرڈام میں نہر کے ساتھ ساتھ گھر آباد نظر آتے ہیں اسی طرح ہمارے ہاں بھی لوگ گندے نالے کے قریب رہتے ہیں اور یہاں سے اٹھنے والی خوشبو سے مشام جاں کو معطر کرتے ہیں مگر لگتا ہے کہ معاشرے کی کچھ کالی بھیڑیں اس تہذیبی و معاشرتی روایت کی حرمت ختم کرنے پر تلی ہوئی ہیں چنانچہ آج کے اخبار میں ہم نے پڑھا کہ کچھ جرائم پیشہ لوگوں نے کلوگراموں کے حساب سے چرس گندے نالے میں چھپائی ہوئی تھی جو شاندی پر پولیس نے چھاپہ مار کر برآمد کر لی۔ دیکھا جائے تو چرس جیسی چیز کا گندے نالے سے برآمد ہونا کوئی اچھا شگون نہیں کیونکہ اس سے پہلے ان گندے نالوں کی تنی گندی ریپوٹیشن نہیں تھی چنانچہ یہاں سے تو لوگوں کے وہ خطوط برآمد ہوا کرتے تھے جو وہ اپنے عزیز و اقربا تک بحفاظت پہنچانے کے لیے محکمہ ڈاک کے کارندوں کے سپرد کرتے تھے یا پھر کوئی بے ہوش اس میں گر پڑا مل جاتا تھا مگر ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ چرس جیسی چیز گندے نالے سے ملی ہے ارباب حل و عقد کو اس واقعہ کا سختی سے نوٹس لینا چاہیے کیونکہ اگر یہ سلسلہ چل نکلا تو کل کلاں چرس ہی نہیں گندے نالے سے (کوئی) ہیروئن وغیرہ بھی برآمد ہو سکتی ہے۔

ممکن ہے ہمارے بعض قارئین یہ خیال کریں کہ ہم گندے نالے سے چرس برآمد ہونے کے واقعہ کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دے رہے ہیں اور اس سلسلہ میں غیر ضروری طور پر چڑ ہو رہے ہیں تو ایسا سوچنا درست نہیں کیونکہ معاملہ اصولوں کا ہے دراصل ہم بغیر کسی تفتیش و تحقیق کے محض پولیس کے بیان پر یقین نہیں کر سکتے کہ گندے نالے سے چرس برآمد ہوئی ہے تاہم ہمارے اس بیان سے خدانخواستہ کسی کو یہ گمان بھی نہیں گزرنا چاہیے کہ ہمارے دل میں پولیس سے زیادہ گندے نالے کے لیے عزت و احترام ہے۔ حاشا و کلا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہمارے یہ دونوں ہی قابل احترام ہیں۔ گندہ نالہ اس لیے اگر یہ شہر میں نہ ہو تو پورا شہر گندہ نالہ بن جائے یہ پورے شہر کی غلاظتیں اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے خود گندہ نالہ کہلاتا ہے مگر شہر کی حرمت پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ یہی حال پولیس کا ہے اس کے اہلکاروں پر اکثر بات میں آئے دن قتل، زنا بالجبر، ڈکیتی، رشوت اور ظلم و ستم کا بازار گرم کرنے کا الزام لگتا ہے مگر اس کے باوجود ان کے جذبہ خدمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ سو یہ جو ہم نے بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے گندے نالے سے چرس برآمد ہونے کی خبر پر اعتبار

کرنے سے انکار کیا ہے تو اصولی طور پر کیا ہے کیونکہ چرس تو اس سے پہلے بہت شریف لوگوں سے بھی برآمد ہوتی رہی ہے اسلحہ برآمد ہوتا رہا ہے' استاد دامن کے نیفے سے تو بم برآمد ہوا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بڑے بڑے امراء اور صاحب عزت لوگ بکری یا بھینس بلکہ چارہ تک چوری کرنے کے الزام میں پکڑے جاتے رہے ہیں مگر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی تو عدالت میں جا کر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر گندے نالے سے چرس برآمد ہوئی ہے تو یہ پولیس کا بیان ہے' گندے نالے کو بھی تو صفائی کا موقعہ دینا چاہیے۔

اور یہ فقرہ جو ہم نے ابھی ابھی لکھا ہے کہ گندے نالے کو بھی صفائی کا موقع ملنا چاہیے تو یہ غیر ارادی طور پر لکھا گیا ہے کیونکہ ہمارے ہاں گندے نالے کو صفائی کا موقع ہی کہاں ملتا ہے ہمارے ہاں نہ گندے نالے کی صفائی ہوتی ہے اور نہ "گندے نالے" کو صفائی کا موقع دیا جاتا ہے۔ جسے ایک دفعہ "گندہ نالہ" قرار دے دیا گیا اس کے بعد اس کے مقدر میں غلاظتیں ہی غلاظتیں ہیں جو روز نہ ٹوکریوں بھر بھر کر اس پر پھینکی جاتی ہیں۔ مزید ستم یہ کہ اسے صفائی کا موقع بھی نہیں دیا جاتا' جس کے نتیجہ میں اس کا پانی کناروں سے باہر بہنا شروع ہو جاتا ہے یا "ڈکا" لگ جاتا ہے۔ ان ہر دو صورتوں میں اس درجہ تعفن پھیلتا ہے کہ بھلے لوگوں کے دماغ پھٹنے لگتے ہیں۔ گندے نالے کے حوالے سے ایک لطیفہ ہم نے حال میں ہی سنا ہے اور وہ کچھ یوں ہے کہ

یک سردار جی دفتر جانے لگے تو انہیں خیال آیا کہ ان کا نالہ (ار ار بند) گندہ ہے انہوں نے سردارنی سے کہا کہ یہ نالہ بند دو سردارنی نے جواب دیا کہ اس وقت آپ کو دفتر سے دیر ہو رہی ہے فی الحال آپ جائیں واپسی پر بند دوں گی۔

سردار جی دفتر سے عموماً تین چار بجے واپس گھر آ جایا کرتے تھے مگر اس روز وہ شام کو چھ سات بجے گھر پہنچے اور کیفیت یہ کہ سانس پھولی ہوئی' ماتھے پر پسینہ اور لہجے میں تھکاوٹ! سردارنی نے پریشان ہو کر پوچھا کہ سردار جی خیر تو ہے؟ اس پر سردار جی نے غصے سے کہا "تم نے آج ڈیل کروا دیا' میں آج دفتر سے واپسی پر گھر آنے کے لیے بس میں بیٹھا تھا بس ابھی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ کنڈیکٹر نے میرے قریب گزرتے ہوئے آواز لگائی' گندے نالے والے یہاں اتر جائیں' میں کان لپیٹ کر وہیں اتر گیا' اور اب 4 میل سے پیدل آ رہا ہوں"

اب اللہ جانے اس لطیفے کا ریر بحث موضوع سے کیا تعلق ہے سوائے اس کے کہ اس میں گندے نالے کا ذکر آیا ہے مگر گندے نالے کی یہی تو بدقسمتی ہے کہ سیاست' ادب' معاشرت یا اخلاق کسی بھی موضوع پر گفتگو ہو رہی ہو بیچ میں آ جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں گندے نالے کی وسیع النظری ملاحظہ ہو کہ اگر اس سے چرس بھی برآمد ہو جائے اور برآمد کرنے والی اگر پولیس بھی ہو تو وہ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہتا بس خاموشی سے بہتا رہتا ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کناروں سے باہر بہنے لگتا ہے۔

◆◆◆

بکرے کا آخری سوال!

بقرعید ہمارے ہاں بکرا عید بن گئی ہے جس سے صورت حال تقریباً تبدیل ہو جاتی ہے کیونکہ اس سے تاثر یہ ملتا ہے کہ جیسے یہ دن بکروں کے لیے روز عید ہو حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ دن بکروں کے لیے روز قیامت سے کم نہیں ہوتا' بکروں کو کان سے کھینچ کر ''شہادت گاہ'' تک لایا جاتا ہے اور یہ کان کھینچنے کا عمل کئی ہفتوں سے جاری ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ان کے کان اتنے لمبے ہو جاتے ہیں کہ ان سے سننے کی بجائے صرف کھینچنے ہی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی قصائی بکرے سے کہے کہ میاں ادھر آؤ میں نے تمہیں ذبح کرنا ہے تو وہ بوجہ نافرمانی بلکہ بوجہ ثقل سماعت اس کے حکم کی تعمیل نہیں کرپاتا چنانچہ مجبوراً اسے کان سے کھینچتے ہوئے قصائی تک لے جانا پڑتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور بکروں کی خودی چونکہ زیادہ نہیں ہوتی' اس لیے انہیں ذبح کرنے سے پہلے ان کی رضا پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خود پاکستانی قوم کا یہی حال ہے۔ اس قوم کی خودی بھی ابھی تک بلند نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ قومی اور بین الاقوامی قصائی اسے ذبح کرنے سے پہلے اس کی رضا نہیں پوچھتے بلکہ ہر دفعہ کانوں سے کھینچتے ہوئے اسے مقتل تک لے جاتے ہیں۔ کچھ عرصے سے تو یہ صورت حال ہے کہ قومی اور بین الاقوامی قصائی ایک ہو گئے ہیں جبکہ بکرے ایک نہیں ہو رہے جس کے نتیجے میں ان کے ''ٹوٹے'' کر دیئے جاتے ہیں' گوشت صاحب حیثیت افراد میں تقسیم کر دیا جاتا ہے' کھال جماعت اسلامی کے حصے میں آتی ہے کیونکہ تقسیم کرنے والوں کا خیال ہے کہ قاضی صاحب کے لیے یہی کافی ہے۔

اس صورتحال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جسے یار لوگوں نے ذبح کرنا ہوتا ہے اسے احساس یہ دلایا جاتا ہے کہ اس میں خوشی ہماری نہیں بلکہ تمہاری ہے چنانچہ جس دن بکروں نے ذبح ہونا ہو اس دن کو ''بکرا عید'' کا نام دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ قصائیوں کی عید ہوتی ہے۔ یہی تکنیک اہل مغرب نے عورتوں کے حوالے سے بھی برتی ہے' ان سے عزت اور توقیر چھین کر انہیں دفتروں میں اسٹینو اور آفس سیکرٹری بنا دیا گیا اور ان کے حقوق کے چیمپئن بھی قرار پائے۔ ایڈ کے نام پہ ہماری نسلوں کو غلام بنا دیا گیا اور ہمارے محسن بھی

بھی قرار پائے۔ ہوس ملک گیری میں کروڑوں آزاد انسانوں کے پاؤں میں بیڑیاں پہنا دی گئیں اور انسانی حقوق کے پاسداری کا تمغہ بھی انہی کے گردنوں میں سجایا گیا۔ ہمارے قسائی اتنے پڑھے لکھے دور رس اور بین الاقوامی معاملات کے ماہر نہیں ہیں اس لیے وہ یہ کام بہت محدود پیمانے پر کرتے ہیں اور صرف اپنے علاقے میں اپنی بالادستی اور اپنی دہشت برقرار رکھنے کے لیے کرتے ہیں یہ کتنے نادان ہیں کہ چند کلیوں پر قناعت کئے بیٹھے ہیں حالانکہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے!

''بکرا عید'' کے سلسلے میں ایک نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ عید بکروں کے لیے واقعی روز عید ہے لیکن صرف ان بکروں کے لیے جو ''کانے'' ہیں' لنگڑے ہیں یا یوں کہہ لیں کہ کسی حوالے سے ناقص ہیں کیونکہ ان کی قربانی جائز نہیں سمجھی جاتی' یہی وجہ ہے ''بکرا عید'' پر جب صحت مند اور ذہین فطین بکروں کی شامت آئی ہوتی ہیں یہ ناقص بکرے خوشی سے بھنگڑے ڈال رہے ہوتے ہیں کیونکہ کوئی قسائی انہیں میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں کرتا۔ ذبح صرف وہی بکرے ہوتے ہیں جو میرٹ پر آتے ہیں اور عیش وہ کرتے ہیں جو میرٹ پر نہیں آتے۔ میرٹ کا یہ قتل عام ملک کے تمام اداروں اور محکموں میں بہت بری طرح جاری ہے۔ ہمارے جو نوجوان میرٹ پر آتے ہیں ان کے ساتھ بکروں جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے اور ہر وہ جو ہر لحاظ سے ناقص ہیں' وہ وزیر اور مشیر کے عہدوں تک جا پہنچتے ہیں!

میرا ارادہ ابھی اس موضوع کو طول دینے کا تھا لیکن ہمارے ہمسائے کے کھونٹے پر بندھے بکرے کے واویلا نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی ہے۔ وہ وقفے وقفے کے بعد اپنے حلق سے دردناک آواز نکال رہا ہے' مجھے تخت پر بیٹھے ہوئے خدا کے لہجے میں بولتے انسانوں کی بات سمجھ نہیں آتی لیکن زنجیروں سے بندھے مظلوموں کی زبان میں سمجھ لیتا ہوں۔ یہ بکرا مجھ سے کہہ رہا ہے کہ یہ تم کس کام میں پڑ گئے ہو۔ کالم لکھنے سے نظام نہیں بدلتے بلکہ اس کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے' مصلحتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑتی ہے' راحتوں کی بجائے تکلیفوں کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے' تب کہیں جا کر قسائی کے ہاتھ سے چھری کھینچنے کی نوبت آتی ہے۔ یہاں تک تو بکرے کی بات مجھے سمجھ آ رہی تھی بلکہ مجھے اس سے اتفاق بھی تھا لیکن اس کے آخری جملے نے مجھ سے لکھنے کی سکت چھین لی ہے چنانچہ میں یہ کام یہیں ختم کر رہا ہوں۔ اس نے پوچھا ہے کہ ''تمہارے دروازے پر جو بکرا بندھا ہے' وہ تم نے کتنے میں خریدا ہے اور اے میرے غم گسار دوست کیا قسائی کو تاکید کر دی ہے کہ وہ عید کے روز وقت پر پہنچے؟''

◆◆◆

شراب' اقتدار اور سیاست!

سیانوں سے سنا ہے کہ اقتدار کا نشہ شراب سے زیادہ ہوتا ہے اور جو سیاست اقتدار کے حوالے سے کی جاتی ہے وہ بھی نشے میں شراب کے نشے سے کم نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں نے گذشتہ دنوں سابق و موجودہ ارباب اقتدار اور ارباب سیاست کو شرابیوں کے لطیفے سنائے مگر عجیب بات ہے کہ ان میں سے ایک آدمی کے سوا کسی نے ان لطیفوں کو انجوائے نہیں کیا' بعض نے تو ان لطیفوں کی سنجیدہ تشریح کر کے سارا مزا ہی کرکرا کر دیا' کچھ نے اتنی مہربانی کی کہ ان لطیفوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا' بس برا سا منہ بنا کر رہ گئے' چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سابق صدر غلام اسحاق خان

''ایک امریکی خاتون بار میں سے لڑکھڑاتی ہوئی باہر نکلی' رستے میں اس نے محسوس ہوئی تو سڑک کے کنارے دھرے ڈرم میں تے کرنے کے لیے جھکی لیکن نشے کی زیادتی کی وجہ سے وہیں گر کر بے ہوش ہو گئی۔ ایک سردار جی ادھر سے گزرے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک خاتون جس کا سر ڈرم میں اور ٹانگیں باہر کو لٹکی ہوئی ہیں' بالکل بے سدھ پڑی ہیں' سردار جی سے اٹھا کر اپنے فلیٹ میں لے گئے' رومال سے اس کا چہرہ صاف کیا' اپنے بستر پر لٹایا اور پھر اپنے روم میٹ کو بلا کر تاسف بھرے انداز میں کہا'' ہر نام سہاں'' یہ امریکی قوم بھی بڑی فضول خرچ ہے' اس خاتون کو دیکھو یہ ابھی دو چار سال چل سکتی تھی لیکن یہ اسے ڈرم میں پھینک گئے ہیں''

سابق صدر یہ لطیفہ سن کر بہت خوش ہوئے اور شگفتہ لہجے میں کہا'' پہلی دفعہ کسی سکھ نے عقل کی بات کی ہے مگر افسوس ہم لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی' الیکشن سے قبل محترمہ بے نظیر سے میری ملاقات ہوئی تھی' اگر آپ نے یہی لطیفہ مجھے پہلے سنایا ہوتا تو میں ان کے گوش گزار بھی کرتا بہرحال اب بھی آپ کو اگر موقع ملے تو یہ لطیفہ انہیں ضرور سنائیں۔

میاں نواز شریف

چند شرابی رات گئے تک مے نوشی میں مشغول رہے حتیٰ کہ ان کی مت پوری طرح ماری گئی اور ان کا اپنے اپنے گھروں تک پہنچنا مشکل ہو گیا' ان میں سے ایک جو قدرے کم نشہ میں تھا' اپنے ساتھیوں کو کار میں ڈال کر انہیں ان کے گھر پہنچانے گیا' اس نے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے خاتون خانہ باہر نکلی' شرابی نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا'' بھابی آپ جلدی سے ان میں

سے اپنا خاوند پہچانیں میں نے بھی باقیوں کو بھی ان کے گھروں تک پہنچانا ہے"

میاں نواز شریف یہ لطیفہ سن کر متفکر نظر آئے بولے "ان دنوں مجھے بھی اپنے ساتھیوں کی پہچان میں دشواری ہو رہی ہے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان میں سے کون کس طرف ہے کچھ دوست دشمنوں سے زیادہ دشمن لگتے ہیں اور کچھ دشمنوں کی صورتیں دوستوں سے ملتی ہیں۔ میں ان دنوں حضرت جی سے ملوں گا شاید وہ کچھ بتا سکیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو

"ایک شرابی نے شراب خانے میں داخل ہوتے ہی ویٹر سے کہا آج تم سب لوگ میرے خرچ پر شراب پیو گے اور ہاں منیجر کو بھی میری طرف سے خوب پلاؤ تم سب لوگوں کا بل میں ادا کروں گا چنانچہ اس کے اصرار پر ایسا ہی کیا گیا لیکن جب ادائیگی کے لیے اسے بل دیا گیا تو اس نے جیبیں ٹٹولنے کے بعد کہا کہ اس کے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے جس پر منیجر نے پولیس کو فون کیا جو اسے پکڑ کر لے گئی۔ چھ مہینے کی قید کاٹ کر یہ شخص واپس اسی شراب خانے میں آیا اور ایک دفعہ پھر اپنی پیش کش دہرائی بس اس میں اتنی ترمیم کی کہ اس دفعہ منیجر کو اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا جائے گا اس پر منیجر نے وجہ پوچھی تو شرابی نے کہا "تم شراب پی کر آؤٹ ہو جاتے ہو اور پھر فون کر کے پولیس بلا لیتے ہو!"

میں نے یہ لطیفہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو سنایا تو انہوں نے کہا "شرابی کا فیصلہ صحیح تھا خود ہم بھی "منیجر" کے بارے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے کہ اس کی وجہ سے ہماری پہلی حکومت گئی اور آصف زرداری کو بھی جیل جانا پڑا۔ ویسے ہمارے نمائندے دو بڑی طاقتوں سے بات کر رہے ہیں ہم جو فیصلہ بھی کریں گے بہت سوچ سمجھ کر کریں گے"

غلام مصطفیٰ جتوئی

یک سردار جی سڑک پر بھنگڑا ڈال رہے تھے اور بڑھکیں لگا رہے تھے۔ کسی نے پوچھا "کیا بات ہے سردار جی پی ہوئی ہے؟" بولے "نہیں یک دوست بوتل لینے گیا ہوا ہے"

یہ لطیفہ میں نے جناب غلام مصطفیٰ جتوئی کو سنایا اس وقت ان کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ لطیفہ سن کر سخت برافروختہ ہوئے مگر جتوئی صاحب نے ادھر ادھر دیکھ کر ہولے سے میرے کان میں کہا "آپ تو اندر کی باتیں جانتے ہیں میں آپ سے رازداری کا وعدہ کرتا ہوں یہ بتائیں کہ واقعی کوئی بوتل لینے گیا ہوا ہے؟"

پیر پگاڑا

یک شخص شراب کے نشے میں دھت اپنے گھر پہنچا اور دروازے پر لگا تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر نشے کی زیادتی کی وجہ سے اس کا ہاتھ ہل جاتا اور چابی ادھر ادھر پھسل جاتی۔ ایک راہ گیر نے اسے پریشان دیکھا تو وہ آگے بڑھا اور بولا "تم چابی مجھے دو میں تمہیں تالا کھول دیتا ہوں" شرابی نے کہا "نہیں اس کی ضرورت نہیں تم صرف مکان کو پکڑ کر رکھو تالا میں خود کھولوں گا"

جب پیر پگاڑا نے یہ لطیفہ سنا تو وہ بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے "کمال ہے میرا بھی ہو بہو یہی مسئلہ ہے تالا کھولنے کے لیے چابی تو صحیح ڈالتا ہوں مگر مکان ہلنے کی وجہ سے چابی ادھر ادھر ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے میری پیش گوئیوں پر بھی حرف آتا ہے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کہ مکان پر کنٹرول کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے"

خان ولی خان

ایک بھلے مانس نے اپنے شرابی دوست سے کہا "شراب اتنی نقصان دہ چیز ہے کہ اگر یہ کسی درخت کی جڑوں میں انڈیلی جائے تو وہ درخت ہمیشہ کے لیے سوکھ جاتا ہے" شرابی نے یہ سن کر کہا "اس کا مطلب ہے کہ اگر کسی کے پیٹ میں درخت ہو تو اسے شراب نہیں پینا چاہیے"

میں نے یہ لطیفہ خان ولی خاں کو سنایا تو انہوں نے بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا "آپ یہ لطیفہ مجھے کیوں سنا رہے ہیں؟ ان لوگوں کو سنائیں جنہوں نے ہمارا تعاون حاصل کرنے کے لیے ہمیں ایسے صوبے کی حکومت میں حصہ دیا ہے جہاں کبھی ہماری دال نہیں گلی تھی اور جو ہماری وجہ سے کالا باغ ڈیم نہیں بنا رہے تھے اور ان کی جڑوں میں ہم نے اقتدار کی شراب انڈیلی ہے خمیازہ تو اس کا انہیں بھگتنا پڑے گا" اس پر میں نے عرض کیا "اقتدار کا نشہ تو آپ کی پارٹی کے وزیروں کو بھی چڑھ رہا ہے" ولی خان نے ہنس کر کہا "یہ شراب بہرحال ان کے لئے نقصان دہ ثابت نہیں ہوگی کیونکہ ان کے پیٹ میں درخت نہیں ہے"

◆◆◆

مصروف آدمی!

ہمارے ایک دوست ہیں' وہ جب بھی ملیں' لگتا ہے انتہائی جلدی میں ہیں۔ نیز یہ کہ ان پر کاموں کا شدید بوجھ پڑا ہوا ہے چنانچہ اس وقت بھی وہ دس بارہ کام نمٹا کر آ رہے ہیں اور پندرہ بیس کام ابھی انہوں نے نمٹانے ہیں۔ یہ اندازہ ہم ان کے چہرے سے لگاتے ہیں جس پر ہوائیاں اڑ رہی ہوتی ہیں یا ان کے سانس سے جو پھولا ہوا نظر آتا ہے باقی ماندہ یقین وہ اپنی باتوں سے ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ وہ دنیا کے مصروف ترین آدمی ہیں۔ چنانچہ ہم انہیں اگر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھنے کو کہتے ہیں تو وہ جلدی جلدی سانس لیتے ہیں جیسے وہ سانس لینے میں بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ اور سخت سردیوں میں بھی ماتھے پر نمودار ہونے والا پسینہ پونچھ کر کہتے ہیں "ضرور بیٹھتا مگر ابھی بہت کام کرنے ہیں" اور اس کے بعد وہ دو تین گھنٹے بیٹھے رہتے ہیں' ہم اس دوران انہیں بار بار یاد دلاتے ہیں کہ آپ نے ابھی بہت کام کرنے ہیں مگر وہ ہر بار "ہاں یار مجھے اب جانا چاہیے" کہہ کر اسی طرح اپنی جگہ بیٹھے رہتے ہیں حتیٰ کہ ہمیں کوئی کام یاد آ جاتا ہے چنانچہ ہم ان سے اجازت طلب کر کے وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ یہ دوست اسی جلد بازی کے عالم میں ہمارے پاس آئے' ہم نے بیٹھنے کو کہا' اس کے جواب میں پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولے "نہیں یار مجھے ابھی بہت کام کرنے ہیں" ہم اس روز چلے بیٹھے تھے چنانچہ پوچھ لیا "کون سے کام؟" کہنے لگے "سنا چاہتے ہو تو سنو! میں نے ابھی بجلی کا بل جمع کرانا ہے' یہ کرنا ہے وہ کرنا ہے" میں نے کہا "یہ تو صرف ایک کام ہوا' یہ کرنا ہے وہ کرنا ہے' تو کوئی کام نہیں" بولے "میرا مطلب ہے اس طرح کے اور بہت سے کام کرنے ہیں!" اس روز ہم نے طے کر رکھا تھا کہ ان کی جعلی مصروفیت کا بھرم ضرور کھولیں گے چنانچہ ہم نے کہا "میں یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ وہ کام کون سے ہیں؟" یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے اور بڑی دیر تک کاموں کی فہرست یاد کرنے کی کوشش کرتے رہے' چنانچہ تھک ہار کر کہنے لگے "دراصل صبح سے پے در پے اتنے کام کرنے پڑ رہے ہیں کہ مت ماری گئی ہے" اس پر ہم نے ایک دفعہ پھر انہیں زچ کرنے کے لیے کہا "بائی دی وے' صبح سے اب تک آپ نے کون کون سے کام کیے ہیں؟" انہوں نے جواب میں کہا "مثلاً ڈرائی کلینر سے کپڑے لے کر آیا ہوں' یہاں گیا ہوں' وہاں گیا ہوں!" اس پر ہم نے ہنس کر کہا "یہ تو پھر ایک ہی کام ہوا یعنی آپ ڈرائی کلینر سے کپڑے لے کر آئے ہیں لیکن یہ یہاں گیا' وہاں گیا کیا ہے؟" یہ سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولے "تمہیں نہیں پتہ دن میں کتنے کام کرنا ہوتے

ہیں' ابھی میں نے بجلی کا بل جمع کرانا ہے' یہاں جانا ہے' وہاں جانا ہے' اور پھر "پہلی دفعہ واقعی اٹھ کر چل دیے۔

دراصل ہم میں سے بہت سے دوست اس دوست ہی کی طرح ہیں اور خود ہم بھی جو اس دوست کی مصروفیات کا تمسخر اڑا رہے ہیں' اندر سے اسی طرح کے جعلی مصروف آدمی ہیں' تاہم ان سطور سے کوئی صاحب یہ اندازہ نہ لگائیں کہ خود کو ہر وقت مصروف سمجھنے والے کسی کے ساتھ دھوکے بازی کر رہے ہوتے ہیں' ایسا نہیں ہے' بلکہ یہ لوگ اپنے کام کی ترجیحات متعین نہیں کر پاتے' جس کی وجہ سے ہر وقت بجا طور پر پریشان نظر آتے ہیں اور ان کے اعصاب پر وہ تمام کام سوار رہتا ہے جسے انجام دینے کا گذشتہ کئی ہفتوں سے وہ صرف سوچ رہے ہوتے ہیں مگر انجام نہیں دے رہے ہوتے' مثلاً خود ہمیں کو لیجیے ہم نے اپنی میز پر گذشتہ چھ ماہ سے خطوں کے وہ بنڈل سجا کر رکھے ہوئے ہیں جن کے جواب لکھنے ہیں' ان کے ساتھ تین کتابوں کے ادھورے مسودے ہیں' ایک رسالے کا مسودہ ہے' جو ترتیب دینے کے لیے رکھا ہوا ہے' اور اسی طرح کے بیسیوں کام اور ہیں جو ہم نے کرنے ہیں۔ یہ سب کام ہم پورے خلوص دل سے ہر روز آنے والے کل سے شروع کرنے کا عزم رکھتے ہیں' چنانچہ ہر نئے دن کے طلوع ہونے پر ہم خود کو دنیا کا مصروف ترین سمجھتے ہیں اور ہر ملنے والے کے سامنے اپنی اس مصروفیت کا ذکر اس تفصیل سے کرتے ہیں کہ وہ دن اس تفصیل کے بیان ہی میں گزر جاتا ہے اور ہم

اج دا دن وی ایویں ای لنگیا
کوئی وی کم نہ ہویا

گنگناتے ہوئے سو جاتے ہیں' چنانچہ ثابت ہوا کہ "ویلے" آدمی سے زیادہ مصروف شخص کوئی اور نہیں ہوتا!

دراب "اصل کی بات یہ ہے کہ یہ جو صفت کے سات خون ہم نے اپنے سر لے لیے ہیں تو یہ ہماری سعادت مندی ہے' ورنہ اصل صورت حال تو یہ ہے کہ ہم لوگ من حیث القوم اس وطیرے کو اپنائے ہوئے ہیں' قیام پاکستان سے لے کر اب تک کتنے ہی ضروری کام ہیں جو ہم نے کرنا تھے' لیکن وہ ابھی تک "پینڈنگ" چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے گذشتہ انتالیس برس یہ کام کرنے کی بجائے ان کاموں کے بارے میں بیان دینے میں صرف کر دیے ہیں' چنانچہ جو حکمران بھی آتا ہے' ان کاموں کے بوجھ سے اس کا سانس پھولا ہوتا ہے' چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوتی ہیں' اسے دیکھیں تو لگتا ہے کہ وہ بہت جلدی میں ہے' اور اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھنا چاہتا جب تک وہ یہ تمام ضروری کام انجام نہ دے لے' مگر پھر ہوتا یوں ہے کہ وہ کام بھی کوئی نہیں کرتا اور جانے کا نام بھی نہیں لیتا' اگر کبھی عوام تنگ آ کر اس سے پوچھ لیں کہ تم نے ابھی تک کیا کیا ہے؟ تو وہ آگے سے کچھ اسی قسم کی بات کرتا ہے کہ "میں ذرا فارغ ہو لوں" ... ڈی کلیئر سے

پکڑے سے لے کر آیا ہوں' یہاں گیا ہوں' وہاں گیا ہوں'' اس پر وہ بندر یاد آ جاتا ہے جس نے ایک خرگوش کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا' مگر اسے کھانا کھلانے کی بجائے تیزی سے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چھلانگیں لگاتا رہا' جب بھوک سے خرگوش کا بر حال ہونے لگا تو اس نے دسترخوان کی ایک طرف رکھی اور کہا'' بھائی صاحب! بھوک بہت لگی ہے اب کھانے کا بندوبست کریں'' اس پر بندر نے بڑی پھرتی سے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چھلانگ لگاتے ہوئے کہا'' کھانے پر لعنت بھیجو تم میری پھرتیاں دیکھو'' ہمارے حکمرانوں کا حال بھی کچھ یہی ہے' ہم اگر حسن ظن سے کام لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نیت بری نہیں' بس ترجیحات غلط ہیں' اور گر حقیقت پسندی سے کام لیں تو اس کے علاوہ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے کیونکہ گذشتہ اکتالیس برس میں ہم لوگ ایک ہی دائرے میں بڑی تیزی سے گردش کرتے جا رہے ہیں۔

منیر اس ملک پہ آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

چنانچہ اب تو سوچا ہے کہ ایک دن ان حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پوچھیں کہ جناب! آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ ہم نے آپ کی بہت پھرتیاں دیکھ لیں اب آپ ہمارے کھانے دانے کا انتظام کریں...... اگر ہم نے یہ کام کرنے کا صرف عزم ہی نہ کیا ہے بلکہ کر بھی دکھایا تو بعون اللہ ورنہ ہم خود کو بھی اپنے حکمرانوں کی طرف معروف شخصیت ہی تصور کریں گے!

◆◆◆

جن اور جن کی بوتل!

شکر گڑھ کے حوالے سے اخباروں میں ایک خبر شائع ہوئی ہے' جس میں بتایا گیا کہ وہاں ایک موضع میں کسان جب صبح کے وقت اپنے کھیتوں میں فصل کی کٹائی کے لیے پہنچے' تو انہوں نے دیکھا کہ جنوں نے ان کی فصلیں پہلے ہی کاٹ کر رکھی ہوئی تھیں اور بڑی نفاست سے ان کے ڈھیر لگائے ہوئے تھے' یہ جن اس کام کے اتنے ماہر تھے کہ انہوں نے فصلوں کی کٹائی' فصلیں پکنے ہی پر کی تھیں' نیز ان کی علیحدہ علیحدہ ڈھیریاں پوری مہارت سے بنا کر رکھی تھیں۔ ہمیں یہ خبر پڑھ کر کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ جنوں پر ہمارا ایمان پختہ ہے' البتہ حیرانی اس بات پر ہوئی کہ جنوں نے اب انسانوں کے کام بھی آنا شروع کر دیا ہے' ورنہ ہم نے جنوں کے بارے میں جتنی حکایتیں سنی ہیں ان کے مطابق تو یہ جن بہت عجیب و غریب قسم کے سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں' مثلاً کبھی کسی لڑکی پر عاشق ہو جاتے ہیں اور اس میں حلول کر جاتے ہیں جس پر عامل کو بلایا جاتا ہے' جو مار مار کر اس لڑکی کا بھرکس نکال دیتا ہے' اور کہا جاتا ہے کہ یہ ''چمبٹی'' دراصل جن کو لگائی جا رہی ہے' اسی طرح کبھی کسی مکان پر پتھروں کی بارش شروع ہو جاتی ہے' اور کبھی یہ سننے میں آتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے گھر کے برتن ہوا میں اچھلنا شروع ہو جاتے ہیں' یہ جن کبھی کسی اہل خانہ کی چارپائیاں اٹھانا شروع کر دیتے ہیں اور کبھی جنگل میں انسانوں کا روپ دھار کر کسی راہ گیر کے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کا قد بڑھتے بڑھتے آسمان سے جا لگتا ہے' جس پر بیچارے راہ گیر کو مجبوراً بے ہوش ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ اگر دیکھا جائے تو جنوں کی کثیر تعداد بدستور قسم کی ہے' یہ کام وام کچھ نہیں کرتے بس شعبدہ بازیاں دکھا دکھا کر عوام کو مرعوب کرتے رہتے ہیں۔

جنوں کی ایک قسم تو ایسی بھی ہے جو اپنے تمام جاہ و جلال اور سب کچھ کر گزرنے کا اختیار رکھنے کے باوجود خود کو بالکل بے بس ظاہر کرتی ہے' یہ وہ جن ہیں جو اگر انسان ہوتے تو اپنی اس خصوصیت کی بنا پر اقتدار میں ہوتے' سیاستدان ہوتے' بیوروکریٹ ہوتے' مگر شومئی قسمت سے یہ جن رہ گئے' ترقی کی منزلیں طے نہ کر سکے۔ دریا میں نہاتے ہوئے ایک شخص کے ہاتھ میں ایک تربوز آیا' اس نے یہ تربوز پکڑا اور باہر کنارے پر آ گیا' جونہی اس نے تربوز کھولا تو اس میں سے ایک لحیم و شحیم جن قہقہے لگاتا ہوا برآمد ہوا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''کیا حکم ہے میرے آقا؟'' اس شخص نے کہا ''برادر! بات یہ ہے کہ میں غریب آدمی ہوں' کرائے کے مکان میں رہتا ہوں' تم اگر میرے لئے کچھ کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی پلاٹ دلوا دو۔'' یہ سن کر جن نے قہقہہ لگایا اور کہا ''تم نے اس مطالبے سے مجھے خاصے

بے وقوف آدمی لگتے ہو میں اگر تمہیں پاٹ دلوا سکتا تو میں نے خود تربور میں رہنا تھا!'' اب دیکھا جائے تو یہ جن وہ ہیں جو جنوں کے نام پر بدنما داغ ہیں' یا تو یہ خود کو جن نہ کہلائیں' یہ دعوے نہ کریں کہ وہ صاحب اختیار ہیں اور اگر وہ سیاہ سفید کے مالک ہیں تو پھر بے گھر لوگوں کو گھر دیں' بھوکے کو روٹی دیں اور حاجت مندوں کی ضروریات پوری کریں۔ بصورت دیگر یا تو انہیں نااہل سمجھا جائے گا یا انہیں ہڈحرام کہا جائے گا اور یا پھر یہ سمجھا جائے گا کہ یہ حال مست ہیں' انہیں دوسروں کی فاقہ مستی سے کوئی غرض نہیں!

بہت عرصہ ہوا ہم نے منور ظریف کی ایک فلم دیکھی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ الہ دین کا چراغ اس کے ہاتھ لگ جاتا ہے' وہ چراغ کو رگڑتا ہے' تو دھوئیں میں سے ایک جن قہقہے لگاتا ہوا برآمد ہوتا ہے' منور ظریف اسے کہتا ہے ''میں بہت اداس ہوں' خود کو تنہا محسوس کر رہا ہوں' میرے لیے لڑکی کا بندوبست کرو۔'' یہ سن کر جن ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ''میرے آقا! میں جن ہوں' دلال نہیں ہوں!'' اور جنوں کی یہ قسم وہ ہے جنہیں غیور جن کہا جا سکتا ہے لیکن اب ایسے جن خال خال ہی پائے جاتے ہیں' ورنہ ہم نے تو صاحب اقتدار لوگوں میں' سیاستدانوں میں' صحافیوں میں اور دانشوروں میں ایسے ایسے ''جن'' دیکھے ہیں' جن کی ساری عمر ''جن'' کی بک ہولڈر پر سفارت خانوں کی دہلیز میں گزر جاتی ہے۔ یہ جن قیمتی لباسوں میں پورے کروفر کے ساتھ ہمارے اور آپ کے درمیان رہتے ہیں اور ان کا شمار بہت معزز جنوں میں ہوتا ہے' حالانکہ انہیں مونچھیں بڑھا کر' کاندھوں پر رومال رکھ کر اور مٹھی میں سگریٹ دبا کر سامنے ہوٹل کے باہر کھڑا ہونا چاہیے!

◆◆◆

کھوٹے اور کھرے سکے!

ہمیں اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے۔ دکاندار کھوٹے اور کھرے سکوں کی پڑتال میں خاصی جانفشانی سے کام لیا کرتے تھے‘ آنہ دونی‘ چونی اور اٹھنی کا سکہ قبول کرنے سے قبل باقاعدہ ”تحقیقاتی کمیشن“ بٹھایا جاتا جو خود دکاندار پر مشتمل ہوتا۔ وہ سکے کو رد یا قبول کرنے کا فیصلہ کرتا اور اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہمارے محلے کی نکڑ پر ایک بوڑھے پنساری کی دکان تھی۔ ظاہر ہے اس کی نظر بھی اس وقت خاصی کمزور ہو چکی تھی‘ چنانچہ محلے کے بچے اور نوجوان کھوٹے سکے چلانے کے لیے اسی کی دکان کا رخ کرتے لیکن کچی گولیاں وہ بھی نہیں کھیلا ہوا تھا چنانچہ وہ ایک آنکھ میچ کر سکے کو اپنی دوسری آنکھ کے قریب لاتا اور اسے گھما گھما کر یوں دیکھتا جیسے گھڑی کے پرزوں کا معائنہ کر رہا ہو۔ اگر یہ سکہ کھرا ہوتا تو اپنے گلے میں ڈال لیتا اور اگر کھوٹا ہوتا تو اسے گھما کر سڑک پر پھینکتا جو لڑھکتا لڑھکتا نالی میں جا گرتا۔ ہمیں یاد ہے کہ کچھ دکانداروں نے چھوٹے چھوٹے مقناطیس بھی رکھے ہوئے تھے‘ وہ سکے کو گلے میں ڈالنے سے پہلے مقناطیس کے قریب لے جاتے‘ اگر مقناطیس اسے اپنی طرف کھینچتا‘ تو یہ بھی اسے قبول کر لیتا‘ بصورت دیگر ایک ندری پر ایک ہلکا پھلکا سا لیکچر دے کر اس ”نوسرباز“ کو یہ سکہ واپس کر دیتے‘ جو اسے چلانے کی کوشش کر رہا ہوتا!

اپنے محلے کا ایک اور دکاندار بھی ہمیں یاد ہے‘ وہ چونی گلے میں ڈالنے سے پہلے دکان کے فرش پر لڑھکا کر دیکھا کرتا‘ اگر اس سکے کی چال بلکہ چال چلن درست ہوتا تو اسے قبول کر لیتا بصورت دیگر اس کا رخ گاہک کی سمت کر کے اسے دوبارہ فرش پر لڑھکا دیتا۔ یہ فرش والی تکنیک اسے اس لیے برتنی پڑتی کہ کچھ ماہرین فن ایک آنے کے سکے کو سارا ہفتہ فرش پر رگڑنے کے بعد اس کے کنارے گول کرتے اور پھر ”چونی“ ظاہر کر کے کسی ”کمزور نظر“ دکاندار کے پاس چلانے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ ”چونی“ اسکی تھی کہ جو فرش پر لڑھکانے کی صورت میں اپنی ”چال“ کی وجہ سے پکڑی جاتی تھی۔ ہمیں یاد ہے کہ جو سکہ پڑے پڑے کالا ہو جاتا تھا‘ دکاندار اسے بھی قبول کرنے سے انکاری ہوتے تھے‘ چنانچہ اس کی کالک اتارنے کے لیے اسے ریت کے ساتھ چمکانا پڑتا تھا مگر جو کالک ایک دفعہ لگ جائے وہ کہاں اترتی ہے۔ چنانچہ یہ ”روسیاہ“ سکے بھی دکانداروں کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوتے تھے!

یہ کھرے اور کھوٹے سکوں کی یاد ہمیں اس لیے آئی ہے کہ آج کے دکاندار پیسے‘ پچیس پیسے کے سکے کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے‘ بس اندھا دھند وصول کرتے جاتے ہیں اور بغیر جانچ پڑتال کیے اسے اپنے گلے میں پھینک دیتے ہیں۔ ہم نے اس کی وجہ معلوم

کرنے کی کوشش کی تو اس نتیجے میں پہنچے بلکہ ان نتیجوں پر پہنچے کہ اس دنوں بازار میں کھوٹے سکے ہیں ہی نہیں۔ چنانچہ آج کا دکاندار آنکھیں بند کر کے ہر سکے کو قبول کر لیتا ہے۔

دوسرا نتیجہ ہم نے یہ اخذ کیا کہ پہلے ان عوام الناس قسم کے سکوں کی کچھ قدر و قیمت ہوتی تھی' چنانچہ دکاندار کو بڑی سوچ و بچار کے بعد انہیں رد یا قبول کرنے کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا' جبکہ آج کل لوگوں کے پاس پیسہ بہت آ گیا ہے' چنانچہ چونی اٹھنی کی کوئی قیمت ہی نہیں رہی' اور یوں دولت کی اس ریل پیل میں بے شمار کھوٹے سکے بھی کھرے سکوں میں شمار ہونے لگے ہیں۔ ایک نتیجہ ہم نے یہ بھی اخذ کیا کہ لوگ اب چھوٹے موٹے فراڈ نہیں' بڑے بڑے فراڈ کرتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کی حسابی نظر بھی نچلی سطح کے نوسر بازوں کی بجائے اعلیٰ سطح کے نوسر بازوں پر پڑتی ہے۔ ایک اعلیٰ سطح کے نوسر باز نے پندرہ پندرہ روپے کے جعلی نوٹ تیار کئے اور اپنے کارندوں سے کہا کہ انہیں دیہات میں پھیلا دو' کیونکہ شہر کی نسبت دیہات کے لوگ سادہ لوح ہوتے ہیں' اور یوں انہیں بے وقوف بنانا آسان ہوتا ہے ایک کارندہ یہ نوٹ لے کر کسی گاؤں میں پہنچا' اور لاٹھی ٹیکتی ہوئی ایک بوڑھی عورت کو پندرہ کا نوٹ دے کر اس سے بھنا مانگا۔ بوڑھی عورت نے نوٹ پکڑا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ساڑھے سات سات کے دو نوٹ اس کو تھما دیئے۔ سو صورت حال اب وہی ہے جو اقبال نے

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

والے شعر میں بیان کی ہے۔ یعنی سلطانی تو عیاری تھی ہی اب درویشی میں بھی عیاری آ گئی ہے۔

اور اب اگر ہم اپنی ساری گفتگو میں سے کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کریں تو ہماری یہ کوشش سراسر سادہ لوحی میں شمار ہو گی کیونکہ شفیق الرحمان نے اپنی ایک کہانی کے آخر میں لکھا ہے کہ "پیارے بچو' اس کہانی سے نتیجہ یہ نکلا کہ ضروری نہیں ہر کہانی کا کوئی نتیجہ بھی ہو!" سو نتیجہ تو نہیں' البتہ ہم اپنی اس خواہش کا اظہار ضرور کر سکتے ہیں کہ کھوٹے سکوں کی پڑتال کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کھوٹے سکے ہمارے زمانے میں تھے' تو یہ آج بھی موجود ہوں گے۔ بس فرق یہ ہے کہ پہلے دکاندار اسے مقناطیس سے پرکھتے تھے' یا آنکھ میچ کر اس کا جائزہ لیتے تھے' اور اس پڑتال کے نتیجے میں اگر یہ سکہ کھرا ثابت ہوتا تو اسے چوم کر اپنے پاس رکھتے۔ بصورت دیگر اسے اٹھا کر گندی نالی میں پھینک دیتے۔

لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ کھوٹے اور کھرے سکے دونوں دکاندار کے گلے میں موجود ہیں' جہاں اسے کھوٹا سکہ چلانا ہو وہاں

وہ کھوٹا سکہ چلا لیتا ہے اور جہاں کھرے سکوں کی ضرورت پڑے وہاں کھرے سکوں کو "رخصت" دی جاتی ہے۔ چنانچہ اب دکاندار کے گلے میں جو سکے ہیں ان میں گھسے ہوئے کناروں والا آنہ بھی ہے۔ جو چونی کی جگہ سنبھالے بیٹھا ہے۔ اور وہ روسیاہ سکے بھی جن کی کالک اتارے نہیں اتر سکتی۔

◆◆◆

آمریت زندہ باد

قارئین کرام نوٹ فرمائیں کہ آج کے بعد سے میں جمہوریت کا نہیں ڈکٹیٹر شپ کا حامی ہوں بلکہ مجھے گزشتہ تاریخوں سے ڈکٹیٹر شپ کا حامی تصور کیا جائے اور یوں میں نے آج تک جمہوریت کے حق میں اور آمریت کی مخالفت میں جو کچھ لکھا ہے' اسے بذیان سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے' گزشتہ تاریخوں سے آمریت کا حامی تصور کرنے کی درخواست میں نے اس لیے بھی کی ہے کہ اگر موجودہ جمہوری حکومت کے بعد کوئی غیر جمہوری حکومت برسر اقتدار آئے تو مجھے "بقایا جات" گزشتہ تاریخوں سے ادا کئے جائیں۔ ویسے اس ماہیت قلب کی کوئی خاص وجہ نہیں' سوائے اس کے کہ جمہوریت کا حامی ہوں اور چونکہ جمہوریت میں جمہور کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے لہٰذا میرا ووٹ آمریت کے حق میں ہے کیونکہ اب جمہور کے متعلق میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ وہ جمہوریت کے حامی نہیں ہیں بلکہ ان کا آئیڈیل نظام آمریت ہے۔ یہاں ایک امر کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ جمہور سے میری مراد صرف عوام نہیں بلکہ خواص بھی ہیں اور ان خواص میں جمہوریت کی جنگ لڑنے والے سیاستدان' دانشور' صحافی' علماء بھی شامل ہیں بلکہ آمریت کے حق میں "اجماع امت" کا یہ عالم ہے کہ اس معاملے میں لیفٹ اور رائٹ دونوں ہم زبان ہیں۔

ممکن ہے بعض قارئین سمجھ رہے ہوں کہ میں شاید ان سے کوئی پہیلی بجھوا رہا ہوں' حالانکہ اس میں پہیلی وہیلی کوئی بات نہیں۔ اگر ہم اپنے عوام اور خواص کے ہیروز پر ایک نظر ڈالیں تو بات فوراً سمجھ میں آجاتی ہے کیونکہ پاکستانی مسلمانوں کے سارے ہیروز اپنے اپنے علاقے کے زبردست آمر ہی یا رہے ہیں۔ ان میں بعض حوالوں سے کچھ بہت قابل احترام بھی ہیں لیکن بہرحال ان کا شمار آمروں میں ہوتا ہے' ہمارے پسندیدہ آمروں کی اس فہرست میں کمال اتاترک' جمال عبدالناصر' سوئیکارنو' ضیاء الحق' ایوب خان' بھٹو' صدام حسین' قذافی' بومدین اور بہت سی دوسری شخصیات شامل ہیں' اندرون ملک جمہوریت کے حق میں نکلنے والے بڑے بڑے جلوسوں کے شرکاء اور ان جلوسوں کی قیادت کرنے والے رہماؤں کے بیرون ملک ہیرو یا تو حیاتی بادشاہ ہیں اور یا پھر جابر ڈکٹیٹر ہیں۔ اب اپنے حبیب جالب سے زیادہ جمہوریت کا حامی تو کوئی نہیں لیکن چین' روس' افغانستان' کیوبا اور جہاں جہاں پر "پرولتاری آمریت" قائم ہے' حبیب جالب ان آمروں کے مداح خواں ہیں۔ بابائے جمہوریت نوابزادہ نصراللہ خان کے بھی کچھ اپنے پسندیدہ آمر ہیں۔ یحییٰ خان' ولی خان' قاضی حسین احمد' مولانا شاہ احمد نورانی' مولانا فضل الرحمن' علامہ ساجد نقوی اور دوسرے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کا

ہے۔ دانشوروں کے بھی اپنے اپنے پسندیدہ آمر ہیں جن کی ایک ایک ادا پر وہ قربان ہوئے جاتے ہیں اور جو عموماً تو قیر محبت ہی اس رہنما سے کرتے ہیں جس نے ملک میں دہشت پھیلائی ہو کہ ان کے خیال میں حکمران بھی اس باپ کی طرح ہونا چاہیے جو نوالہ سونے کا دیتا ہو اور دیکھتا شیر کی آنکھ سے۔ پاکستان میں آمریت کے بانی ایوب خان کی تصویر آج بھی ہر ٹرک پر دیکھی جا سکتی ہے۔

عوام اور خواص کے آمریت پسند ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ جن مقبول عام سیاسی جماعتوں کے وہ پیروکار ہیں وہ سیاسی جماعتیں اپنے عہدداروں کا انتخاب بھی نہیں کراتیں بلکہ اس ضمن میں ہمیشہ نامزدگی سے کام چلایا جاتا ہے۔ اس سے ان جماعتوں کے رہنماؤں کی آمریت پسندی بھی واضح ہو جاتی ہے اور عوام و خواص کی ان سے محبت بھی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ آمریت سے عوام کی والہانہ محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے نظریے کے خلاف نکلنے والے جلوس پر حملہ کر دیتے ہیں اور اختلاف رائے پر جلسے اکھاڑ دیتے ہیں۔ خواص کا یہ عالم ہے کہ اگر انہیں کسی اخبار کا اداریہ، کالم یا خبر پسند نہ آئے تو اخبار کے دفتر کو آگ لگوا دیتے ہیں اور وہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ "جمہوریت دشمن" اخبار کے ایڈیٹر کو خبردار کرتے ہیں کہ اگر آئندہ بھی اس جسارت کا مظاہرہ کیا گیا تو آئندہ بھی یہی کچھ ہو جائے گا۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ ہم سے کون مائی کا لال ہے جو سمجھتا ہے کہ وہ جمہوریت کا حامی ہے؟

ہمارے ہاں حال ہی میں ایک دلچسپ صورتحال نے جنم لیا ہے۔ جس کا "لب لباب" نتیجہ یہ ہے کہ ہماری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل مرزا اسلم بیگ ہمارے خواص کے ہیرو بن گئے ہیں۔ خواص کا بطور خاص ذکر میں نے اس لیے کیا کہ عوام تو پہلے دن سے اپنی فوج سے محبت کرتے ہیں لیکن یہ خواص ہیں جو اس کے بارے میں ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں۔ بس ہوا یوں کہ جنرل صاحب کے ایک بیان سے امریکہ دشمنی اور صدام دوستی کی ذرا سی خوشبو ہمارے ان دانشوروں کو محسوس ہوئی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے فوج کے سارے "گناہ" معاف کر دیے اور اپنے تجزیوں میں جنرل صاحب کے لیے اس قدر رطب اللسان ہو گئے کہ لگتا تھا "شمع محفل" ان کے آگے رکھ دی گئی ہے اور اب ان سے "صدارتی کلام" سنانے کی فرمائش کی جا رہی ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ جنرل صاحب کو مشاعرے تک کی صدارت پسند نہیں ورنہ ہمارے دانشوروں نے تو اشاروں کنایوں میں ان سے محفل لوٹ لینے کی فرمائش کی تھی۔

ویسے یہ تو آپس کی بات ہے کہ اپنے عوام اور خواص کو خواہ مخواہ "میسنے" مارے جا رہا ہوں کیونکہ ہماری آمریت پسندی کوئی ایسا رجحان نہیں ہے جس نے ہماری قوم میں گزشتہ 43 برسوں میں جنم لیا ہو بلکہ ہم مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد سے اب تک جنگجو بادشاہ، بہادر سپہ سالار اور نیک دل آمر ہمارے ہیرو رہے ہیں۔ ان گزشتہ چودہ سو برسوں میں اگر کسی

ایک مسلمان ملک میں بھی مروجہ معنوں میں جمہوری حکومت آئی ہو تو مجھے اس کا نام بتائیں' میں اپنا دعویٰ واپس لیتا ہوں کیونکہ یک دو نام تو خود میرے ذہن میں بھی آ گئے ہیں مگر اس سے میرا موقف غلط ثابت نہیں ہوتا کیونکہ مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں۔ ویسے تو مروجہ اصل تے وڈی جمہوریت کی تاریخ بھی دو ڈھائی سو برسوں سے زیادہ پرانی نہیں مگر سوال یہ ہے کہ ان دو ڈھائی سو برسوں میں بھی جمہوریت دنیا کے متعدد ممالک میں اپنی جڑیں بہت مضبوط کر چکی ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ مسلم ممالک کی سرزمین اسے راس نہیں آتی؟ جمہوریت کے بڑے سے بڑے چیمپئن کا عمل خواہ وہ سیاستدان ہو یا دانشور' لیفٹ کا ہو یا رائٹ کا' مکمل طور پر آمرانہ ہے اور اس کا اندرون ملک یا بیرون ملک جو ہیرو ہے وہ اپنے علاقے کا نہایت جابر قسم کا آمر ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ فرد کی طرح ہر قوم کی بھی ایک سائیکی ہوتی ہے اور مروجہ جمہوریت مسلمان قوم کی سائیکی میں شامل ہی نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم لوگ اپنے نظریاتی گروپ سے وابستہ لوگوں کے سات خون بھی معاف کر دیتے ہیں چنانچہ دنیا میں اگر کوئی "اسلامی آمر" ہے تو سلام پسند اس کے حامی ہیں اور اگر کوئی "سوشلسٹ آمر" ہے تو سوشلسٹ اس کے فدائی ہیں؟ وجہ جو کچھ بھی ہو' ثابت بہرحال یہ ہوتا ہے کہ ہمارے عوام' خواص دانشور اور سیاستدان سب آمریت کی زلف کے اسیر ہیں اور چونکہ جمہور آمریت کے حامی ہیں اور میں جمہوریت پسند ہوں لہٰذا مجھے گزشتہ تاریخوں سے آمریت کا حامی تصور کیا جائے۔ آمریت زندہ باد!

◆◆◆

روس بھائی جان' واپس آ جاؤ!

یک بہت پرانا لطیفہ ہے بلکہ بقول منیر نیازی اس لطیفے کی مونچھیں بھی سفید ہو چکی ہیں کہ ایک کفن چور رات کو قبرستان سے مردوں کا کفن اتارا کرتا تھا' جب وہ مرا تو اس کے بیٹے نے یہی کام شروع کر دیا بلکہ وہ نہ صرف یہ کہ کفن چور تھا بلکہ جاتی دفعہ مردے کو قبر سے باہر بھی پھینک جاتا تھا۔ اس پر گاؤں کے لوگوں نے اس کفن چور کے باپ کو اچھے لفظوں میں یاد کرنا شروع کر دیا کہ اللہ جنت بخشے' مرحوم بہت نیک دل انسان تھا وہ مردے کا کفن اتارتا تھا اسے بے حرمت تو نہیں کرتا تھا'

بس کچھ اسی قسم کی صورتحال موجودہ خلیجی جنگ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے' امریکہ اپنے اتحادیوں سمیت عراق کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تلا ہوا ہے اور عراق کے دیسے وہ سعودی عرب کو عمر بھر کے لیے اپاہج بنانا چاہتا ہے چنانچہ وہ لوگ بھی جو روس کی عالمی غنڈہ گردی سے تنگ تھے' اس سابقہ غنڈے اور موجودہ "شریف شہری" کو یاد کرتے ہیں کہ اگر آج موصوف بھی میدان میں ہوتے تو امریکہ کو اس کھلی بدمعاشی کی جرات نہ ہوتی اور اصل "بھلے وقتوں" میں ہوتا یوں تھا کہ دو عالمی غنڈے بقائے باہمی کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے جب کسی نے کسی کمزور پر ہاتھ اٹھانا ہوتا تھا تو وہ اپنے "ہم عصر" غنڈے سے مشورہ کر لیتا تھا اور پھر اس باہمی مشاورت کے مطابق کوئی قدم اٹھایا جاتا تھا' مثلاً مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر دونوں غنڈوں متفق تھے۔ چنانچہ "پاکستان کے عظیم دوست" امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ باہمی سمجھوتوں کے پیچ و خم میں کھو کر رہ گیا مگر جب مغربی پاکستان بھی ہتھیانے کی کوشش کی گئی تو امریکہ نے این او سی جاری کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ کام اس کے مفاد میں نہیں تھا۔ اسی طرح روس بھی امریکہ کو ایک حد سے آگے نہیں جانے دیتا تھا اور جہاں اس نے روکنا ہوتا' بے آواز بلند "بالٹ" کہتا جس کے نتیجے میں امریکہ کے قدم وہیں رک جاتے۔ ان دو غنڈوں کی ان پالیسیوں کا ایک فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ عالمی جنگ کا خطرہ ٹل جاتا تھا' نیز اقتدار کا توازن برقرار رکھنے کے چکر میں کئی کمزور ملک' ان دو غنڈوں میں سے کسی ایک غنڈے کی "تڑی" کی وجہ سے بچ جاتے ہیں مگر روس کے کمزور پڑنے کی وجہ سے اب امریکہ پوری دنیا کے لیے "شیدا پستول" بنا ہوا ہے اور جگا ٹیکس وصول کرنے کے لیے جس کی چھترول چاہتا ہے' سنا دیتا ہے چنانچہ اب لوگ روس کو یاد کرنا شروع ہو گئے ہیں کہ اللہ جنت بخشے موصوف بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی وجہ سے کئی چھابڑی فروش "شیدا پستول" کے چنگل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تھے!

یہی وجہ ہے کہ موجودہ خلیجی جنگ میں گم ارکم مجھے تو روس بہت یاد آیا ہے اگر آج آنجہانی میں کوئی دم خم ہوتا تو وہ پہلے مرحلے پر ہی عراق کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی قرارداد کو ویٹو کر دیتا اور یوں اس ہولناک جنگ کا آغاز ہی نہ ہوتا جس کا مقصد عالم اسلام کو ایک دوسرے سے بھڑا کر تباہ کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ روس عالم اسلام کو نقصان پہنچانے میں کبھی امریکہ سے پیچھے نہیں رہا خصوصاً پاکستان تو اس کی "مہربانیوں" کا ہمیشہ سے ہدف رہا ہے مگر آج ایک پاکستانی مسلمان کے طور بھی مجھے روس کی قدر محسوس ہو رہی ہے اور یہ "بدمعاش" بہت یاد آ رہا ہے۔ ویسے کہنے والوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ روس راتوں رات اتنا کمزور نہیں ہو سکتا کہ امریکہ کا ہاتھ نہ پکڑ سکے بلکہ وہ اپنی کمزوری کا جعلی تاثر دے رہا ہے تاکہ امریکہ اپنی ساری طاقت خلیج میں جھونک دے اور اس کے نتیجے میں اتنا کمزور ہو جائے کہ اس "انکل لکام" سے چھڑی کے بغیر نہ چلا جائے دوسرے لفظوں میں اس کے ساتھ وہی ہو جو خود روس کے ساتھ افغانستان میں ہوا ہے۔ بات بھی دل کو لگتی ہے تاہم موجودہ صورتحال ظاہری طور پر یہی ہے کہ گویا چوف "گربہ" بنے ہوئے ہیں ورنہ اس "گربہ" کو شش کرتا ہے تو یہ اس کے شکار سے کوسوں دور بھاگ جاتی ہے اور ظاہر ہے یہ صورتحال امن عالم کے لیے مفید نہیں کہ امن عالم کے لیے ایک غنڈہ خطرناک اور دو غنڈے مفید ہیں!

بس یہی وہ صورتحال ہے کہ میرا دل دنیا بھر کے امن پسند ممالک خصوصاً اسلامی ممالک سے ایک اپیل کرنے کو چاہ رہا ہے اور وہ اپیل یہ ہے کہ ان میں سے جو ممالک امریکی بلاک سے وابستہ ہیں وہ فوری طور پر اس بلاک کو خیرباد کہیں اور اپنی وابستگیاں روس کے ساتھ استوار کریں تاکہ اس "ٹانک" سے ان کی کھوئی ہوئی طاقت اور جوانی بحال ہو جائے اور یوں وہ اس نازک موقع پر عالم انسانیت کے مشترکہ دشمن اور دنیا کے امن کو برباد کرنے والے امریکہ کے مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑے ہو سکیں۔ ان دو غلاموں کا اتحاد دنیا بھر کے انسانوں کے لیے مضر ہے لہٰذا ان میں نفاق پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ "نظریہ ضرورت" کے تحت فی الوقت روس کو مضبوط کیا جائے تاکہ وہ امریکہ کے "تھلے" لگنے کی بجائے خود کو اس کے برابر سمجھے اور یوں اس کے نتیجے میں "گلیاں ہو ون سنجیاں وچ میرزا یار پھرے" والی موجودہ صورتحال کا خاتمہ ہو سکے! اس ضمن میں ذاتی حیثیت سے اولیت کی "سعادت" حاصل کرنا چاہتا ہوں چنانچہ ایڈیٹر نوائے وقت سے میری درخواست ہے کہ وہ میرے اس کالم کو اشتہار سمجھ کر شائع کریں جس کا مضمون صرف اتنا ہے کہ روس بھائی جان! واپس گھر آ جائیں آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا!

آوازیں!

ناصر ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہو گیا اور پھر اس نے کہا "کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں تھوڑی دیر پہلے کیوں ہنس رہا تھا؟" میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور کہا "تم اس لیے ہنس رہے تھے کہ ہنسنا بہت آسان ہے جب کہ رونے کے لیے خاصی ریاضت کی ضرورت ہے!"

"ہاں! میرے خیال میں تم صحیح کہتے ہو" ناصر نے ایک بار پھر ہنستے ہوئے کہا "ہم لوگ خاصے "رام طلب" ہو گئے ہیں! میں نے چند برس قبل ایک موقع پر رونے کی کوشش کی تھی مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ میں نے پھر ہنسنا شروع کر دیا! میری دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے! میں تو تھوڑی دیر بعد تھک ہار کر خاموش ہو گیا مگر وہ ہنستے چلے گئے ان میں سے کئی تو ابھی تک ہنس رہے ہیں۔ کیا تم یہ دبی دبی ہنسی نہیں سن رہے؟"

"ہاں سن تو رہا ہوں مگر میں سمجھا کہ یہ شاید میری اپنی آواز ہے دراصل آوازیں بھی گڈمڈ ہو کر رہ گئی ہیں۔ کبھی کبھی تو دوسروں کی آوازیں اپنی آوازوں جیسی لگنے لگتی ہیں اور کبھی اپنی آواز پر دوسروں کی آواز کا گماں گزرتا ہے لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ جو ہنسنے کی آواز آ رہی ہے یہ میری آواز نہیں ہے؟"

"تم نے تو مجھے بھی شک میں ڈال دیا ہے۔ اب تو یہ آواز مجھے اپنی آواز لگنے لگی ہے ذرا کان لگا کر سنو کہ یہ میری آواز ہے تو اس کو منع کر دو۔ میں ہنسنا نہیں چاہتا؟"

"لیکن تم کیوں ہنسنا نہیں چاہتے؟" میں نے پوچھا "آخر ہنسنے میں حرج ہی کیا ہے؟"

"ہاں یہ بات تو صحیح ہے۔" ناصر نے کہا "مگر رونے میں بھی کیا حرج ہے۔ دیکھو ہمیں روئے ہوئے ایک زمانہ گزر چکا ہے!"

"ذرا رک جاؤ! ابھی ابھی تم نے یہ آواز سنی ہے؟ یہ تو رونے کی آواز ہے!"

"کہیں یہ میری آواز تو نہیں؟"

"نہیں مجھے تو یہ آواز اپنی آواز لگتی ہے۔"

"تم اپنی آواز کی شناخت کھو چکے ہو۔ اس کی بات نہ کرو۔ یہ میری آواز ہے اور اگر یہ آواز ہے تو سے منع کرو میں رونا نہیں

چاہتا۔"

"لیکن تم کیوں رونا نہیں چاہتے؟" میں نے پوچھا "آخر رونے میں حرج ہی کیا ہے؟"

"ہاں یار تم ٹھیک کہتے ہو دراصل ہم لوگ ہنسنا اور رونا بھول چکے ہیں۔ یہ آوازیں ذرا غور سے سنو نہ ہنسنے والوں کو ہنسنا آتا ہے اور نہ رونے والوں کو رونا آتا ہے!"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو مگر تم یہ کیسے ٹھیک کہتے ہو؟"

"مجھے ان کی شکلیں نظر آ رہی ہیں۔ وہ دیکھو ان میں سے کچھ لوگوں کے منہ اور کچھ کے ہاں کھلے ہوئے ہیں کیا تم انہیں نہیں دیکھ سکتے؟"

"نہیں میں انہیں نہیں دیکھ سکتا۔ ہم میں سے ہر شخص کچھ عرصہ کے لیے بینا رہتا ہے پھر نابینا ہو جاتا ہے۔ میری بینائی کا عرصہ گزر چکا ہے کیا تم انہیں واقعی دیکھ سکتے ہو؟"

"ہاں میں انہیں واقعی دیکھ سکتا ہوں وہ بھی مجھے دیکھ رہے ہیں۔ انہیں کہو میری طرف نہ دیکھیں میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں ان دونوں میں سے نہیں ہوں۔"

"میں نے تمہیں بتایا کہ میری بینائی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مجھے صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں شکلیں دکھائی نہیں دیتیں۔ مجھے تو تم بھی دکھائی نہیں دیتے تم خاموش کیوں ہو گئے ہو۔ بولو۔ میرے لیے تمہاری موجودگی تمہاری آواز ہے!"

"ہم اتنے عرصے سے جو گفتگو کر رہے ہیں کیا اس سے ہماری موجودگی کا احساس ہوا ہے؟"

"تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس ایسے ہی مجھے لگتا ہے یہ باتیں ہم نہیں کر رہے کوئی اور کر رہا ہے۔ اگر تم اپنی بینائی واپس لا سکتے ہو تو میری طرف دیکھو۔ اگر میں تم سے باتیں کر رہا ہوں تو میرے ہونٹ کیوں نہیں ہلتے؟"

"ہاں یار ہونٹ تو میرے بھی نہیں ہل رہے۔ تو پھر یہ باتیں کون کر رہا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کمرے میں ہمارے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے!"

"ان ہنسنے اور رونے والوں کے علاوہ؟"

"کون سے ہنسنے اور کون سے رونے والے تم کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو؟"

"ہاں یار' یہ میں کن لوگوں کا ذکر کر رہا ہوں یہ شاید ہم اپنے بارے میں کہہ رہے تھے۔ کیا یہ ہم اپنے بارے میں کہہ رہے تھے؟"

"غالباً ہم یہ اپنے بارے میں کہہ رہے تھے؟" لیکن ہم میں سے کون ہنس رہا تھا' اور کون رو رہا تھا۔ یہ تم نہیں تھے' یہ میں تو نہیں تھا؟"

"نہیں ہم دونوں تو ایک عرصے سے نہ ہنسے ہیں اور نہ روئے ہیں' یا شاید یہ کہ دل کھول کر ہنسے ہیں جی بھر کر روئے ہیں' اب تو کچھ یاد نہیں پڑتا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو آؤ اپنے چہرے کھوئی پر ٹانک کر ذرا آرام کریں' بہت تھک گئے ہیں!"

◆◆◆

نافرمانی کی سزا!

فضلو ایک غریب لکڑہارا تھا' سارا دن لکڑیاں کاٹ کاٹ کر مشکل سے ایک آدھ روپیہ کما تا مگر اس کی بیوی نصیبن بہت فضول خرچ' نافرمان' ضدی اور بدزبان تھی اس لیے ان کا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ نصیبن ہمیشہ فضلو سے لڑتی جھگڑتی رہتی' ذرا ذرا سی بات پر اسے ڈانٹتی اور تقریباً ہر وقت شور وغل سے گھر سر پر اٹھائے رکھتی' ہمسائے اس سے تنگ اور محلے والے اس سے بیزار تھے' اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ خاوند کی ہر بات سے انکار کرنا اس کی عادت میں داخل ہو چکا تھا' جب بھی وہ کوئی بات کہتا تو وہ ہمیشہ اس کا الٹ کرتی' اگر وہ روٹی مانگتا تو وہ اسے روٹی نہ دیتی' ہاں اگر وہ کہتا کہ مجھے بھوک نہیں اور میں روٹی نہیں کھاؤں گا' تو وہ اسے زبردستی روٹی کھلاتی لہٰذا اسے جس چیز کی خواہش ہوتی' وہ ہمیشہ اس سے الٹ کہتا تب کہیں جا کر اسے وہ شے ملتی' چنانچہ فضلو اس سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ آخرکار اسے ایک بات سوجھی اور وہ اسے کہنے لگا "دیکھو بیوی ہم باہر کبھی نہیں جائیں گے کیونکہ جو آرام گھر میں ہے' وہ باہر نہیں مل سکتا" یہ سن کر وہ ضدی عورت باہر جانے کے لیے تیار ہو گئی اور وہ دونوں باہر چل پڑے۔ راستے میں ایک تالاب پڑتا تھا۔ فضلو تالاب دیکھ کر کہنے لگا "ہم اس وقت بالکل نہیں نہائیں گے۔" نصیبن ایک دم نہانے کو تیار ہو گئی۔ جب وہ تالاب میں اتری تو فضلو نے آواز دی۔ "بیوی آگے مت جانا' پانی گہرا ہے ڈوب جاؤ گی" مگر نصیبن اپنی ضد پر اڑی رہی' وہ جونہی آگے بڑھی' گہرے پانی میں غوطے کھانے لگی اور ڈوب گئی!

پیارے بچو! بے جا ضد کرنا ٹھیک نہیں۔ اس سے انسان نقصان اٹھاتا ہے۔

دیکھا ہم نے آپ کو کیسی خوب صورت اور سبق آموز کہانی سنائی ہے' چونکہ یہ کہانی بچوں کے لیے ہے لہٰذا ممکن ہے بڑوں کو اس کی سمجھ نہ آئی ہو چنانچہ ہم اس کی تھوڑی سی تشریح کیے دیتے ہیں۔ اس کہانی میں دو کردار ہیں' ایک ظالم ہے' ایک مظلوم ہے۔ ظالم نصیبن ہے' جسے اس کا خاوند گھر کے خرچ کے لیے روزانہ مبلغ ایک روپیہ دیتا تھا۔ جو یہ فضول خرچ عورت الوں تللوں میں اڑا دیتی تھی' یعنی اس ایک روپے میں سے روٹی کپڑے اور لتے کے بعد جو رقم بچتی تھی' وہ اس سے بے حاشا چنگ کرتی تھی' آئس کریم کھاتی تھی اور گھر پر پارٹیاں وغیرہ دیتی تھی' صرف یہی نہیں بلکہ ہر وقت دولت میں کھیلتے رہنے کی وجہ سے اس کا مزاج بھی بگڑ گیا تھا اور وہ انتہائی ضدی بھی بن گئی تھی۔ یہ تو ہوا کہانی کا ظالم کردار..... کہانی کا مظلوم کردار بیچارہ فضلو ہے۔ جو ایک روز اس ظالم عورت کی فضول خرچی اور

نافرمانی کی وجہ سے اسے ہلاک کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ حالانکہ کہانی کے مطابق وہ اسے یہ کہہ کر بھی راہ راست پر لا سکتا تھا کہ "دیکھو بیوی! آئندہ تم کفایت شعاری سے کام نہیں لو گی اور میرا کوئی حکم نہیں مانو گی" مگر یہ مظلوم اسے بہلا پھسلا کر تالاب پر لے جاتا ہے جہاں وہ گہرے پانی میں غوطے کھانے لگتی ہے اور حتیٰ کہ اس میں ڈوب جاتی ہے' جس پر یہ مظلوم سکھ کا سانس لیتا ہے۔ اس فضول خرچ اور نافرمان عورت کی لاش دو تین دنوں بعد تالاب سے برآمد ہوئی ہو گی اور گاؤں کی دوسری فضول خرچ اور نافرمان عورتوں نے اس کے انجام سے عبرت پکڑی ہو گی اور اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ بے جا تشدد کرنا ٹھیک نہیں' اس سے نسوانی تقدس اٹھتا ہے۔

مگر اس کہانی سے کچھ نتیجے اس کے علاوہ بھی نکلتے ہیں مثلاً یہ کہ نافرمانوں کو قتل کرنا ہو تو اس طرح کرو کہ جس طرح کہانی میں بتایا گیا ہے۔ یعنی

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

چنانچہ فضول خرچ کوئی اور ہوتا تو سارے شہر میں اس کے ظلم کی ڈھنڈیا پٹ جاتی' مگر یہ اس کے صبر' شرافت اور پلاننگ کا نتیجہ تھا کہ اس نے راستے کے پتھر کو بھی ہٹا دیا اور اس کی نیک نامی پر کوئی حرف بھی نہیں آیا۔ اس کہانی میں ایک سبق اور بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ اگر کم آمدنی یا زیادہ آمدنی کی وجہ سے انتشار کا شکار ہو جائیں تو نظام زر کے درپے ہو جانے کی بجائے ہمیں ایک دوسرے کے درپے ہونا چاہیے۔ کبھی زبان کے مسئلے پر ایک دوسرے کی گردن کاٹنی چاہیے' کبھی شیعہ' سنی اور دیوبندی' بریلوی کا جھگڑا کھڑا ہونا چاہیے' کبھی نہری پانی کے مسئلے پر ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہونا چاہیے اور کبھی ملک توڑ دینے کی باتیں کرنا چاہئیں۔ کیونکہ نظام زر کا خاتمہ مشکل کام ہے' جب کہ ایک دوسرے کا خاتمہ بہت آسان ہے چنانچہ مسئلے کا فوری حل ہونے کی وجہ سے ہمارے ہاں اس طریق کار کو خاصی مقبولیت بھی حاصل ہے!

تاہم یہ کہانی جو ہمارے اور آپ کے لیے سبق آموز ہے' دنیا کی سپر پاورز کے لیے ایک گائیڈ لائن کی حیثیت بھی رکھتی ہے' بلکہ ہمیں یقین ہے کہ انہوں نے بہت عرصہ پہلے سے یہ کہانی پڑھ رکھی ہے اور اس میں مضمر گائیڈ لائن پر پہلے ہی سے عمل کر رہے ہیں۔ گائیڈ لائن یہ ہے کہ جس نافرمان قوم کو مارنا ہو وہ اسے اس کے ہاتھوں سے مروائے اگرچہ کبھی کبھی مجبوراً کہ افغانستان' چیکو سلوکیہ اور گریناڈا وغیرہ پر خود بھی چڑھ دوڑنا پڑتا ہے' مگر اصولی طور پر ہونا یہی چاہیے کہ جس قوم کو قتل کرنا مقصود ہو پہلے اسے اس کے گھر سے اتنا بیزار کر دو کہ اسے در و دیوار تک سے نفرت ہو جائے اور مکین ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار بھی نہ رہیں' اس کے بعد اسے موت کے

تالاب پر لے جاؤ اور پھر اس کے غوطے کھانے اور ڈوبنے کا منظر پوری دلچسپی سے دیکھو۔ اس عمل کے نتیجے میں عالم کہلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا سپر پاورز نہ صرف یہ کہ خود مہذب کہلاتی ہیں بلکہ دوسری قوموں میں بھی تہذیب کے سرٹیفکیٹ بانٹتی ہیں۔ فضلو چھوٹی عقل کا آدمی تھا، سپر پاورز بڑی عقل کی حامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ فضلو نے چھوٹی سطح پر نافرمان کو اس کی ضد کی سزا دی۔ سپر پاورز بڑی سطح پر نافرمانوں کو ان کی ضد کی اسی طرح سزا دیتی آ رہی ہے۔

پیارے بچو! بے جا ضد کرنا ٹھیک نہیں، اس سے انسان نقصان اٹھاتا ہے۔

◆◆◆

بھائی جان ضیاء الحق کی باتیں!

ممکن ہے "بھائی جان ضیاء الحق" کی "ترکیب" پر ہمارے قارئین چونکیں لیکن ہم جو محسوس کرتے ہیں وہی لکھتے ہیں خیر چھوڑیں بات دراصل یہ ہے کہ بھائی جان ضیاء الحق سے ہمارے اختلافات روز بروز شدید سے شدید تر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہم یہ کام ان اختلافات کے اظہار ہی کے لیے لکھ رہے ہیں۔ ہمارا ان سے بنیادی اختلاف اسلامی نظام کے حوالے سے ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام نہ صرف یہ کہ نافذ نہیں ہوا بلکہ آئندہ کے لیے بھی اس کی راہ میں کانٹے بو دیئے گئے ہیں۔ جبکہ بھائی ضیاء الحق ہمیں سمجھاتے رہتے ہیں کہ ملک کو اسلام کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ اپنے اس موقف کے سلسلے میں ان کے پاس جو دلائل ہیں وہ یہ ہیں کہ شرعی عدالتیں قائم کر دی گئی ہیں' محلے محلے میں صلوٰۃ کمیٹیاں بنائی گئی ہیں' رمضان المبارک میں ٹیلی وژن سے شبینہ کی محفلیں نشر ہوتی ہیں' ٹیلی وژن ہی سے براہ راست حج نشر کیا جاتا ہے۔ سرکاری تقریبات کا آغاز قرآن پاک' نعت رسول سے اور تقریر کا آغاز بسم اللہ سے کیا جاتا ہے۔ حدود آرڈیننس نافذ ہے چنانچہ شریعت کے مطابق گناہ گاروں کو کوڑوں وغیرہ کی سزا دی جاتی ہے۔ نظام زکوٰۃ نافذ کیا جا چکا ہے' غیر سودی نظام بھی متعارف کیا گیا ہے' احترام رمضان کی سختی سے پابندی کروائی جاتی ہے چنانچہ روزہ خوروں کے لیے باقاعدہ سزائیں مقرر ہیں اور یہ سزائیں دی بھی جاتی ہیں۔

نظام اسلام کے قیام کے ضمن میں بھائی ضیاء الحق اس قسم کے اور بھی بہت سے دلائل دیتے رہتے ہیں' مگر ان میں سے کوئی دلیل بھی ہمیں مطمئن نہیں کرتی کیونکہ ان سب دلائل کے جواب میں ہمارے ذہن میں صرف ایک سوال ابھرتا ہے اور وہ یہ کہ ان تمام اقدامات کا نیٹ رزلٹ کیا ہے؟ یعنی کیا لوگوں کو سستا اور فوری انصاف ملنا شروع ہو گیا ہے' کیا کوڑے "اکابر" مجرمین کے آرکاروں کو ہی لگتے ہیں یا آج تک اکابر مجرمین میں سے بھی کسی کی چمڑی ادھیڑی گئی ہے' کیا ملک میں سب گداگر ختم ہو گئے ہیں اور یوں خیرات دینے والوں کو کوئی خیرات لینے والا نہیں ملتا؟ کیا امن و امان کی صورتحال تسلی بخش ہو گئی ہے اور لوگ بغیر کسی خطرے کے بازاروں میں سونا اچھالتے گزرتے ہیں یا وہ اپنے گھروں میں بھی محفوظ نہیں ہیں؟ کیا قتل کی وارداتوں میں کمی ہو گئی ہے یا آئے روز بدترین قسم کے قتل رونما پا رہے ہیں؟ کیا بوڑھوں' بیواؤں' یتیموں' بے روزگاروں کو ماہانہ وظائف کی صورت میں اتنی رقم مل جاتی ہے کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکیں؟ کیا پاکستانی قوم کے تمام بچے یکساں جیسے سکولوں میں تعلیم پاتے ہیں یا اچھی سن کالج اور

کسی درخت کے نیچے تعلیم دینے والے سکول آمنے سامنے قائم ہیں؟ کیا سب بچوں کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں یا ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں کھلونے اور باقیوں کے ہاتھوں میں اوزار پکڑا دیے گئے ہیں؟ کیا غریبوں کو دوا مل جاتی ہے یا وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں؟ یا قوم کی سب بیٹیاں ایک جیسی عزت و تکریم سے بیاہی جاتی ہیں یا ان میں سے بیشتر ملک رنج و سیاہ سے موت کی دعائیں مانگتی رہتی ہیں؟ کیا پاکستان کے ہر شہری کو سر چھپانے کے لیے ایک ایک کمرے کا گھر ہی سہی مل گیا ہے یا ان کے مقدر میں ابھی تک بڑی بڑی حویلیوں کی ڈیوڑھیوں ہی میں پڑے رہنا ہے؟ کیا بڑی چھوٹی کاروں کے ساتھ ساتھ عوام الناس کے لیے بھی ٹرانسپورٹ کی سہولتیں بہتر بنائی گئی ہیں یا انہوں نے ساری عمر بسوں کے ہینڈلوں سے لٹک کر یا ویگن میں سرنگوں ہو کر ہی سفر کرنا ہے؟ کیا رشوت کا قلع قمع ہو گیا ہے یا اس کی شرح میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے کیا نوے فی صد لوگوں کا رزق دس فی صد لوگ تو نہیں کھا رہے؟ اگر ان سوالوں کا جواب منفی ہے اور اگر "نظام اسلام" نافذ ہونے کے بعد بھی صورت حال جوں کی توں ہے بلکہ بگڑتی ہوئی صورت بدترین ہو چکی ہے تو پھر خدا کے لیے ایک بار یہ اعلان کھل کر کر دیں کہ گزشتہ آٹھ برس میں اسلام کا صرف نام مستعمل ہوا ہے یا ایسے اقدامات کیے گئے ہیں جس سے ظالمانہ نظام کی صحت پر رتی بھر فرق نہیں پڑا' تا کہ اس کے بعد اگر کوئی سیاسی پارٹی "اسلامی فلاحی مملکت" کا پروگرام لے کر قوم کے سامنے آئے تو عوام اسے ایک تمسخر کے ساتھ رد نہ کر دیں کہ جناب ہم نظام اسلامی آزما چکے ہیں اس میں ہمارے دکھوں اور ہمارے مسائل کا کوئی حل نہیں لہٰذا اب یہ دھوکہ کسی اور کو دیں!

اوپر کی سطور میں ہم نے خاصی کڑوی باتیں کی ہیں مگر بھائی جان ضیاء الحق میں خوبی یہ ہے کہ وہ کڑوی سے کڑوی بات بھی پوری خوشدلی سے سنتے ہیں اور قطعاً ناراض نہیں ہوتے بلکہ اس دوران ان کے چہرے کی مسکراہٹ میں بھی کوئی کمی نہیں آتی چنانچہ کبھی کبھی یہ گمان گزرتا ہے کہ جیسے وہ نہ صرف یہ کہ مخاطب کے ساتھ اتفاق کر رہے ہیں بلکہ وہ اصلاح احوال کے لیے اپنا کردار بھی بھرپور طور پر انجام دیں گے مگر افسوس حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا' چنانچہ ہم نے بھائی جان ضیاء الحق سے مندرجہ بالا موضوع پر بیسیوں نشستیں' ٹیلی فون پر گفتگوئیں اور بہت سی خط و کتابت کر کے دیکھ لیا ہے اور ہم مایوس ہو کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان سے اس موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ بڑے بھائی کا رشتہ ایسا ہے کہ ایسے مواقع پر چھوٹے بھائی کو بالآخر چپ سادھنا پڑتی ہے سو وہ ایک عرصے سے ہم نے سادھ رکھی ہے۔

ہم نے بھائی جان ضیاء الحق کے حوالے سے اتنی ساری باتیں اپنے قارئین کو بتائیں مگر بھائی جان کا پورا تعارف تو کرایا ہی نہیں' بھائی جان ضیاء الحق میرے اکلوتے بھائی ہیں عمر میں مجھ سے دس سال بڑے ہیں' حیدر آباد سندھ میں مقیم ہیں اور صدر ضیاء الحق کے

زبردست حامیوں میں سے ہیں انہوں نے "ضیائے حق" کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی ہے۔جس میں شعراء کی طرف سے صدر ضیاء الحق کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے' وہ ہمیں جب بھی ملتے ہیں' ٹیلی فون کرتے ہیں یا خط لکھتے ہیں' صدر ضیاء الحق کو درمیان میں ضرور لے آتے ہیں اور نفاذ اسلام کے حوالے سے ان کی اتنی تعریف کرتے ہیں کہ ہمیں مجبوراً اپنا نقطہ نظر بیان کرنا پڑتا ہے' مگر اب ایک عرصے سے ہم ان کی باتیں سن کر خاموش رہتے ہیں کہ جانتے ہیں بولنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ہم "برادر خورد" ہیں وہی "برادر خورد" جس کے بارے میں فارسی والوں نے "سگ باش برادر خورد مباش" والا محاورہ یا مقولہ ایجاد کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم بیسوں کی زبان بندی کر دی ہے۔لیکن اگر ہم اصلاح احوال چاہتے ہیں تو ہمیں من حیث القوم کوشش کرنا ہوگی کہ آئندہ ہمارے درمیان چھوٹے بھائی پیدا ہونے بند ہو جائیں!

◆◆◆

''اردوئے معلیٰ'' یا ''اردوئے محلہ؟''

ہمیں ایک خط کا بے چینی سے انتظار تھا اور یہ خط ہمیں گزشتہ روز موصول ہو گیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''مکرمی! سلام مسنون! کل کے کالم میں آپ نے درجن بار لفظ ''قصائی'' کو ''قسائی'' لکھا ہے۔ تجل کو ''محل ہوتے'' لکھا ہے شرم آنا چاہیے نہ ہوئے غالب زندہ ورنہ آپ کی کھال کھنچوا دیتے ہم کاتب کی غلطی نہیں سمجھتے۔ خدا را الفاظ کے ہجے تو درست لکھا کرو، کیوں اردو کی مٹی پلید کرتے ہو۔ گر یہ بھنڈ اور ہلکو پن تھا تو کیا اس کے لئے پنجابی زبان کافی نہیں؟ وقار انبالوی جیسے ''علامہ'' کے کلام ''سر راہے'' میں بھی املا کی غلطیاں کبھی کبھی موجود ہوتی ہیں۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ کاتب حضرات غلطیاں کرتے ہیں تو پروف ریڈر کس مرض کی دوا ہیں! معلوم ہوتا ہے کہ کاتبوں کی طرح وہ بھی جاہل ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اردو لکھنے کی مشق کریں اور جس طرح اردو کی کھال کھینچ رہے ہیں یہ سلسلہ فوری طور پر بند کریں ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ ہم آپ کی کھال کھینچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ پھر گلہ شکوہ نہ کیجئے گا۔

والسلام! ڈاکٹر محمود عالم سرگودھا''

مکتوب نگار نے ہمارے جس کالم کا ذکر کیا ہے وہ ''افسوس کہ دنیا سے سفر کر گیا بکرا'' کے عنوان سے گزشتہ ہفتے شائع ہوا تھا اور ہمیں اس قسم کے کسی خط کا بہت بے چینی سے انتظار اس لئے تھا کہ بہت عرصے سے ہمارا زبان کے سلسلے میں اپنی علمیت جھاڑنے کو جی چاہ رہا تھا۔ چنانچہ قصائی کو ''قسائی'' لکھنے کے بعد ہم بڑی شدت سے اس امر کے منتظر تھے کہ کوئی بد قسمت اس سلسلے ہمیں کوئی خط لکھے اور پھر اس کے نتیجے میں ہم یہ ثابت کریں کہ زبان صرف بابا وقار انبالوی ہی کو نہیں ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کو بھی آتی ہے۔ مگر جو خط ہمیں وصول ہوا ہے اس میں تو مکتوب نگار ہمارے بابے کی زبان دانی سے بھی منکر ہو گیا ہے۔ مگر یہ تو بابا جی کے گھر کا معاملہ ہے وہ اس مکتوب نگار سے خود ''نپٹ'' (مکتوب نگار یہاں نٹ یا ''نپٹ'' پڑھیں) لیں گے۔ تاہم مکتوب نگار ڈاکٹر محمود عالم مقیم سرگودھا سے دست گزارش ہے کہ قصائی ص سے نہیں س سے ہوتا ہے اور ثبوت کے لئے خاں صاحب مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ جلد سوم صفحات 383'385 ملاحظہ فرمائیں۔ جہاں درج ہے کہ

چونکہ یہ لفظ قص سے بگاڑ کر قسائی اردو زبان میں بنا لیا گیا ہے اور عربی الاصل نہیں رہا اس وجہ سے سین سعفص سے لکھنا واجب

ہے!"

ہمارا خیال ہے کہ اس حوالے سے قارئین پر ہماری علمیت کی خاصی دھاک بیٹھی ہوگی اور خود ڈاکٹر عالم محمود صاحب پر بھی راز آشکارا ہو چکا ہوگا کہ نہ ہم جاہل نہ ہمارے کاتب اور نہ ہمارے پروف ریڈر! باقی رہا یہ مسئلہ کہ ہم اردو لکھتے ہوئے پنجابی الفاظ استعمال کر جاتے ہیں تو بات یہ ہے کہ پنجابی ہماری ہی نہیں اردو کی بھی "مادری زبان" ہے ثبوت کے لیے اس موضوع پر حافظ محمود شیرانی کی گراں قدر تحقیق کا مطالعہ کریں۔ لہٰذا پنجابی زبان یعنی "والدہ صاحبہ" گر بھانڈ اور بھکو پن ہی کے لیے موزوں ہے تو اس صورت میں اس کی "صاحبزادی" یعنی اردو صاحبہ پر بھی حرف آتا ہے سو اردو میں پنجابی کے الفاظ استعمال ہونے پر ستے پر ہم نہ ہوں کہ یہ ماں بیٹی کا معاملہ ہے اور اس میں نامحرموں کو دخل نہیں دینا چاہیے۔

اب کیوں نہ ہم یہ بھانڈا پھوڑ دیں کہ لفظ "قصائی" دراصل ہم ص ہی سے لکھنا چاہتے تھے لیکن س سے ہم نے دانستہ لکھا تھا کہ معلوم ہو کہ جو لفظ عوام الناس کی زبان پر چڑھ جائے اسے اگر اتارنے کی کوشش کی جائے تو کس قدر کھلبلی مچ جاتی ہے۔ یہ بات ہم نے اس لیے بھی کہی ہے کہ اس موضوع پر صرف ڈاکٹر محمود عالم صاحب ہی کا خط ہمیں موصول نہیں ہوا بلکہ متذکرہ کالم چھپنے کے بعد بیسیوں لوگوں نے ہمیں رستے میں روکا اور ٹوکا جن کی زبان دانی کے ہم دل سے قائل ہیں اور یہ سب دوست شکر کریں کہ ہم نے بھی طوطے کو توتا اور طیارے کو تیارہ نہیں لکھا کہ ڈکشنری میں لفظوں کے لیے جو ناپ تول کا اعشاری نظام موجود ہے یہ بھی اس کے عین مطابق ہیں۔ دراصل ہماری خواہش ہے کہ اگر ہم نہیں تو ہمارے لفظ تو آزاد فضا میں سانس لیں سو ہمارے نزدیک لفظ وہی "صحیح" ہے جو جس طرح استعمال ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اگر ہم بھی ڈکشنری کے مطابق چلے تو لفظ "جاوید" کے "و" کے نیچے زیر ڈال کر ادا کرنا پڑے گا اور آپ کسی "جاوید" کو ذرا "جاوِد" کہہ کر تو دیکھیں!

اور آخر میں ہمیں ایک بات ابن انشاء کی اور ایک خالد احمد کی یاد آ رہی ہے۔ ابن انشاء نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پنجابی جتنا دھیان اپنی صحت کا رکھتے ہیں کاش اتنا زبان کی صحت کا بھی رکھیں اور اہل زبان جتنا دھیان زبان کی صحت کا رکھتے ہیں کاش اتنا اپنی صحت کا بھی رکھیں۔ اور خالد احمد نے لکھا ہے کہ ہم لوگ ہر وقت لفظوں کے ازار بند ٹٹول ٹٹول کر ان کی "جنس" دریافت کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ خیر خالد صاحب کو چھوڑیں وہ تو بھکو آدمی ہے۔ اس سلسلے میں خود ہمارا ایک فرمودہ بھی (ماشاء اللہ) خاصی اہمیت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اردو وہی زندہ رہے گی جو پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے گلی کوچوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے چنانچہ جس اردو نے پھلنا پھولنا اور نشوونما پانا ہے وہ "اردوئے معلی" نہیں "اردوئے محلہ" ہے۔ اب یہ ہم پر ہے کہ جونسی اردو چاہیں اپنے لئے انتخاب کریں!

روزے "حساب جب میرا......!

گزشتہ روز ہماری ملاقات اپنے ایک "عاشق وفا ہز" دوست سے ہوئی "تان علیہ ز" ہونے کی وجہ سے ہم نے ان کے متعلق کبھی اس حسن ظن سے کام نہیں لیا کہ وہ روزہ بھی رکھتے ہوں گے' مگر اس روز ہم نے انہیں دیکھا کہ رنگ فق ہے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں زبان سوکھ کر کانٹا ہو رہی ہے چنانچہ بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کرتے ہیں اور نڈھال اس قدر ہیں کہ بات نہیں ہو رہی۔ چنانچہ ہم نے ان کی یہ حالت دیکھی تو کہا کہ برادر تمہاری حالت تو غیر ہو رہی ہے اگر تم میں روزے کی سکت نہ تھی اور اس میں تمہاری جان کو خطرہ تھا تو اللہ تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے تو نے اپنی جان کو خطرے میں ضرور ڈالنا تھا۔ یہ سن کر مری ہوئی آواز میں بولے تم سے کس نے کہا کہ میرا روزہ ہے۔ ہم نے چونک کر کہا' اگر روزہ نہیں تو پھر مرے کیوں جا رہے ہو؟ بولے "صبح گھر سے نکلا تھا اب شام ہونے کو آئی ہے مگر پانی کی ایک بوند حلق سے نہیں اتری' کافی ہاؤس سمیت شہر کے سارے ہوٹل بند ہیں' دفتروں میں بہت سختی ہے' چنانچہ نہ کھانے کو کچھ ملا ہے اور نہ پینے کو' حتیٰ کہ صبح سے سگریٹ تک نہیں پی سکا۔ پچھلے سال مجھے رمضان کے مہینے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی کیونکہ میرا ایک دوست روزہ خوروں کو پکڑنے پر مامور تھا' روزہ خوروں سے جو مال برآمد ہوتا وہ ہم دونوں دوست محلے کے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر کھا لیتے' اب میں گزشتہ دو دنوں سے اس دوست کی طرف جا رہا ہوں مگر اس کے اہلکاروں سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب چھاپے مارنے گئے ہوئے ہیں' بس دعا کرو خیر و برکت کا یہ مہینہ خیر و عافیت سے گزر جائے۔"

مگر یہ گزشتہ روز کی بات ہے' یہی دوست آج دوپہر کو ملے تو بہت تر و تازہ تھے اور خاصے خوش و خرم نظر آ رہے تھے' ہم نے پوچھا کیا آج روزہ خوروں کو پکڑنے پر مامور دوست سے ملاقات ہو گئی؟ بولے "ان سے ملنے کی اب ضرورت نہیں رہی" ہم نے پوچھا "وہ کیسے؟" بولے "ریلوے سٹیشن چلا گیا تھا' وہاں پینتیس پیسے میں شاہدرہ کے لیے ٹکٹ خریدا' شاہدرہ کس کم بخت نے جانا تھا' میں نے پلیٹ فارم پر بطور مسافر ڈٹ کر کھانا کھایا' خربوزے کھائے' چائے پی' سگریٹ پیا اور اب سیدھا تمہارے پاس آ رہا ہوں" ہم نے پوچھا "اب کیا پروگرام ہے؟" بولے "پیٹ تو بھر گیا ہے' نیت نہیں بھری' اب قیمے والے نان کھانے کو جی چاہ رہا ہے" ہم نے کہا "تو پھر یہ خیال دل سے نکال دو' رمضان المبارک میں اتنی عیاشی بہرحال نہیں ہو سکتی" ہنس کر بولے کیسی بچوں والی باتیں کر رہے ہو تمہارے دفتر سے چند قدم کے فاصلے پر گرما گرم قیمے والے نان لگ رہے ہیں' یقین نہیں آتا تو چل کر دیکھ لو" ہم نے کہا "ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے' جسے ضرورت ہے وہ جائے" کہنے لگے یار چلا تو جاؤں مگر ذرا رنگ سا معاملہ ہے۔ ہم نے پوچھا "وہ کیسے؟" بولے

''نان وائی دکان سے سو سو گز کے فاصلے پر دکان کے مالک کے کارندے اچانک چھاپے کی اطلاع دینے کے لیے کھڑے ہیں چنانچہ وہاں جائیں تو ایسے لگتا ہے کہ یہاں قیمے والے نان نہیں ہیروئن فروخت ہو رہی ہے' خیر اس وقت تو ویسے بھی پیٹ بھرا ہوا ہے' کل دیکھی جائے گی!''

اب اگر ان بدنصیبوں کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے جو روزے نہیں رکھتے مگر روزہ داروں سے زیادہ خود کو تکلیف محسوس کرتے ہیں' تو اس ضمن میں ایک روزہ دار بی بی کی بھی سنیے' اس نیک خاتون کا کہنا ہے کہ روزہ داروں کی سہولت کے لیے ضروری ہے کہ روزہ خوروں کے ہوٹل کھلے رکھیں جائیں۔ ہم نے حیران ہو کر اس بی بی کو دیکھا اور کہا اے نیک خاتون یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ بولیں ٹھیک کہہ رہی ہوں' یہ جو مرد روزے نہیں رکھتے' دوپہر کو گھر آ کر اپنی روزہ دار بیبیوں کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں' اور انہیں روزے کی حالت میں کھانا پکانے پر مجبور کرتے ہیں لہٰذا روزہ داروں کی سہولت کے لیے ضروری ہے کہ ان مردوں کے لیے ہوٹل کھلے رکھے جائیں تاکہ یہ ہماری جان کو نہ آئیں!

خیر' یہ تو ان روزہ دار بیبیوں کا ذکر ہے جن کے شوہر یا جن کی اولاد روزہ رکھنے کی سعادت سے محروم ہے اور یوں روزہ نہ رکھنے اور روزہ داروں کو تنگ کرنے کے دوہرے عذاب سمیٹتی ہے۔ مگر جن بیبیوں کے شوہر روزہ رکھتے ہیں' وہ ان دنوں اتنی خوش ہیں کہ انہیں روزے کی صعوبتیں بھی محسوس نہیں ہوتیں' یہ بیبیاں خوش ہیں تو اس بات پر کہ ان کے شوہر نامدار آج کل سہ پہر ہی کو واپس گھر لوٹ آتے ہیں اور پھر ساری رات گھر پر ہی گزارتے ہیں انہیں حیرت اس امر پر ہے کہ اس مہینے کے دوران وہ سہ پہر کی میٹنگ کا بہانہ کرتے ہیں' نہ شام کی کسی دفتری مصروفیت کا حوالہ دیتے ہیں اور نہ رات کی کسی پارٹی میں ان کی شرکت ضروری ہوتی ہے۔ تاہم شوہر کے سارا دن گھر رہنے کی خوشی ضروری نہیں کہ ہر بی بی کو ہو' ممکن ہے کہ شوہر اچھے بھی ہوں جو جتنی دیر باہر رہتے ہوں' اتنی دیر گھر والی خود کو سکھی محسوس کرتی ہو' ایک ایسے شوہر کو تو ذاتی طور پر ہم بھی جانتے ہیں' موصوف روزہ رکھ کر گھر میں کیا داخل ہوتے ہیں' زلزلہ گھر کے در و دیوار میں داخل ہوتا ہے۔ آدم بو آدم بو کرتے پھرتے ہیں برتن توڑتے ہیں' پل کے نیچے لیٹ کر لمبے لمبے سانس لیتے رہتے ہیں' ہر آنے جانے والے کو اپنی خشک زبان نکال کر دکھاتے ہیں اور اسے زبان نکال کر دکھانے کو کہتے ہیں' بچہ قریب آئے تو اسے مارنے کو دوڑتے ہیں' بڑوں کو آنکھیں دکھاتے ہیں اور بیوی کو فرطِ غیظ و غضب میں کاغذ لکھنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ سو ہمیں تو خدشہ ہے کہ قیامت والے دن جہاں کچھ روزہ نہ رکھنے کے گناہ میں پکڑے جائیں گے' وہاں یہ صاحب ''روزے'' حساب روزے رکھنے کی وجہ سے دھر لیے جائیں گے۔

◆◆◆

چوروں کی مدح میں ایک کالم!

ہم کالم کے آغاز ہی میں اپنے ڈاکو بھائیوں سے معذرت خواہ ہیں اور ان پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان سطور سے مقصود ان کی دل آزاری یا خدانخواستہ ان کی نیک شہرت کو نقصان پہنچانا نہیں' بلکہ ماضی پرست ہونے کی وجہ سے پرانی یادوں کو تازہ کرنا اور بعض کلاسیکی روایات کی گم شدگی پر اظہار افسوس کرنا ہے۔ دراصل ایک عرصے سے روزانہ صبح اخبار ہاتھ میں تھامتے ہی دو تین ڈکیتوں کی خبریں نظر سے گزرتی ہیں مثلاً یہ کہ چلتی فلائنگ کوچ میں مسافروں کو پستول دکھا کر لوٹ لینا' دن دہاڑے کسی گھر میں داخل ہونا اور اہل خانہ کو ڈرا دھمکا کر زیور کپڑے لے جانا' یہ اور اسی طرح کے دوسرے واقعات اس لحاظ سے تو خوش آئند ہیں کہ پوری طرح سے سرگرم عمل ہے اور داد شجاعت دینے میں مشغول ہے' مگر جس دکھ کے اظہار کے لیے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں' وہ چوروں کے بالکل ناپید ہونے کے حوالے سے ہے' ڈاکو اپنی سرگرمیاں شوق سے جاری رکھیں' حکومت کی طرح ہمیں بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن معاشرے سے چوروں کا یکایک اور مکمل طور پر ناپید ہو جانا اور ان کی جگہ ڈاکوؤں کا لے لینا بہت افسوس ناک بات ہے۔ یہ موضوع' اگرچہ انتظار حسین کا ہے' اور ہمیں امید تھی کہ وہ اس پرانے انسٹی ٹیوشن کے زوال کا نوحہ پڑھیں گے لیکن جس طرح دوسروں کا کام بسا اوقات انہیں کرنا پڑتا ہے' اسی طرح ان کا یہ کام ہمیں کرنا پڑ رہا ہے' تاہم ایک دفعہ پھر ہم ڈاکوؤں سے التماس کریں گے کہ وہ ہمارے اس کالم کو "پرسنل" نہ لیں کیونکہ ہمارا یہ کام محض اصولی نوعیت کا ہے اور اگر انہیں ہمارے کسی نکتے سے اختلاف ہو تو اپنا نقطہ نظر لکھ بھیجیں جو ہم پوری دیانت داری سے شائع کر دیں گے' اپنے موقف کی وضاحت کے لیے انہیں ہمارے غریب خانے پر آنے کی ضرورت نہیں کہ جہاں ہم رہتے ہیں' ایک تو وہ جگہ شہر سے کافی دور ہے' اس کی سڑکیں بھی ٹوٹی پھوٹی ہیں اور جس مکان میں ہم رہتے ہیں' وہ قرضے سے بنا ہے' لہٰذا انہیں خواہ مخواہ زحمت ہوگی!

دراصل بات یہ ہے کہ بھلے وقتوں میں ڈاکوؤں کے علاوہ چور بھی ہوا کرتے تھے مگر ہم نے ان شریف النفس لوگوں کی قدر نہیں کی اور یوں ناقدری زمانہ سے یہ اہل فن آہستہ آہستہ ناپید ہوتے چلے گئے۔ یہ لوگ اہل فن ہی کی نہیں وضع دار بھی تھے' دن کے وقت شرفاء کی بستیوں کا رخ نہیں کرتے تھے' جب آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہوتی تو یہ اپنی کمین گاہوں سے نکلتے اور رفع شر کے لیے کوئی چاقو وغیرہ نیفے میں اڑس لیتے تاہم ان کی رحم دلی اور خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ گھروں کے باہر بندھے ہوئے کتوں کے لیے

گوشت وغیرہ ساتھ لے کر آتے۔ نیز جس گھر میں بھی داخل ہوتے اس امر کا خاص خیال رکھتے کہ اہل خانہ کی نیند میں کوئی خلل نہ پڑے چنانچہ دبے پاؤں چور دروازے سے گھر میں داخل ہوتے' چوری کے لیے جس کمرے میں داخل ہوتے اس کی بتی تک نہ جلاتے کہ دوسروں کی پرائیویسی مجروح نہ ہو' گھر کے مالک کو جگا کر اس سے سیف وغیرہ کی چابیاں تک طلب نہ کرتے کہ بے چارہ سارے دن کا تھکا ماندہ آرام کر رہا ہے' چنانچہ اندھیرے میں خود ٹامک ٹوئیاں مارتے' اگر کچھ ہاتھ لگ جاتا تو ساتھ لے جاتے' بصورت دیگر صبر و شکر کر کے لوٹ جاتے' یہ وضع دار لوگ جنہیں ہم چور کہتے تھے' اتنے شریف النفس تھے کہ اگر تمام احتیاط کے باوجود اہل خانہ کی آنکھ کھل جاتی تو اپنے اس فعل پر اس قدر نادم ہوتے کہ اہل خانہ سے آنکھیں چراتے پھرتے اور کوشش کرتے کہ جلد سے جلد اس مکان سے نکل جائیں جس کے مکینوں کی نیند میں ان کی وجہ سے خلل پڑا ہے' بعض نازک مزاج قسم کے اہل خانہ اگر ان سے تعرض کرنے کی کوشش کرتے تو بھی ان شریف النفس لوگوں کی کوشش یہی ہوتی کہ بغیر کسی کو زک پہنچائے وہاں سے نکل جائیں' تاہم دوسرے فریق کی ناسمجھی کی وجہ سے کبھی کبھار کوئی ناخوش گوار سی صورت حال بھی پیدا ہو جاتی' جس کی ذمہ داری ان وضع دار لوگوں پر بہرحال عائد نہیں ہوتی تھی!

اور اب صورت حال یہ ہے کہ معاشرے سے یہ بھلا مانس طبقہ رفتہ رفتہ ناپید ہو گیا ہے اور اس کی جگہ ڈاکوؤں نے لے لی ہے۔ یہ لوگ کسی بھی سہانی شام کو کسی بھی گھر میں داخل ہوتے ہیں' ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف ہوتی ہیں اور وہ اہل خانہ کو ہینڈز اپ کر دیتے ہیں اور انہیں اتنا خوف زدہ کر دیتے ہیں کہ ان کا دھیان نیلی وژن پر دکھائے جانے والے ڈرامے سے ہٹ جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے دوست سرور سکھیرا کے ہاں شام سات بجے جب ڈاکو آئے' وہ اپنے بچوں اور سسری گھر سے آئے مہمانوں کے ساتھ وی سی آر پر فلم ''نصیب اپنا اپنا'' دیکھ رہے تھے' جو وہ اس کے بعد نہ دیکھ سکے اور یوں انہیں خواہ مخواہ فلم کا پندرہ روپے کرایہ پڑ گیا۔ اسی طرح غالباً شادمان کالونی کے ایک گھر میں خواتین ایک شادی میں شرکت کے لئے زیوارت پہنے گھر سے نکلنے ہی کو تھیں کہ ڈاکو گھر میں داخل ہو گئے اور ان کے زیورات اتار لئے' چنانچہ وہ بے چاری شادی کی تقریب میں شرکت نہ کر سکیں اور یوں دولہا دلہن بھی اس سلامی کی رقم سے خواہ مخواہ محروم ہو گئے جو انہیں ان خواتین سے موصول ہونا تھی! تاہم ان چھوٹے موٹے نقصانات سے قطع نظر ڈاکو ہمارے معاشرے کے سفید رکن ہیں اور معاشرے میں ان کا بہت اعلیٰ مقام ہے' ہم نے ان ڈاکوؤں کی عزت و تکریم کے جو مناظر دیکھے ہیں' اس سے کئی دفعہ دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم لٹنے والے میں شامل ہونے کی بجائے لوٹنے والے طبقے میں شامل کیوں نہ ہو گئے۔ بہرحال یہ باتیں تو برسبیل تذکرہ درمیان میں آ گئیں' ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ڈاکو ہماری سرآنکھوں پر' مگر چوروں کا سرے سے

ناپید ہو جانا ہم جیسے روایت پسند شخص کو پسند نہیں کہ اپنی چھوٹی موٹی شخصی خامیوں کے باوجود یہ لوگ بہر حال بڑے شریف النفس، بھلے مانس اور وضع دار تھے!

پس نوشت یہ کالم یہاں ختم کر چکے تھے کہ ہمارے ایک دوست آ گئے اور انہوں نے ایک نظر کالم پر ڈال کر ناک بھوں چڑھایا اور کہا کہ یہ تم کن "چیپ" قسم کے مسائل پر لکھتے رہتے ہو؟ اگر لکھنا ہے تو موجودہ حکومت کے خلاف لکھو کہ ساری برائیوں کی ذمہ داری بہرحال حکومت پر عائد ہوتی ہے!" مگر ہم نے صاف انکار کر دیا اور کہا "موجودہ حکومت کے خلاف لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!" یہ سن کر دوست نے خشمگیں نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور کہا "تو گویا تم بھی بک گئے ہو!" ہم نے ضبط سے کام لیتے ہوئے جواب دیا "تم جو چاہو کہو، مگر موجودہ حکومت کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ یہ ایک شریف النفس، بھلی مانس اور وضع دار حکومت ہے چنانچہ ہم اس کے خلاف نہیں لکھیں گے، کیونکہ عاقل کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کے نتیجے میں اسے بعد میں پچھتانا پڑے۔" خدا کرے ہمارے دوست کو یہ بات سمجھ میں آ گئی ہو!

ڈیٹ آف برتھ!

بظاہر یہ لگتا ہے جیسے ڈیٹ آف برتھ کچھ زیادہ اہم چیز نہیں' لیکن اگر ہم سے پوچھیں تو اس سے انسان کی دنیا کیں بدل جاتی ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ مثلاً' ایک ہم ہی کو لیجئے' مختلف علوم وفنون کے ضمن میں کیسے کیسے نادر اور اچھوتے خیالات ہمارے ذہن میں آتے رہتے ہیں اور جب اس قسم کا کوئی خیال ہمارے ذہن میں در آتا ہے تو ہمارا اپنا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور ہم سوچتے ہیں کہ اس علم یا فن میں ہمارا شمار ایک نئے دبستان فکر کے بانی کے طور پر ہوگا' لیکن بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جب ہم اپنے ان زریں خیالات کا اظہار اپنے کسی دوست کے سامنے کرتے ہیں تو وہ ہم سے پہلے پیدا ہونے والے کسی مفکر کا نام لے لیتا ہے کہ یہ خیال تو اس نے پیش کیا تھا' جس سے ہم دکھی پریم نگری قسم کی چیز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً گزشتہ روز اپنے دوستوں کے ساتھ دھوپ سینکتے ہوئے ایک فلسفیانہ سا خیال ہمارے ذہن میں آیا کہ یہ جو دنیا کی مختلف قومیں "پدرم سلطان بود" کا راگ الاپتی رہتی ہیں تو یہ بہت بے جا قسم کا تفاخر ہے کیونکہ جس طرح یونیورسٹیوں میں روٹین سے "ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ" کا تقرر ہوتا رہتا ہے' اسی طرح قدرت بھی باری روٹین قوموں کو ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بناتی ہے چنانچہ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم باری باری پوری دنیا پر حکمرانی کر چکی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہماری یہ خیال افروز گفتگو سن کر دوست چونکیں گے اور ہمارے ان خیالات کو علم تاریخ میں انقلاب آفریں قرار دیں گے۔ مگر بہت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست نے ہماری زبان سے یہ نئی تھیوری سن کر بھی داد دینے کے بجائے صرف یہ کہا کہ ابن خلدون بھی اس قسم کی بات کہہ چکے ہیں' حالانکہ ہم نے ابن خلدون کو پڑھنا تو کجا ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اور تادم تحریر پتہ نہیں کہ یہ بزرگ کون ہیں یا تھے اور کیا بیچتے تھے! اسی طرح ایک روز ہم نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ یار یہ جو ہم حافظے کی کمزوری کا رونا روتے رہتے ہیں۔ خیال ہے کہ حافظے کی کمزوری نام کی کسی چیز کا وجود نہیں' بلکہ ہمارا لاشعور جن چیزوں کو اہمیت نہیں دیتا' وہ انہیں بھلا دیتا ہے' یہی وجہ ہے کہ جن چیزوں سے ہماری وابستگی شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر موجود ہے ہم انہیں کبھی نہیں بھولتے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی جو ہم نے کہی تھی بلکہ اگر آپ جیسے منصف مزاج لوگ اس بات پر غور کریں تو اسے علم نفسیات میں ایک اضافہ قرار دیں گے' مگر ہمارے مخاطب دوست نے یہ بات سن کر سگریٹ کا ایک کش لگایا اور کہا فرائڈ یہ بات بہت پہلے کر چکا ہے۔ اب یہ فراڈ تو ہم نے سن رکھا ہے کیونکہ باقی قوم کی طرح

ہمارے ساتھ بھی عرصہ دراز سے فراڈ ہو رہا ہے فرائیڈ کا نام سن کر ہمارا ماتھا ٹھنکا لیکن اب کیا اعتراف کرتے جائیں' ہم چونکہ مختلف مسائل پر اسی طرح غور و فکر کرتے رہتے ہیں' چنانچہ ایک دن ہم نے جمہوریت کے مسئلے پر بھی غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جمہوریت کے ذریعے جمہوری حکومت کبھی بھی وجود میں نہیں آ سکتی بلکہ اس نظام میں ہوتا صرف یہ ہے کہ ناجائز طریقے سے ملکی وسائل پر قابض طبقہ جائز طریقے سے حکومت پر قابض ہو جاتا ہے۔ اصلی جمہوریت صرف اسی طرح وجود میں آ سکتی ہے کہ انتخابی حلقے آمدنی کے لحاظ سے قائم کیے جائیں' مثلاً اگر پاکستان کی اسی فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے اور وہ معمولی کاشتکاروں یا مزارعین پر مشتمل ہے تو اسمبلیوں میں ان کی نشستوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے ہو اور ان کے حلقوں سے کسی جاگیردار کو انتخاب لڑنے کی اجازت نہ ہو اسی طرح جاگیرداروں کے لیے دو ایک علیحدہ نشستیں ان کی آبادی کے تناسب سے رکھی جائیں ورنہ وہ بھی ایوان بالا میں اونچے لوگ جو ٹھہرے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے مزدوروں کی نمائندگی کا حق کسی صنعت کار کو نہیں ملنا چاہیے' ان کے لیے علیحدہ نشست ہو یوان بالا میں اس نشست کے ووٹر بھی صنعت کار ہی ہوں' گویا اصلی جمہوریت کے لیے طبقاتی بنیادوں پر انتخاب کرنا ضروری ہیں' ہمارا دوست ہماری بات سن کر ہنسا اور بولا "جسے تم نے طبقاتی بنیادوں پر انتخابات کا نام دیا ہے' یہ طبقاتی انتخابات میں اور کارل مارکس اس قسم کی باتیں بہت پہلے کہہ چکا ہے!"

ہم جگہ کی قلت کی وجہ سے زیادہ مثالیں نہیں دے سکے ورنہ صورت حال تو یہ ہے کہ دن میں کئی دفعہ "پنبہ کجا کجا نہم" والا مصرعہ یاد آتا ہے' تاہم درج بالا واقعات سے آپ ایک حرف سا اندازہ تو ضرور لگا سکتے ہیں کہ ہم جیسے اوریجنل مفکروں کو زمانے والے کن کن طریقوں سے ٹارچر کرتے ہیں اور زندہ لوگوں کے افکار اس طرح مردہ لوگوں کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست انور سدید بھی ہماری طرح دکھی ہیں' ایک دفعہ انہوں نے ایک نہایت خوب صورت لمرک لاہور کے ایک انگریزی اخبار میں شاعت کے لیے ارسال کی لیکن جب وہ لمرک شائع ہوئی تو ہمراہ نے اس کے کہ انہیں داد ملتی سارے ملک میں شور مچ گیا کہ یہ تو انگریزی کی مشہور ترین لمرک ہے' اتنی مشہور کہ اس کی حیثیت ضرب المثل کی ہو چکی ہے' برادرم انور سدید اس الزام تراشی سے اتنے افسردہ ہوئے کہ انہوں نے "بکدہ" کے لیے انگریزی شاعری پر تین حرف بھیجے چنانچہ اب جو کچھ اور جیسا بھی لکھتا ہوں اردو میں لکھتے ہیں۔ تاہم ہمارا دکھ بہرحال سب سے زیادہ ہے کہ ہم دن میں کئی دفعہ نئی نئی باتیں سوچتے ہیں اور اتنی ہی دفعہ ہمیں یہ سننا پڑتا ہے کہ یہ بات تو تم سے پہلے فلاں فلاں فلاسفر یا مفکر کہہ چکے ہیں۔ گویا ہماری ڈیٹ آف برتھ ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہے' چنانچہ ہم نے کئی دفعہ سوچا کہ بورڈ میں کسی سے مل کر اپنی ڈیٹ آف برتھ یکم فروری 1943ء کی بجائے یکم فروری 1743ء کر دیں تاکہ یہ قضیہ ہی ختم ہو مگر پھر یہ

سوچ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ اس صورت میں جاسدین 1743ء سے پہلے کے مفکرین ہمارے مد مقابل لا کھڑا کریں۔ لہٰذا، بہتر یہی ہے کہ ایسی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی جائیں جیسا کہ ہمارے ڈاکٹر وزیر آغا کرتے ہیں۔ تاہم ہماری اس ذاتی وسیع النظری اور عالی حوصلگی کے باوجود یہ بات تو واضح ہے کہ ہماری قوم ذہنی طور پر ابھی کس قدر پسماندہ ہے اور وہ ہم ایسے سوچ بچار کرنے والوں کے خیالات پر داد دینے کے بجائے گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھتی ہے اور ابن خلدون، فرائڈ یا کارل مارکس جیسے لوگوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہے، محض اس لئے کہ وہ اتفاق سے اس دنیا میں ہم سے "پہلے" آگئے تھے۔ ہمارے دوست خواجہ افتخار نے اتنی محنت سے "جب امرتسر جل رہا تھا" جیسی کتاب لکھی مگر دوست ہیں کہ ان سے پوچھتے ہیں کہ خواجہ صاحب 1947ء میں آپ کی عمر کتنی تھی؟ خواجہ افتخار انور سدید یا ہمارا دکھ یہ نہیں کہ لوگ ہمارے افکار عالیہ پر داد کیوں نہیں دیتے بلکہ اصل دکھ یہ ہے کہ آج کے دور میں جب سائنسی ترقی اپنے عروج پر ہے اور لوگ چاند پر پہنچ چکے ہیں، ہماری قوم ابھی ڈیتھ آف برتھ کے چکر سے نہیں نکل سکی۔

"تھوڑا تو اسے بچا کر دوں تو"

حالانکہ کتاب کے ساتھ مصنف کی ڈیتھ آف برتھ کا مسئلہ ختم کر دیا جائے تو کوئی شخص تاریخ نوٹ کر کے تاریخ دان نہیں کہلا سکتا! یہ بے انصافی نہیں تو اور کیا ہے؟

◆◆◆

جنگل کا بادشاہ!

بہت عرصہ پہلے ہم نے ایک فلم "پھنّے خان" دیکھی تھی۔ جس میں علاؤالدین مرحوم نے "پھنّے خاں" کا کردار ادا کیا تھا' پھنّے خان لاہور کا مخصوص کردار ہے۔ آپ اسے جعلی بدمعاش بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ فلم میں علاؤالدین جہاں چار لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اپنی قمیض کے دامن سے پنکھے کا کام لیتے ہوئے کہتا ہے "بڑی گرمی ہے" اور یوں دامن دو پر اٹھائے جانے سے نیفے میں اڑسا ہوا چاقو نظر آ جاتا ہے۔ ورحقیقت اس کا مقصود ہوتا ہے' کیونکہ وہ لوگوں کو اپنے بارے میں یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ بہت بڑا بدمعاش ہے۔ یہ "پھنّے خان" کا کردار ہمیں اپنے ہاں کے بعض سیاست دانوں کو دیکھ کر یاد آ جاتا ہے۔ یہ بے چارے بھی اندر سے "پھنّے خان" کی طرح معصوم اور بھولے بھالے لوگ ہوں گے مگر یہ اپنے بارے میں مسلسل یہ تاثر دینے میں لگے رہتے ہیں کہ وہ امریکہ کے آدمی ہیں چنانچہ جب بھی فضا میں بڑی گھٹن ہوتی ہے یہ اپنی قمیض کے دامن سے پنکھا کرتے ہوئے کہتے ہیں "بڑی گرمی ہے" اور اس دوران ان کے نیفے میں اڑسا ہوا چاقو نظر آ جاتا ہے' جس سے بے چارے دیکھنے والے سہم کر رہ جاتے ہیں۔

ایک اسی طرح کے "پھنّے خان" سیاست دان سے گزشتہ روز ہماری ملاقات ہوئی۔ وہ کافی دیر تک ہمیں یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ امریکہ کے "آدمی" ہیں' اشاروں' کنایوں میں انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے جو فون کی گھنٹی بجی تھی وہ ریگن کی تھی۔ انہوں نے ہمیں یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کی کہ وہ ان دنوں صرف سگنل کے منتظر ہیں لیکن جب ان کی معصومیت کے بارے میں ہمارا ایمان بالکل ڈانوا ڈول نہ ہوا تو انہوں نے ہمیں ایک اور طرف سے آ لیا۔ کہنے لگے "یہ تو تم جانتے ہی ہو گے کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں کوئی حکومت امریکہ کی مرضی کے بغیر نہیں آتی۔" ہم نے کہا قبلہ آپ ٹھیک کہتے ہیں پھر فرمانے لگے اور یہ بھی تمہیں معلوم ہو گا کہ کوئی حکومت امریکہ کی مرضی کے بغیر جاتی بھی نہیں ہے' ہم نے کہا قبلہ آپ یہ بھی ٹھیک فرماتے ہیں پھر انہوں نے ہمیں ایک شعر سنایا۔

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھا ہے بیڑیاں ہیں پاؤں میں

ہم نے اس شعر پر داد دی تو کہنے لگے لوگ میرے بارے میں ایسے ہی افواہیں اڑاتے رہتے ہیں کہ میں امریکہ کا آدمی ہوں

حالانکہ ریگن سے میرے تعلقات ذاتی نوعیت کے ہیں اگر ہو سکے تو کبھی اپنے کالم میں میرے بارے میں یہ غلط تاثر دور کرنے کی کوشش کرنا۔ اس پر ہمیں اپنے ایک شاعر دوست یاد آ گئے پہلے ہمیں وہ اپنے بارے میں کوئی نہایت مضحکہ خیز سی خبر سناتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ کہیں اس پر کالم نہ لکھ دینا اور جب انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہم اس پر کالم ضرور لکھیں گے تو آخر میں وہ یہ درخواست کرتے ہیں چلو ٹھیک ہے کالم لکھ دینا پر کہیں ساتھ میری تصویر نہ چھاپ دینا اور جب ہم تصویر چھاپ دیتے ہیں تو اگلے روز وہ ہمیں کالم لکھنے اور تصویر چھاپنے پر برا بھلا کہتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے حوالے سے ایک مضحکہ خیز خبر اور سنا دیتے ہیں اور کہتے ہیں "میں جانتا ہوں تم کمینے آدمی ہو تم میرے روکنے سے بھی کالم لکھنے سے نہیں رکو گے اور تم تصویر چھاپنے سے بھی باز نہیں آؤ گے چلو اگر دوستوں کو ذلیل کر کے تمہیں خوشی ملتی ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں مگر تصویر پہ والی چھاپنا اور اس کے ساتھ وہ اپنی تازہ تصویر بھی عطا کر دیتے ہیں۔

ہم نے ابھی جس سیاست دان کا ذکر کیا ہے وہ اکیلے نہیں ہیں جنہیں پاکستان امریکہ کے "نمائندہ خصوصی" ہونے کا دعویٰ ہو اور وہ اس شہرت پر خوش ہوتے ہوں بلکہ ایسے کئی "دانے" ہمارے ہاں اور بھی ہیں۔ جو خود یا ان کے حواری ان کا نام بڑی طاقتوں سے نتھی کر کے اہم کرداروں کو ہوا دیتے رہتے ہیں حتیٰ کہ ان کی راز داری کی بات بچے بچے کی زبان پر آ جاتی ہے جس طرح ہمارے ہاں سکھوں کے لطیفے مشہور ہیں اسی طرح یورپ میں پولینڈ کے لوگوں کے لطیفے زبان زد خاص و عام ہیں۔ ایسے ہی ایک لطیفے کے مطابق ایک سفارتی نمائندے کو بعض انتہائی اہم نوعیت کی دستاویزات حاصل کرنے کے لیے پولینڈ کے ایک جاسوس کے پاس بھیجا گیا جو ایک سے کے لیے کام کرتا تھا جسے انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا اور جس کا نام جارج تھا۔ کوڈ لفظ یہ دیا گیا کہ "بڑی گرمی ہے" تو اس سے دستاویزات حاصل کر لی جائیں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جارج وہی ہے جس کے پاس بھیجا گیا ہے۔ چنانچہ جب یہ "سفارتی" نمائندہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے پولینڈ کے اس قصبے میں پہنچا جہاں وہ انتہائی خفیہ جاسوس رہتا تھا تو اس نے ایک بار میں داخل ہو کر شراب کا آرڈر دیا اور اسی دوران بار والے سے پوچھا "یہاں جارج نام کا کوئی شخص رہتا ہے؟" اس نے کہا جارج نام کے کئی لوگ اس قصبے میں رہتے ہیں ایک جارج لوہار ہے ایک جارج نانبائی ہے ایک جارج انجینئر ہے حتیٰ کہ خود میرا نام بھی جارج ہے۔ اس پر طویل سفر طے کر کے آنے والے شخص نے کہا "بڑی گرمی ہے۔" یہ سن کر بار والے نے کہا "اچھا اچھا تم جارج جاسوس کے بارے میں پوچھ رہے ہو" جن سیاست دانوں کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ بھی عالمی طاقتوں کے اتنے خفیہ نمائندے ہیں کہ ان سے کوئی خفیہ نہیں رہے بچہ بچہ ان سے واقف ہے کیونکہ محفل کے دامن سے پنکھا کرتے ہوئے یہ کوڈ وہ خود دہراتے ہیں کہ "بڑی گرمی ہے۔" جس سے علاقے میں ان کی ٹور بنی رہتی ہے۔ مگر یہ "خفیہ" اسی طرح "خفیہ" ہیں جس طرح کے ایک جلسے کا اعلان سرداری کر رہے تھے کہ جو

سے متروا آج خالصوں کا خفیہ جلسہ فلاں جگہ پر فلاں وقت ہو رہا ہے، سارے متر وہاں پہنچ جائیں۔

اب اگر سنجیدگی سے اس مسئلے کے بارے میں ہماری رائے پوچھی جائے تو بات یہ ہے کہ جنگل ایک ہے بادشاہت کے خواہش مند بہت سے ہیں۔ جس کے پاس طاقت ہو وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ جنگل کا قانون یہی ہے تاہم کبھی کبھی اس ضمن میں کوئی "سانحہ" بھی پیش آ جاتا ہے۔ جنگل کا بادشاہ یعنی شیر ایک روز سیر ہو کر اپنے کچھار سے نکلا، رستے میں اسے ایک لومڑی نظر آئی شیر نے اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا "اوئے بتاؤ جنگل کا بادشاہ کون ہے؟" لومڑی نے ہاتھ جوڑ کر کہا؟ حضور آپ جنگل کے بادشاہ ہیں۔" تھوڑی دیر بعد ایک گیدڑ سامنے سے گزرا۔ شیر نے اسے کال دے کر پاس بلایا اور کہا "اوئے بتاؤ جنگل کا بادشاہ کون ہے؟" گیدڑ نے کہا "مائی باپ آپ کے علاوہ کون ہو سکتا ہے" اتنے میں ایک ہاتھی سامنے آ گیا، شیر نے جسے خوراک چڑھی ہوئی تھی اسے بھی روکا اور کہا "اوئے بتاؤ جنگل کا بادشاہ کون ہے؟"

ہاتھی نے یہ سن کر جنگل کے بادشاہ کو اپنی سونڈ میں لپیٹا اور اسے اٹھا کر پرے پھینک دیا، شیر خفیف سا ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا "قبلہ اس میں تنا ناراض ہونے کی بات کون سی تھی؟ اگر آپ کو نہیں پتہ تھا کہ جنگل کا بادشاہ کون ہے تو مجھ سے پوچھ لیتے۔" سو دنیا بھر کے جنگل کے بادشاہوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ گیدڑوں اور لومڑیوں پر بے شک ساری عمر اپنی بادشاہت کا رعب جماتے رہیں لیکن اگر کبھی ان کا سامنا کسی "چھٹے خان" بلکہ کسی کے "ہاتھی" سے ہو جائے تو اس وقت ادھر ادھر ہو جائیں یا کم از کم اس سے یہ نہ پوچھیں کہ "جنگل کا بادشاہ کون ہے؟"

صبح کرنا شام کا.....!

انسان جب مصروف زندگی گزار رہا ہوتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اسے اس زندگی کی قدر صحیح طور پر محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی پے در پے مصروفیات کی وجہ سے کبھی کبھی خود کو قابل رحم بھی محسوس کرنے لگتا ہے' حالانکہ قابل رحم زندگی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب انسان کی مصروفیات ختم ہو جاتی ہیں اور اسے فارغ وقت کی وجہ سے صبح سے شام کرنا جوئے شیر لانے کے برابر محسوس ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی میں یہ تکلیف دہ دور اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد شروع ہوتا ہے' اولاد جوان ہو چکی ہوتی ہے اور ان کی مصروف زندگی کے اپنے تقاضے اور اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ریٹائرڈ بزرگوں کے اپنے تقاضے اور اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ریٹائرڈ بزرگوں کو ٹائم پاس کرنے کے لیے گپ شپ کی خاطر اہل خاندان میں سے بھی کوئی ایسا فرد نہیں ملتا جو اس مشکل وقت میں پوری طرح ان کے کام آسکے' چنانچہ اس صورت میں وقت گزاری کے لئے وہ باہر سے کوئی آدمی تلاش کرتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل بہت زیادہ ہے اور اس کی بے شمار صورتیں ہیں' مگر ہم طوالت کے خوف سے ان سب سے قطع نظر کر کے مکالموں کی صورت میں صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ اس المیہ ڈرامے کا منظر نامہ یہ ہے کہ بزرگ موصوف وقت گزاری کے لیے کسی دکان کے باہر مونڈھے پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں کہ ایک راہ گیر ان کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ سال انڈسٹریز کا دفتر کدھر ہے؟ ریٹائرڈ بزرگ برابر والا مونڈھا اس کی طرف سرکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ بیٹھیں' میں بتاتا ہوں۔ اب ذرا ان کے مابین گفتگو ملاحظہ فرمائیں۔

''آپ کہاں سے آرہے ہیں؟''

''جی! گوجرانوالہ سے آرہا ہوں!''

''وہاں کس محلے میں رہتے ہیں؟''

''سٹیلائٹ ٹاؤن میں رہتا ہوں۔''

''شیخ کرم صاحب کو تو آپ جانتے ہوں گے؟''

''نہیں جی!''

''کمال ہے' کتنے عرصے سے آپ وہاں رہ رہے ہیں؟''

"تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔"

"تبھی۔ ۔ ۔ لاہور تک ٹرین میں آئے ہیں یا بس میں؟"

"جی بس میں آیا ہوں۔"

"پرائیویٹ بس میں آئے ہیں یا جی ٹی ایس میں؟"

"پرائیویٹ بس میں آیا ہوں۔"

"پھر تو آپ بادامی باغ اترے ہوں گے؟"

"جی ہاں۔"

"وہاں سے رکشے میں یہاں تک آئے کہ ویگن میں؟"

"جی رکشے میں آیا ہوں۔"

"رکشے والا اسٹیشن کی طرف سے لایا ہوگا؟"

"نہیں جی، دوسری طرف سے آیا ہوں۔"

"یہ رکشے والے بڑے غلط لوگ ہیں۔"

"جی ہاں ۔ ۔ ۔ مجھے بتا دیں سال انڈسٹریز کا دفتر کدھر ہے؟"

"آج کل سیاست کدھر جا رہی ہے؟"

"اللہ بہتر جانتا ہے جی اور وہ سال انڈسٹریز ۔ ۔ ۔"

"شادی وادی تو ہو گئی ہوگی؟"

"جی ہاں!"

"رشتے داروں میں ہوئی ہے؟"

"نہیں جی"

"باہر ہوئی ہوگی؟"

"جی ہاں"

''بچے کتنے ہیں؟''

''سمال انڈسٹریز.....''

''بھئی واہ آپ میں تو حس مزاح بھی بہت ہے' یہ بچے بھی تو سمال انڈسٹریز ہی میں آتے ہیں' کتنے بچے ہیں خیر سے؟''

''بزرگو مجھے بہت دیر ہو رہی ہے۔ ابھی مجھے واپس گوجرانوالہ بھی جانا ہے؟''

''بس میں جائیں گے یا ٹرین میں؟''

''بس میں''

''پرائیویٹ بس یا جی ٹی بس میں؟''

''پرائیویٹ بس میں!''

''پھر تو بادامی باغ سے بیٹھیں گے۔''

''جی ہاں''

''بادامی باغ تک رکشہ میں گے یا ویگن سے جائیں گے؟''

''رکشے میں جاؤں گا۔''

''اسٹیشن کی طرف سے یا؟''

''یہ رکشے والے بڑے فراڈ لوگ ہوتے ہیں۔''

''جی ہاں' مگر بزرگو مجھے سمال انڈسٹریز کا دفتر بتا دیں' مجھے بہت جلدی ہے۔''

''بھئی آپ تو واقعی جلدی میں لگتے ہیں' چلیں میں بتاتا ہوں یہ جہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں' اسی لائن میں دو بلڈنگیں چھوڑ کر تیسری بلڈنگ میں اس کا دفتر ہے۔ آپ کام نمٹائیں' پھر ذرا گپ شپ ہوگی میں تو یہیں بیٹھا ہوں!''

◆◆◆

ایک لانگ ڈسٹینس کال!

"السلام علیکم بھائی جان! میں لاہور سے انوار بول رہا ہوں۔"

"شکر ہے یار تمہاری آواز سنائی دی، مگر آواز بہت کم آ رہی ہے، ذرا اونچا بولو۔"

"بھائی جان شکر کریں فون مل گیا ہے، میں تو دو گھنٹے سے ٹرائی کر رہا تھا، بھابی، بچوں کا کیا حال ہے؟"

"سب ٹھیک ہیں، تم سناؤ، گھر میں سب خیریت سے ہیں؟"

"جی اللہ کا شکر ہے، پشاور کا موسم کیسا ہے؟"

"سخت سردی پڑ رہی ہے، لاہور کا کیسا جا رہا ہے؟"

"لاہور میں بھی یہی حال ہے، سنا ہے عذرا باجی سخت بیمار ہیں، ایک تو ان کے ہاں فون نہیں ہے اور مجھے خط لکھنے کا وقت نہیں ملتا، آپ ان کی طرف جائیں تو میری طرف سے بھی پوچھ لیں!"

"میں تو خود ایک مہینے سے ان کی طرف نہیں جا سکا، وقت ہی نہیں ملتا، ویسے شہباز آیا تھا، وہ بتا رہا تھا پہلے سے بہتر ہیں۔ بڑا ترس آتا ہے ان پر، ہماری اس بہن نے ساری عمر دکھ اور پریشانی ہی میں گزار دی۔"

"سنا ہے وہ مالی طور پر بھی پریشان ہیں؟"

"ہاں میں نے بھی سنا ہے، جی چاہتا ہے کہ ان کی مدد کرنے کو، لیکن میں ان دنوں مکان بنا رہا ہوں، ابھی تک ساڑھے بائیس لاکھ لگ گئے ہیں مگر یہ مکمل ہونے میں ہی نہیں آ رہا، ویسے میں نے شہباز کو کہا تھا کہ دوائیوں وغیرہ کی ضرورت ہو تو وہ ہسپتال میں ڈاکٹر رانا سے مل لے، وہ میرا بچپن کا دوست ہے، میں نے شہباز کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا تھا!"

"چلیں یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا، وہ اپنا گٹو ہے نا؟"

"کون گٹو؟"

"تایا جی مجاز کا نواسہ!"

"ہاں ہاں کیا ہوا اسے؟"

''پھر اسے جوئے کے الزام میں پکڑ لے گئی؟''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو وہ تو بہت اچھا بچہ ہے!''

''ہاں میں جانتا ہوں رضیہ آپی بھی روتی ہوئی آئی تھیں تایا ابو بھی آئے تھے کہ اس کے لئے کچھ کرو وہ بالکل بے گناہ ہے''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''بھائی جان میں کیا کر سکتا ہوں اس پر الزام ہی ایسا ہے کہ کسی کو کچھ کہتے ہوئے شرم آتی ہے اور پھر ویسے بھی آج کے زمانے میں کسی کی نیک چلنی کی گواہی کیسے دی جا سکتی ہے کل کو جو سب کے سامنے شرمندہ ہوں تو کیا یہ بہتر نہیں کہ اس معاملے میں آیا ہی نہ جائے چنانچہ میں نے رضیہ آپی اور تایا ابو کو ٹرخا دیا تھا۔''

''اچھا کیا! کبھی سلمان سے تو ملاقات نہیں ہوئی؟''

''کون سلمان؟''

''بھئی وہ جو میرا بچپن کا دوست ہے' کیا اس نے تمہاری طرف آنا جانا چھوڑ دیا ہے؟''

''اچھا سلمان بھائی جان اس بیچارے کو تو فوت ہوئے ایک سال گزر چکا ہے۔''

''اوہو بہت افسوس ہوا' تم جنازے میں گئے تھے؟''

''جانا تھا' مگر جب میں گھر سے نکل رہا تھا' کچھ کاروباری دوست آ گئے' بہت اچھا آدمی تھا' اللہ اس کی مغفرت کرے جب بھی آتا ہمیشہ آپ کی باتیں کرتا۔ آپ سے وہ محبت کرتا تھا''

''مجھے خود اس سے بہت محبت تھی' کبھی اس کے گھر جانا ہو تو میری طرف سے بھابی سے تعزیت ضرور کرنا' اور سیاست کا کیا حال ہے؟''

''آپ کے سامنے ہی ہے' ملک میں تو قدرے سکون ہے لیکن عالم اسلام پر بہت برا وقت آیا ہے۔ بھائی بھائی سے لڑ رہا ہے اور دشمنوں کو چودھری بننے کا موقع مل رہا ہے۔''

''بس یار دعا کرو اللہ حالات بہتر کرے' اس سے کاروبار پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔''

''جی ہاں' پہلے سے آدھا رہ گیا ہے' یہ آپ کی آواز بہت کم آ رہی ہے!''

''میں تو خاصا اونچا بول رہا ہوں' ویسے آواز تمہاری بھی بہت مدھم ہے۔''

''ہیلو!''

''ہیلو ہیلو''

''ہیلو ۔ ہاں اب کچھ بہتر ہے آپ لاہور آ رہے ہیں؟''

''میں پچھلے ہفتے چند گھنٹوں کے لئے آیا تھا کچھ ضروری کام تھے مگر تم سے ملاقات نہ ہو سکی ایک تو تم نے گھر بہت دور بنایا ہے اوپر سے تمہارا فون خراب رہتا ہے بہت فون کئے سوچا تھا کہ چلو فون پر ہی بات کروں مگر تمہارے فون سے ٹوں ٹوں کی آواز آتی رہی ہیلو یہ پھر گڑبڑ شروع ہو گئی ہے!''

''بھائی جان لانگ ڈسٹینس کال میں یہی تو خرابی ہے کہ ۔۔ ''

''بھائی کو بھائی کی آواز سنائی نہیں دیتی مگر یہ خرابی لانگ ڈسٹینس کال میں نہیں اس ''لانگ ڈسٹینس'' میں ہے جو مادہ پرستی نے رشتوں کے درمیان پیدا کر دیا ہے! کیونکہ تمہیں تو ایک شہر میں رہنے والے قریبی عزیزوں کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔''

''یہ کون گدھا درمیان میں آ گیا ہے؟''

''چلو دفع کرو اسے تم اپنے بچوں کی تازہ تصویریں تو مجھے بھیجو بہت یاد آتے ہیں۔''

''وہ بھی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔''

''تم دونوں جھوٹ بولتے ہو تم لوگوں کو اپنے علاوہ کچھ یاد نہیں۔''

''یہ کوئی بہت ہی لعنتی شخص ہے اچھا بھائی جان پھر بات ہو گی۔''

''خدا حافظ''

''خدا حافظ''

◆◆◆

آئی ایم سوری بیٹی!

ساتویں جماعت کی ایک بچی نے میرے نام ایک خط لکھا ہے' خط خاصا طویل ہے مگر میں آپ کو اس کا اقتباس سنانا چاہتا ہوں ملاحظہ فرمائیں۔

"محترم انکل عطاء الحق قاسمی صاحب

السلام علیکم!"

میں جماعت ہفتم کی طالبہ ہوں اور آپ کی وساطت سے حکومت سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ تمام مارکیٹوں کو پانچ بجے بند کرنے کے احکام صادر کئے جائیں۔ میری اس گزارش کی چند وجوہات ہیں سب سے اہم یہ کہ نہ صرف میں بلکہ پاکستان کے لاکھوں بچے اپنے والدین خصوصاً والد سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ صبح ہم سکول جاتے ہیں تو وہ سو رہے ہوتے ہیں' کیونکہ رات کو انہیں دیر سے چھٹی ہوتی ہے یا جو خود دکاندار ہیں وہ دکانیں دیر سے بند کرتے ہیں۔ اور ہماری بدنصیبی کہ ہمیں علاوہ جمعۃ المبارک (بعض اوقات تو جمعہ کو بھی نہیں) ہفتہ کے چھ دن والد کے ساتھ بیٹھ کر ایک وقت بھی کھانا کھانا یا بات چیت کرنا نصیب نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے جب مارکیٹیں اتنی دیر سے بند ہوتی ہیں تو وہ دس گیارہ بجے سے پہلے کیا گھر واپس آئیں گے اور ظاہر ہے سکول' کالج جانے والے بچے اتنی دیر تو جاگنے سے رہے اور بھوکے رہے کہ والد صاحب کا انتظار کر کے کھانا کھائیں۔ یہ درست ہے کہ وہ سب والدین ہمارے ہی لیے دن رات محنت کرتے ہیں اور ہمارے لیے اچھی خوراک و لباس کے لیے بے آرام رہتے ہیں لیکن کیا وہ ہمارے لیے صرف چیزیں اور اچھی خوراک ہی سب کچھ ہے' کیا انہیں والدین کی محبت و توجہ کی کوئی ضرورت نہیں؟

(ایک بیٹی)"

خط کے باقی حصے میں اس بچی نے اپنے موقف کے حق میں کچھ دلائل بھی دیئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب ساری مارکیٹیں ایک ہی وقت پر بند ہوں گی تو اس سے کاروباری نقطہ نظر سے بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا کہ گاہک وقت مقررہ پر خریداری کر لیا کریں گے' نیز یہ کہ اس کے نتیجے میں والدین اپنے بچوں کی بہتر تربیت کر سکیں گے' جس سے معاشرہ سنور جائے گا وغیرہ وغیرہ' مگر یہ سب باتیں بڑوں کے سوچنے اور کرنے کی ہیں' بچوں کا مسئلہ وہی ہے جو اوپر کی سطور میں بیان ہوا ہے۔ میں بچی اس بچی کو یقین دلاتا

ہوں کہ اس نے جو کچھ کہا ہے' سچ کہا ہے' میں اس کی تمام باتوں سے متفق ہوں مگر میری پیاری بیٹی' یہ سب کچھ نہیں ہوگا' معاشرے نے اپنے لئے جو منزل منتخب کی ہے' اس راستے میں گھر کا سکون' ماحول کی بہتری اور ملک و قوم کی بھلائی کچھ زیادہ اہم نہیں ہیں بلکہ اصل چیز روپے پیسے کی فراوانی ہے' روپے پیسے کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے اگر والدین مصروف ہو جائیں گے اور وہ بچوں کی تربیت نہیں کر سکیں گے تو کیا ہوا؟ اگر پیسے پاس ہوں تو بچوں کی "تربیت" کے لیے وی سی آر اور ویڈیو فلمیں جو موجود ہیں معیار زندگی بلند کرنے کی دوڑ میں شریک ہونے سے اعصابی کچھ پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں ہارٹ اٹیک' شوگر' بلڈ پریشر اور طرح طرح کی دوسری بیماریاں جنم لیتی ہیں' ان کا علاج بھی دولت کی موجودگی میں ممکن ہے' آخر یہ بڑے بڑے پرائیویٹ ہسپتال کس لیے بنائے گئے ہیں' انہی لوگوں کے لیے تو بنائے گئے ہیں جو دولت کماتے کماتے بیمار پڑتے ہیں تو دولت خرچ کرنے کے لیے ان ہسپتالوں میں داخل ہو جاتے ہیں' بچوں کو مجبوریوں کا احساس ہونا چاہیے۔ وہ ان کے لیے دولت کمانے میں مصروف ہیں' اس اہم فریضے کی ادائیگی کی وجہ سے وہ اگر اپنے بچوں کے لیے وقت نہ نکال سکیں تو اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں' گھر میں نوکروں کی فوج ظفر موج موجود ہوتی ہے' بچے انہی کو والدین سمجھیں اور کسی قسم کے احساس محرومی میں مبتلا نہ ہوں!

بیٹی نے اپنے خط میں صرف مارکیٹوں کے حوالے سے بات کی ہے جبکہ یہ مسئلہ اب تمام پیشوں سے وابستہ لوگوں کا ہے' بڑے صنعت کاروں سے لے کر ایک معمولی مزدور تک سب مصروف ہو چکے ہیں۔ ہمارے گھر آسیب زدہ گھروں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں جن میں انسانوں کی آسائش کی سبھی چیزیں موجود ہیں' بس ان گھروں میں رہنے والے انسانوں کے چہرے سبھی خوشیوں سے محروم ہو چکے ہیں' ان گھروں میں انسانوں کی آوازیں ٹیلی وژن' وی سی آر' فریج' مائیکرو ویو اوون' کاروں' قالینوں اور امپورٹڈ چیزوں سے مسحور ہو کر غیر انسانی مماثلت میں تبدیل ہو چکی ہے اب وہ پاگل آدمی اشفاق احمد کے محض افسانوی تخیل کی تخلیق ہے جو عین اس روز اپنے دفتر میں حاضر نہیں ہوتا جس روز ایک ٹھیکے سے اسے لاکھوں روپے کا منافع حاصل ہونا تھا اور اپنی غیر حاضری کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ صبح جب وہ گھر سے دفتر کے لیے نکل رہا تھا اس کا سب سے چھوٹا بچہ پہلی دفعہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور اس نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ بس وہ سارا دن اپنے بچے کو اپنے ننھے ننھے پاؤں سے چلتے دیکھتا رہا کہ اس کے نزدیک اپنے بچے کو پہلی دفعہ چلتے دیکھنے کی خوشی لاکھوں روپوں میں بھی نہیں خریدی جا سکتی تھی۔

آئی ایم سوری بیٹی! تم نے جو خط لکھا ہے اس کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوگا کہ دنیا میں زیادہ تعداد عقل مند لوگوں کی ہے' اس شخص جیسے بے وقوف بہت کم ہیں جو اپنے بچے کو پہلی دفعہ چلتے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور سمجھتے ہیں کہ زندگی کی یہ حقیقی خوشیاں دولت کے انباروں سے بھی نہیں خریدی جا سکتیں۔

◆◆◆

لارنس آف عربیہ!

پاکستانی عوام کا وہ حصہ جسے صدام حسین کی صورت میں صلاح الدین ایوبی کا عکس نظر آتا تھا' ان دنوں اسی شدید صدمے سے دوچار ہے جس صدمے سے پاکستانی عوام دوچار ہوئے تھے جب ریڈیو سے فتح کی خبریں سنتے سنتے انہوں نے چانک مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے ہتھیار پھینکنے کی خبر سنی تھی۔ جنگ کے دنوں میں یحییٰ خان نے جس طرح بڑھکیں لگائی تھیں اور ریڈیو صدر کے ساتھ جس "گالی گلوچ" کا مظاہرہ کیا تھا اس وقت بھی پاکستانی عوام کے ایک حصے کو یحییٰ خان پر سلطان صلاح الدین ایوبی کا گماں ہوا تھا مگر یحییٰ خان جب سلطان صلاح الدین ایوبی کی بجائے "سلطان" ثابت ہوا تو ان لوگوں کے چہرے لٹک گئے اور پاکستانی فوج کے ہتھیار پھینکنے کے صدمے نے قوم کے ایک طبقے کو پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کے مستقبل سے مایوس کر دیا۔ یہی مایوسی کی لہر ایک دفعہ پھر آئی ہے اور آپ یقین کریں دشمن کی اصل کامیابی یہی ہے!

گر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اپنی بات کی تھوڑی سے وضاحت کر دوں۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ خلیجی جنگ کے دوران امریکی فوج کے کمانڈر جنرل شوارزکوف' اتحادی فوجوں کے مختلف ذمہ دار افراد اور مغربی ذرائع ابلاغ صدر صدام حسین کی زبردست فوجی قوت ہونے کا تاثر دیتے رہے اور عراق کے دفاعی انتظامات کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا گیا جیسے یہ کوئی ملک نہیں ایک قلعہ ہے جو ناقابل تسخیر ہے' کویت کے چپے چپے میں بچھی بارودی سرنگوں کی تفصیل بیان کی گئی۔ عراق کے مہلک ہتھیاروں کا پروپیگنڈہ کیا گیا' یہ کہا گیا کہ زمینی جنگ بہت طویل ہوگی اور ذہنوں میں یہ بات بھی بٹھائی گئی کہ عراقی فوج دنیا کی بہترین فوج ہے' اس دوران خوفناک بمباری سے عراق کا جو حال ہوتا رہا وہ بغداد ریڈیو نے بھی دنیا سے چھپائے رکھا اور مغربی ذرائع ابلاغ نے بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔ بس ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ صدام حسین نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے ہیں اور وہ ہر ذلت آمیز شرط ماننے پر بھی تیار ہے جس پر ان تمام لوگوں کو ایک کرنٹ سا لگا جن کے سامنے صدام حسین ایک مافوق الفطرت سی شخصیت بنا کر پیش کیا گیا اور دشمن کا مقصد پورا ہو گیا۔ دشمن نے عالم اسلام کے سامنے پہلے ایک ڈمی صلاح الدین ایوبی پیش کیا اور پھر اس ڈمی کو ایک جھٹکے میں زمین بوس کر کے مسلمان عوام کو مایوسی کی شدید لہر سے دوچار کر دیا کہ اب تو تمہارا صلاح الدین ایوبی "صلیبی سورماؤں" کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اے مسلمان قوم تم مایوس ہو جاؤ اور سجدے میں گر جاؤ اور اس "حقیقت" کو تسلیم کر لو کہ تمہیں ہماری غلامی سے اگر "صلاح الدین ایوبی"

بھی آزاد نہیں کرا سکتا تو باقی ''چھوٹے موٹے'' لیڈروں پر تو آس لگانا ویسے ہی فضول ہے۔ چنانچہ عالم اسلام کا وہ جذباتی طبقہ واقعی ہاتھ پر ہاتھ بلکہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا جس نے صدام حسین کے ماضی اور حال کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے مشکل سمجھ لیا تھا اور یہ طبقہ اب شاید ایک طویل عرصے تک عالم اسلام کے حوالے سے ایک شدید مایوسی کا شکار رہے گا!

مگر خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں صرف جذباتی لوگ نہیں بستے چنانچہ خلیجی بحران میں پاکستانی عوام کے ایک بڑے طبقے نے مومنانہ بصیرت کا مظاہرہ کیا اور وہ صدام حسین کو اس کے چہرے کی ''پلاسٹک سرجری'' کے باوجود اس کی اصل شکل میں دیکھتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے امریکہ کے خلاف تو اپنی نفرت کا اظہار کیا لیکن وہ یہ نہیں بھولے کہ صدام حسین امریکی گیم کھیل رہا ہے۔ ماضی میں بھی وہ سامراجی طاقتوں کا آلہ کار بنا اور لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور اب خلیجی جنگ میں بھی وہ امریکہ کا آلہ کار بن کر عراقی مسلمانوں سمیت مسلم امہ کو تباہی سے دوچار کر رہا ہے۔ اس شخص نے عراق کے علاوہ سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر اور دوسری کئی ریاستوں کو امریکہ کی گود میں ڈال دیا ہے اور جو تھوڑے بہت فیصلے وہ اپنی مرضی سے کر سکتے تھے' ان فیصلوں سے بھی انہیں محروم کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسرائیل علاقے کی سب سے بڑی قوت بن کر ابھرا ہے جس کی طرف اب ایک عرصے تک کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گا۔ یہ وہ نتائج ہیں جو مجھ ایسے بے بصر کو نوشتہ دیوار کی طرح لوح تقدیر پر لکھے نظر آ رہے تھے۔ چنانچہ ان کالموں میں بار بار یہی بات کہی گئی' جب کہ ہمارے اپوزیشن کے رہنماؤں اور بعض اخبارات نے اس ضمن میں پاکستانی عوام کو نہ صرف دھوکے میں رکھا بلکہ انہیں صدام حسین کی وہ تصویر دکھائی جو دنیا کا کوئی کیمرہ نہیں کھینچ سکتا تھا۔ یہ وقت طعن و تشنیع کا نہیں بلکہ عالم اسلام کو اس کے مستقبل سے مایوسی سے بچانے کا ہے اور یہ بتانے کا ہے کہ خدا کے لیے آئندہ جب کوئی شخص آپ کے سامنے آپ کے خوابوں کی تعبیر صلاح الدین ایوبی کی تصویر پیش کرے تو آپ اس کے خدوخال ٹٹول ٹٹول کر دیکھیں کہ کہیں یہ ڈمی صلاح الدین ایوبی تو نہیں' کیونکہ ممکن ہے جسے آپ صلاح الدین ایوبی سمجھ رہے ہیں' وہ لارنس آف عریبیہ ہو'

◆◆◆

چور بھائی! پھر کب آؤ گے؟

''گزشتہ ہفتے لاہور میں ایک ایسا واقعہ بھی رونما ہوا' جسے میرے جیسا قنوطی شخص بھی خوش آئند قرار دے سکتا ہے' یہ واقعہ میرے رفیق کار اسد اللہ غالب کے گھر کا ہے' رات کو جب اسد اللہ غالب اپنے اہل خانہ کے ساتھ سو رہے تھے' چور آئے اور کھڑکی توڑ کر گھر میں داخل ہو گئے' بعد میں وہی کچھ ہوا جو کچھ ہوتا ہے یعنی مبینہ طور پر ڈیڑھ لاکھ روپے کے طلائی زیورات لے کر رفو چکر ہو گئے۔ جب میں نے یہ خبر اخبار میں پڑھی تو فرط مسرت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک طویل عرصے کے بعد لاہور میں چوری کی کوئی واردات ہوئی ہے' ورنہ تو یہاں ڈاکے پڑتے تھے۔ طویل مدت سے اب تو یہی روٹین ہے کہ دن دہاڑے ڈاکو ہنڈی کار میں سے نکلتے ہیں' گھر کی گھنٹی بجاتے ہیں اور پھر ''بنوک شمشیر'' گھر میں گھس جاتے ہیں' اہل خانہ کو رسیوں سے باندھتے ہیں اور پھر سارا گھر اہل خانہ کی جاگتی آنکھوں کے سامنے ''ہونج'' کر لے جاتے ہیں جب کہ ہم اپنے بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ جب آدھی رات ادھر اور آدھی ادھر ہوتی تھی' چور لنگوٹ باندھ کر اور جسم پر تیل مل کر دبے پاؤں کسی گھر میں داخل ہوتے تھے۔ دبے پاؤں اس لئے گھر میں داخل ہوتے تھے کہ کہیں اہل خانہ کی آنکھ نہ کھل جائے' لنگوٹ اس لئے باندھتے تھے کہ اگر اہل خانہ جاگ جائیں تو دوڑتے وقت انہیں کوئی مشکل نہ پکڑ سکے اور جسم پر تیل اس لئے ملتے تھے کہ اگر کوئی چھاپہ مارنے کی کوشش کرے تو تیل ملے جسم پر سے اس کے ہاتھ پھسل جائیں اور یوں وہ بھاگ کر اپنی جان بچا سکیں۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ تمام احتیاطی تدبیر کے باوجود اگر انہیں شبہ بھی ہو جاتا تھا کہ واردات کے دوران کوئی جاگ سکتا ہے تو وہ رسک نہیں لیتے تھے اور خالی ہاتھ لوٹ جاتے تھے لیکن یہ بہت پرانی باتیں ہیں کہ اب تو ان شریف النفس چوروں کی جگہ کلاشنکوف بردار ڈاکوؤں نے لے لی ہے۔ یہ ڈاکو گھروں پر ڈاکے مارتے ہیں اور بینکوں سے قرض لے کر معاف کرا لیتے ہیں۔ ان حالات میں اسد اللہ غالب کے گھر چوری کی واردات میرے نزدیک پرانی قدروں کی بحالی کے زمرے میں آتی ہے اور یوں یہ واقعہ ہماری ثقافتی تاریخ میں ایک روشن موڑ کے طور پر یاد رکھے جانے کے قابل ہے!

اگر سچ پوچھیں تو مجھے یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں دوسرے انسٹی ٹیوشنز کی طرح ہمارے ہاں چوروں کا انسٹی ٹیوشن بھی ختم تو نہیں ہو گیا؟ مگر چوری کے اس واقعے سے روشنی کی ایک کرن سی مجھے نظر آئی ہے اور میرے دل میں امید پیدا ہوئی ہے کہ اگر حالات ساز گار رہے تو انشاء اللہ آئندہ بھی چوریاں ہوں گی۔ آج کے دور میں جب ہر کوئی اپنے معمولی سے کام کو کارنامہ بنا کر پیش کرتا ہے اور

اخباروں میں اپنی تصویریں چھپواتا ہے۔ حذر کہ چور کا نام و نمود سے اس قدر بے نیاز ہونا بھی اپنی جگہ بہت قابل ستائش ہے۔ اسے شاید اندازہ ہی نہیں کہ اس نے ڈاکوؤں کے اس دور میں چوری کی واردات کر کے ہمارے ایک پرانے انسٹی ٹیوشن کو بحال کیا ہے یا وہ اتنا نادان ہے کہ ڈیڑھ لاکھ کے طلائی زیورات پر قناعت کر گیا ہے حالانکہ قوم کی طرف سے اس کے گلے میں اس سے دگنی مالیت کے نوٹوں کے ہار پہنائے جا سکتے تھے۔ بہرحال وجہ جو کچھ بھی ہو اس دوست کی خدمات اتنی قابل قدر ضرور ہیں کہ ان سے بذریعہ اشتہار درخواست کی جائے کہ وہ براہ کرم کسر نفسی سے کام نہ لیں اور منظر عام پر آئیں۔ ہماری قوم اتنی احسان فراموش نہیں کہ ان کی اس قومی خدمت کا انہیں کوئی انعام نہ دے۔ چنانچہ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنا نام آشکار کر دیں تو کوئی بھی سیاسی جماعت عوام میں نیک نامی کے حصول کے لیے انہیں آئندہ انتخابات میں صوبائی و قومی اسمبلی کا ٹکٹ دے سکتی ہے اور جو جماعت بھی یہ قدم اٹھائے گی، قوم اس کی احسان مند ہوگی اور یہ سوچ کر ہوگی کہ شاید اسی طرح ہماری سیاست ڈاکوؤں کے ہاتھ سے نکل کر چوروں کے ہاتھ میں آ سکے!

میرے ایک دوست نے مجھے یہ سطور لکھتے دیکھا تو اس نے کہا تم نے چوری کی اس واردات کو صرف ایک سماجی اور ثقافتی تبدیلی کے حوالے سے دیکھا جبکہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ملک میں امن و امان کی صورت حال بہتر ہو رہی ہے۔ مگر مجھے اپنا یہ دوست خاصا کم فہم لگا۔ اسے علم ہی نہیں کہ امن و امان کی بہتری کا اشارہ ملنا اتنی اہم بات نہیں کیونکہ اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ لوگ چوروں کے لئے طلائی زیورات کی گٹھڑی الگ باندھ کر رکھ دیں گے اور خود عزت اور جان کو محفوظ سمجھ کر سکون کی نیند سوئیں گے جبکہ چوروں کے انسٹی ٹیوشن کی بحالی اصل چیز ہے۔ اس سے اداروں پر قوم کا اعتماد بحال ہوگا چنانچہ حکومت کو چاہیے کہ اگر چور رضاکارانہ طور پر سامنے نہیں آتا تو پولیس اپنی روایات کو پس پشت ڈالتے ہوئے چوری کا سراغ لگائے اور پھر ڈی آئی جی رانا مقبول یا ایس پی چیمہ اس چور کو ہار پہنا کر ایک پریس کانفرنس میں صحافیوں کے سامنے پیش کریں تا کہ اخبارات کے ذریعے نئی نسل کو بتایا جا سکے کہ

"ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں"

حکومت کے علاوہ میرے خیال میں عوام کو بھی اپنے اس محسن کی حدودرجہ پذیرائی کرنا چاہیے۔ تقریب پذیرائی کے خاتمے کے بعد اسے رخصت کرتے وقت پوچھنا چاہیے کہ چور بھائی پھر کب آؤ گے؟

◆◆◆

ایک برطانوی نژاد سیاست دان کا آف دی ریکارڈ انٹرویو!

''میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی شدید مصروفیات میں سے ہمارے اخبار کے لئے کچھ وقت نکالا۔''

''اس میں ممنونیت کی کون سی بات ہے آپ غریب خانے پر تشریف لائے جس سے میری عزت افزائی ہوئی۔''

''یہ غریب خانہ کتنے ایکڑ میں ہے؟''

''صرف دو ایکڑ میں' بس جی پہلے وقتوں میں سر چھپانے کے لئے یہ جگہ بنائی تھی' میں تو اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اس ملک میں لاکھوں لوگوں کے پاس تو اتنی جگہ بھی نہیں ہے!''

''آپ کی جماعت کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟''

''مقاصد تو اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں' اگر صاحبان اقتدار سے آپ کی رسم و راہ ہو تو غراض بھی عرض کر سکتا ہوں۔''

''اس کے لئے ہم علیحدہ میٹنگ کریں گے' فی الحال آپ یہ بتائیں کہ موجودہ خلیجی جنگ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟''

''معافی چاہتا ہوں' ابھی کھل کر رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں!''

''وہ کیوں؟''

''عراق اور سعودی عرب کے سفارت کاروں سے علیحدہ علیحدہ بات چل رہی ہے' حتمی طور پر کل پتہ چل سکے گا کہ ان دونوں میں سے کس کے وسائل کی تباہی مسلم امہ کے حق میں ہے!''

''مسلم آپ کے ایک بیٹے کا بھی تو نام ہے۔''

''جی ہاں' اسی کی وجہ سے پریشان ہوں اس نے کاروبار شروع کیا ہے جس کے لیے وسائل کی ضرورت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عراق اور سعودی عرب میں سے کس کے وسائل مسلم کے کام آ سکتے ہیں!''

''مسلم ممالک پر جب بھی برا وقت آتا ہے' آپ ان کی مدد کے لئے لاکھوں رضا کار بھیجنے کا اعلان کرتے ہیں ہاں' آخر ان رضا کاروں کا کیا بنتا ہے؟''

''آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ میں نے کبھی کشمیر یا افغانستان کے حریت پسندوں کے لیے رضا کار بھیجنے کا اعلان نہیں کیا' میں ہمیشہ

عرب ممالک کے لیے رف کاروں کے دستے بھیجنے کا اعلان کرتا ہوں؟"

"جی ہاں' مگر اس کی کیا وجہ ہے نیز اس ضمن میں آپ کو عوام کی طرف سے رسپانس بھی موصول ہوتا ہے یا نہیں؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ میری ایک ریکروٹنگ ایجنسی بھی ہے جو لوگوں کو عرب ممالک میں معقول فیس لے کر ملازمتیں دلواتی ہے۔ چنانچہ عوام کی طرف سے میرے اعلان کا بھرپور رسپانس ہوتا ہے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں درخواستیں لے کر آتے ہیں اور فیس ادا کر کے اپنا کام درج کرا دیتے ہیں' باقی اللہ مالک ہے۔"

"آپ کے نزدیک ملک اور قوم کو درپیش موجودہ مسائل کا حل کیا ہے؟"

"اس کا حل ڈی نیشنلائزیشن کی پالیسی کو آگے بڑھانا ہے"

"کیا مطلب؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ملک کی داخلہ اور خارجہ پالیسی بھی ڈی نیشنلائز ہونا چاہیے' جس لیڈر کا جی چاہے وہ اپنی داخلہ اور خارجہ پالیسی پر آزادانہ عمل کر سکے اور اس ضمن میں خفیہ ایجنسیوں کو کسی قسم کی مداخلت کا حق نہیں ہونا چاہیے!"

"تو کیا آپ کے خیال میں ہمارے ہاں پہلے سے ہی اس پالیسی پر عمل نہیں ہو رہا؟"

"آپ سچ کہتے ہیں مگر ابھی تک اس سلسلے میں کچھ دشواریاں ہیں' جنہیں دور کرنا موجودہ جمہوری حکومت کا فرض ہے!"

"اگر ممکن ہے تو اپنے مستقبل کے عزائم کے بارے میں کچھ بتائیے!"

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں برٹش پاسپورٹ ہولڈر ہوں' پاکستان میں اپنے کاروبار کی دیکھ بھال اور ملکی سیاست سے خود کو وابستہ رکھنے کے لیے یہاں آتا جاتا رہتا ہوں' میری دو بیٹیاں سوئٹزرلینڈ میں ہیں.....۔"

"ان میں سے ایک نے تو گزشتہ دنوں ایک برہمن سے شادی کی ہے۔ اخبار میں خبر شائع ہوئی تھی کہ آپ اس شادی میں شریک بھی ہوئے تھے!"

"جی ہاں میں نے اسے بہت منع کیا تھا کہ پاکستان کے لوگ بڑے تنگ نظر ہیں' یہ کام نہ کرو مگر آپ کو پتہ ہے وہاں فرد کی آزادی کتنی اہم ہے۔"

"کیا اس سے آپ کی وزارت خطرے میں نہیں پڑ گئی کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک بھارتی برہمن کے سسر کو پاکستان میں وزیر

نہیں بنایا جا سکتا۔"

"آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں' یہ سب تنگ نظریاں نچلی لیول پر ہوتی ہیں اوپر کی سطح پر سب ایک دوسرے کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ آپ لوگ جو اخبار میں آٹھ آٹھ کالم کی دو دو تصویری پٹیاں سب سے اوپر شائع کرتے ہیں جس کا تعلق کسی بڑے آدمی کی بیٹی یا بیٹے کی شادی سے ہوتا ہے۔ اس کے شرکا سیاست میں ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہیں مگر ان کے مفادات اور کلچر ایک ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے میں مشیر بھی بنوں گا اور اس کے بعد ایک اہم وزارت بھی مجھے ملے گی!"

"خیر میرا سوال تو درمیان میں ہی رہ گیا آپ مستقبل کے عزائم کے بارے میں بتا رہے تھے!"

"بس مستقبل کے عزائم یہی ہیں کہ بیٹے بیٹیوں کی شادی سے فراغت کے بعد مستقل پاکستان آ جاؤں گا۔ ..."

"تو کیا آپ برطانوی شہریت چھوڑ دیں گے... ؟"

"یہ کیا آپ میری برطانوی شہریت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس ملک میں کم از کم بیس ایسے ہیں جن کے پاس بظاہر پاکستان کا پاسپورٹ ہے مگر درحقیقت وہ امریکی' برطانوی' بھارتی' سعودی' عراقی اور لیبین ہیں۔"

"یہ تو آپ صحیح کہتے ہیں مگر اس مسئلے پر ہم تفصیل سے پھر بات کریں گے بلکہ مجھے آپ کی رہنمائی بھی حاصل کرنا ہے۔ تاہم اس وقت میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں' ایک صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں!"

"میں جانتا ہوں جو صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں' میں نے بھی انہی کی طرف جانا ہے مگر وہ اپنے سفارت خانے میں نہیں ہیں' اپنے گھر پر ہیں۔ چلئے دونوں ان کے گھر چلتے ہیں' آپس میں کیا پردہ!"

◆◆◆

دنیا کی ''بدمعاش'' حکومتیں!

کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اس کا تعین کرتے ہوئے اصولوں وغیرہ کی جو بات کی جاتی ہے' اس کی حیثیت مذاق سے زیادہ نہیں ہوتی' دنیا کا ہر ملک کسی دوسرے ملک سے دوستی یا دشمنی کا تعلق استوار کرتے ہوئے صرف ایک ''اصول'' مدنظر رکھتا ہے اور یہ ''اصول'' اس ملک کے قومی مفادات ہوتے ہیں۔ بظاہر دیکھا جائے تو یہ ''اصول'' خاصی ''بے اصولی'' پر مبنی ہے لیکن اسی چیز کو ایک اور زاویئے سے دیکھا جا سکتا ہے' وہ زاویہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ملک کسی دس نمبری بدمعاش سے کم نہیں' جس چیز کو ڈپلومیسی کا نام دیا جاتا ہے اور جس کی کامیابی پر ڈپلومیٹس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے' اس کا ترجمہ اگر ''سیدھی'' اردو میں کیا جائے تو اس ڈپلومیسی کو دھوکے' فریب اور عیاری کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا اور یوں دیکھا جائے تو اعلیٰ قدروں کی دہائی اور بڑے بڑے نظریاتی دعوؤں کے باوجود ڈپلومیسی بہرحال دوسروں کو بیوقوف بنانے کا ہی نام ہے۔ علاوہ ازیں دنیا کے ہر ملک میں حکومت کی مکمل سرپرستی میں ایسے ادارے قائم ہیں جو ہر وہ انسانیت دشمن کام کرتے ہیں جو ان کے ملک کے مفاد میں ہوتا ہے مثلاً امریکہ میں سی آئی اے ہے' روس میں کے جی بی ہے' بھارت میں را ہے' افغانستان نے حاد تشکیل کر رکھی ہے' غرضیکہ سبھی ممالک میں اس نوع کے ادارے موجود ہیں جو سینماؤں میں بم رکھتے ہیں' اہم شخصیات کو قتل کرتے ہیں' دشمن ملک میں مختلف لسانی گروہوں کو ایک دوسرے سے بھڑانے کے لیے دونوں فریقوں کو اسلحہ فراہم کرتے ہیں' مذہبی نفرت کو ہوا دیتے ہیں اور ہر وہ گھٹیا سے گھٹیا کام کرتے ہیں جس کا نتیجہ ان کے قومی مفاد کی صورت میں نکل سکتا ہو۔ بس اتنا ہے کہ ان بدمعاش ملکوں نے صحافیوں' دانشوروں اور سیاستدانوں میں اپنے اپنے پبلک ریلیشن افسر مقرر کئے ہوئے ہیں جو اپنی باس حکومت کو شریف اور بھلے مانس ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں' تاہم میرے نزدیک دنیا کی تمام حکومتیں بدمعاش حکومتیں ہیں چنانچہ ''کامیاب خارجہ پالیسی'' بہرحال ان بدمعاشوں میں سے اپنے پسند کے بدمعاش منتخب کرنے کا نام ہے' ایسے بدمعاش جو مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دے سکیں۔

کیسی کڑوی بات ہے جو میں نے کی ہے! لیکن آپ کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی کا تجزیہ کر کے دیکھ لیں' ندرے بات یہی نکلے گی تاہم جہاں تک پاکستانی عوام کا تعلق ہے' وہ اس معاملے میں خاصے سادہ لوح واقع ہوئے ہیں چنانچہ دنیا کے کسی بھی خطے میں جب ''حق'' اور ''باطل'' کا معرکہ درپیش آتا ہے تو ہمارے عوام اپنے قومی مفادات کی پرواہ کیے بغیر ہمیشہ ''حق'' کا ساتھ دینے کے لیے

مظاہرے کرتے ہیں۔ حالیہ خلیجی جنگ کے دوران اسلام آباد میں سابقہ یا موجودہ وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان نے اخبار نویسوں کو بریفنگ کے لیے مدعو کیا تو صاحبزادہ صاحب نے دلائل و براہین کے ڈھیر لگا دیے کہ پاکستان نے سعودی عرب میں اپنی افواج اپنی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصولوں کے تحت بھیجی ہیں' لیکن جب اخبار نویسوں نے انہیں مختلف اطراف سے گھیرے میں لے لیا تو صاحبزادہ صاحب نے بزبان حال فرمایا کہ سارے اصولوں کی ایسی کی تیسی' ہم تو وہی کریں گے جس میں پاکستان کا مفاد ہو' ہمارے اخبار نویس دوست بھی یہ بات سمجھتے تھے کہ ایک بدمعاش ملک نے جگا ٹیکس نہ ملنے کی وجہ سے ایک کمزور سے ملک پر قبضہ کر لیا ہے اور دوسرے بدمعاش کو یہ بات ناگوار گزری کہ اس کے علاقے میں کوئی دوسرا بدمعاش داخل ہو کہ اس سے اس کی بین الاقوامی دہشت میں کمی واقع ہوتی تھی' بہرحال اس جنگ میں بڑے بدمعاش کی جیت ہوئی' چھوٹا بدمعاش لاہور کا مخصوص کردار پھنے خان ثابت ہوا جو کرتے کے دامن سے ہوا لیتے ہوئے نیفے میں اڑسے چاقو کی محض جھلک دکھاتا ہے' اسے کبھی استعمال نہیں کرتا'

گذشتہ دنوں نذیر ناجی نے بھارت اور اسرائیل کے حوالے سے ایک کالم لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ اپنے قومی مفادات کے مطابق ہمیں ان کو دشمنوں کو بھی بیک وقت للکارنے کی بجائے زوردار جھٹکے سے "یرکانے" کی بجائے اپنی دشمنی کی ترجیحات اپنے قومی مفادات کے مطابق متعین کرنی چاہئیں۔ میں نذیر ناجی سے اتفاق کرتا ہوں چنانچہ میرے خیال میں دنیا کی بدمعاش حکومتوں میں سے ہمیں جہاں اپنے بدمعاش دوستوں کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا ہے وہاں بدمعاش دشمنوں سے نمٹنے کے لیے بھی جو پالیسی تیار کی جائے وہ ہمارے قومی مفادات کے مطابق ہونی چاہیے۔ یہ بڑی دردناک صورتحال ہے کہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو مدنظر رکھنے کی بجائے خارجہ پالیسی "دوست" اور "دشمن" بدمعاشوں کے حوالے سے مرتب کی جائے لیکن جب تک یو۔این۔او سلامتی کونسل اور سپر پاورز جنگل کے قانون پر عمل پیرا ہیں' ہمیں اپنے قومی مفادات اور قومی سلامتی کی حفاظت خود کرنا ہوگی! بدمعاش دوست بھی سوچ سمجھ کر بنانا ہوں گے اور بدمعاش دشمنوں سے دشمنی بھی سوچ سمجھ کر کرنا ہوگی۔

◆◆◆

ضرورت رشتہ!

ضرورت تو ہر انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ خصوصاً ضرورت رشتہ کی اہمیت سے تو انکار ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شریف آدمی ضرورت مند بھی ہو ضرورت رشتہ کا قائل ضرور ہوتا ہے بلکہ بہت سے شرفاء تو اخبار کی ہیڈ لائن بعد میں پڑھتے ہیں 'ضرورت رشتہ' کے اشتہار پہلے ڈھونڈتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ہیڈ لائن میں رشتے توڑنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ایک بزرگوار کو ہم جانتے ہیں جو روزانہ اخبار سامنے پھیلا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ موٹے شیشوں والی عینک ناک پر جماتے ہیں اور بڑی انہماک کے ساتھ ان اشتہارات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم نے ایک دن کہا بزرگو! آپ یہ اشتہارات اتنی رغبت کے ساتھ کیوں پڑھتے ہیں؟ بولے عزیزم! آپ نے بہت احمقانہ سوال پوچھا ہے ہم نے عرض کیا وہ کیسے؟ کہنے لگے آپ سیاستدان ہیں؟ ہم نے کہا نہیں۔ فرمایا پھر سیاسی خبریں کیوں پڑھتے ہیں؟ ہم لاجواب ہو گئے۔ پھر انہوں نے پوچھا آپ کھلاڑی ہیں؟ ہم نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے سوال دہرایا کہ پھر کھیلوں کی خبریں کیوں پڑھتے ہیں؟ ان کی باتوں سے ہم نے اندازہ لگایا کہ اگرچہ وہ کھلاڑی نہیں لیکن انہیں کھیلوں سے دلچسپی ضرور ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہیں رشتے کی ضرورت نہیں یا امید نہیں لیکن ضرورت رشتہ کے اشتہار پڑھنا ان کی اکیڈمک ضرورت ہے۔ ہمیں خدشہ ہے کہ ایک دن وہ اس میں سے اکیڈمک والی بات سے کہیں انکار ہی نہ کر دیں۔

ضرورت رشتہ کے اشتہار صرف بعض بزرگوں ہی میں مقبول نہیں بلکہ ان اشتہاروں کا حلقہ مطالعہ بے روزگار نوجوانوں تک پھیلا ہوا ہے بلکہ ان دنوں تو بیشتر نوجوان اخباروں میں نوکریوں کے اشتہارات دیکھنے کے بجائے رشتوں کے اشتہارات دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ صوبے میں نوکری وزیر اعلیٰ نے اور مرکز میں وزیر اعظم نے دینا ہوتی ہے جس کے حصول کے لیے پاکستان کا شہری ہونا کافی نہیں۔ حکمرانوں تک رسائی ضروری ہے۔ اس کے بجائے جو والدین یا میرج بیورو والے شادی کے اشتہارات اخبار میں چھپواتے ہیں ان کی رسائی ڈاک کے ایک لفافے یا رجسٹریشن فیس کی ادائیگی سے ممکن ہو جاتی ہے اور بعض اوقات پھٹکڑی لگے بغیر رنگ بھی چوکھا آتا ہے۔ مثلاً بے روزگار نوجوانوں کے لیے آج ہی کے اخبار میں تین بہترین "نوکریوں" کے اشتہارات شائع ہوئے ہیں۔ یہ ملاحظہ فرمائیں۔

"بزنس مین کی 23 سالہ خوب صورت کنواری' دونوں کانوں میں پیدائشی نقص' لڑکی کے نام کوٹھی' لڑکے کو کاروبار کے لئے نقد دس

لاکھوں کی رقم، شریف شہری دیہاتی کنوارے رنڈوے دوسری شادی والے فوری لکھیں۔"

"کروڑ پتی زمیندار کی 25 سالہ بیٹی، خاندانی ناچاقی کی وجہ سے رخصتی سے قبل طلاق، لڑکی کے نام چھ مربعہ اراضی فیکٹری و کوٹھی، لڑکے کو کاروبار کے لیے 20 لاکھ روپے دیں گے۔ رشتہ جلد سے جلد طے!"

"فیکٹری اونر کی 27 سالہ بیٹی، نظر معمولی کمزور، لڑکی کے نام بنگلہ گاڑی، لڑکے کو کاروبار کے لیے 25 لاکھ روپے دیں گے۔"

اب آپ ہی بتائیں بے روزگار، کنواروں، رنڈووں اور دوسری شادی کے "مستحق" افراد کے لیے بہترین ازدواجی زندگی نہ سہی، بہترین خوشحال زندگی گزارنے کے اچھے سنہری مواقع "دونوکیاں کی نوکری" میں کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ میرج بیورو والے سنہری خواب دیکھنے والوں کو یہ سبز باغ محض رجسٹریشن فیس کے نام پر لاکھوں روپے بٹورنے کے لیے دکھاتے ہیں کہ آخر وہ بھی تو خوشحال زندگی گزارنا چاہتے ہیں!

ویسے جن اشتہاروں کا ذکر ہم نے اوپر کی سطور میں کیا ہے، وہ ضرورت رشتہ کے کم اور سرمایہ کاری کے اشتہارات زیادہ نظر آتے ہیں۔ ایک "پارٹی" دس لاکھ روپیہ انویسٹ کرنے پر تیار ہے، دوسری "پارٹی" بیس لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی پیشکش کر رہی ہے اور تیسری "پارٹی" نے پچیس لاکھ کی "بولی" لگا دی ہے۔ ان سب کے ساتھ زمینیں اور فیکٹریاں علیحدہ ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک جاپانی صنعت کار نے پاکستان کے حالات کو سرمایہ کاری کے لیے غیر موزوں قرار دیا تھا۔ اس نے غالباً یہ اشتہارات نہیں دیکھے تھے، جن میں سرمایہ کاری کے لیے سرے سے کوئی شرط ہی عائد نہیں کی گئی بلکہ رنڈوے، دوسری شادی کے خواہشمند، شہری دیہاتی سب کو ایک نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اسی طرح ان اشتہاروں سے یہ اندازہ تو ہوتا ہے کہ ایک دوشیزہ کی نظر کمزور ہے، دوسری بہری ہے، تیسری مطلقہ ہے تاہم جنہیں شادی کے لئے راغب کیا جا رہا ہے، ان کی کسی "کمزوری" کو درخواست دینے کے لیے نااہلی کے زمرے میں نہیں رکھا گیا۔ گویا درخواست دہندہ کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کی دو آنکھیں ہوں، دو کان ہوں، دو بازو ہوں، دو ٹانگیں ہوں اور ایک ناک ہو۔ بلکہ سچ پوچھیں تو ہمیں لگتا ہے کہ درخواست دہندہ کی ناک کا ہونا اس کے لیے ڈس کوالیفیکیشن ہے۔ یوں ضرورت رشتہ کے یہ اشتہارات ہمیں ضرورت رشتہ کے اشتہارات نہیں، بلکہ اس مہم کا حصہ لگتے ہیں جو قوم کو بے غیرت بنانے کے لیے چلائی جا رہی ہے اور جس کے نتیجے میں نہایت مضبوط رشتے نہایت آسانی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ خدا جانے رشتوں کو جوڑنے والے ضرورت رشتہ کے اشتہارات کب شائع ہوں گے؟

ہنسنے والا بوڑھا!

کراچی ائرپورٹ پر ایک دوست نے ایک بوڑھے شخص کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ ہنسنے والا بوڑھا ہے" میں نے حیران ہو کر پوچھا "کیا مطلب؟" دوست نے کہا اس کے سامنے اگر کوئی ہنسے تو جواب میں یہ بوڑھا بھی ہنسنا شروع کر دیتا ہے اور پھر اس کی ہنسی رکتی ہی نہیں! میں نے غور سے اس بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کی سفید لمبی داڑھی تھی' پوپلے منہ میں صرف دو دانت تھے جو منہ کھولنے پر باہر کی طرف جھانکنے لگتے تھے۔ یہ بزرگ صورت انسان دیکھنے میں بہت سنجیدہ لگتا تھا' اس نے سفید وردی پہنی ہوئی تھی' وہ غالباً سول ایوی ایشن میں ملازم تھا۔ اتنے میں میرا دوست اس کی طرف بڑھا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر اسے میرے پاس لے آیا۔

"صاحب! خدا کے لیے آپ ہنسا نہیں" بوڑھے نے میری طرف دیکھتے ہوئے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔

اس کی اس بات پر بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ جس پر بوڑھا کھلکھلا کر ہنس پڑا' اس کے اس بے ساختہ ہنسنے پر میری ہنسی تیز ہو گئی۔ مجھے اس طرح ہنستے دیکھ کر بوڑھے نے پیٹ پکڑ کر ہنسنا شروع کر دیا۔ اب میرے لئے اپنی ہنسی کو تہذیب کی حدوں میں رکھنا مشکل ہو گیا تھا' چنانچہ میری ہنسی بھی تقریباً چیخوں میں تبدیل ہو گئی۔ اس پر بوڑھا ہنستے ہنستے فرش پر لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر قہقہوں کے درمیان رک رک کر منت سماجت میں مشغول ہو گیا۔ "خدا کے لیے بس کریں بابو جی' خدا کے لئے ہنسنا بند کریں' نہیں تو ہنستے ہنستے میرا دم نکل جائے گا۔" اس صورتحال پر میرے لیے ہنسی روکنا ممکن نہیں تھا' چنانچہ میں بوڑھے سے کافی فاصلے پر منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا تاکہ اسے میرا ہنستا ہوا چہرہ نظر نہ آئے۔ تھوڑی دیر بعد میری ہنسی ویسے ہی تھم گئی۔ اس دوران بوڑھا کپڑے جھاڑ کر فرش سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ ایک دفعہ پھر بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔ میں نے رخصت ہوتے وقت بوڑھے سے ہاتھ ملایا اور کہا "بابا جی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی' شکر ہے اس دور میں کوئی ہنسنے والا تو ملا۔" بوڑھے نے جواباً بہت گرم جوشی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور میں اسے تھپکی دے کر اپنے دوست کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

"یہ ہنسنے والا بوڑھا تمہیں کیسا لگا؟" دوست نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھا' اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔"

"مگر یہ ہنسنا اس کے لیے عذاب بن کر رہ گیا ہے۔ لوگ محض اسے ہنسانے کے لیے اس کے سامنے آ کر ہنسنا شروع کر دیتے

لگ۔"

"پھر؟"

"پھر یہ ہنستا چلا جاتا ہے۔ خدا خدا کر کے اس کی ہنسی تھمتی ہے تو کوئی دوست اسے ہنسانے چلا آتا ہے اور یوں یہ بے چارہ سارا دن بس اسی کام میں لگا رہتا ہے۔"

"پھر تو واقعی یہ شخص پرابلم میں ہے۔ اسے سنجیدہ کرنے کے لئے تم نے کچھ سوچا؟"

"نہیں! تم ہی کوئی حل بتاؤ!"

"اسے کہو جلے بھنے لوگوں کی صحبت میں رہا کرے۔ افسروں وغیرہ کے ساتھ اٹھا بیٹھا کرے۔"

"ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو خیر کیا ہے کہ غریب آدمی ہے مگر رہتا انہی افسروں کی صحبت میں ہے۔ سارا دن ان کی جھاڑیں کھاتا ہے اور ہنستا رہتا ہے۔"

"اسے سنجیدہ کرنے کا ایک طریقہ میرے ذہن میں آیا ہے" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی آ جائے۔"

"بڑا ڈھیٹ ہا ہے" دوست نے ہنستے ہوئے کہا "یہ اپنی محبت کے قصے سناتا ہے تو ہنس ہنس کر دہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ کیا نادانی کے دن تھے!"

"اچھا۔ تو پھر یوں کرو اسے کسی فائل کے چکر میں ڈال دو۔ دفتروں کے پھیرے لگے تو ساری عمر کے لیے ہنسنا بھول جائے گا۔"

"یہ اس چکر میں رو ہی نہیں سکتا۔ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ ہوتا تو اس طرح ہنستا؟"

"اس کے ہاں ٹیلی فون لگوا دو ہر مہینے جب غلط بل آئے گا تو میں دیکھوں گا کہ کیسے ہنستا ہے؟"

"یار کوئی کام کی بات کرو وہ پاگل ہے جو اپنی پرسکون زندگی میں بیٹھے بٹھائے زہر گھولے گا؟"

"اچھا تو پھر یوں کرو اس کی دوسری شادی کرا دو"

"پھر وہی بچوں والی بات میرے یار اس نے تو ابھی پہلی شادی نہیں کی۔ کیا تمہیں اس کے قہقہوں سے اندازہ نہیں ہوا؟"

"ہاں کچھ ہوا تو تھا میں سمجھا ممکن ہے طلاق ہو گئی ہو"

"لگتا ہے تمہارے پاس اس ہنسنے والے بوڑھے کو غمزدہ کرنے کے لیے مزید کوئی تجویز نہیں رہی؟"

"ہے" مگر یہ آخری ہے۔ تم آزما کر دیکھنا' مجھے یقین ہے اس کے بعد ہمارے معاشرے کے ہر فرد کی طرح اس کے چہرے سے بھی مسکراہٹ غائب ہو جائے گی۔"

"وہ کیسے؟" دوست نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ صبح صبح اس کے سامنے اخبار رکھ دیا کرو' اگر یہ خود پڑھ سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے سرخیاں پڑھ کر سناؤ۔ جب یہ روزانہ نہ رمنہ اتنی ڈھیر ساری دل دہلا دینے والی خبریں سنے گا تو اس کی سات پشتوں کے چہرے پر بھی کوئی ہنسی آ جائے تو تم میرا نام بدل دینا"

"بہت موثر تجویز ہے" دوست نے کہا" مگر بہت ظالمانہ ہے۔ اگر ہمارے ماحول سے ہنسی بالکل غائب ہو گئی تو لوگ آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ میرے خیال میں اس بوڑھے کو اسی طرح ہنسنے دو' اس کی وجہ سے ارد گرد کی فضاؤں میں مسکراہٹوں کے کتنے ہی گلاب کھلتے ہیں۔ بلکہ اس شخص سے اتنا ہنسنے کی وجہ بھی نہیں پوچھنی چاہیے' کیا پتہ اس ہنسی کے لئے اس نے غم کے کتنے سمندر عبور کیے ہیں؟"

◆◆◆

چنگا پریس اور وزیر اعظم کی گفٹ سکیم!

"مائی سن تم نے وزیر اعظم کی روزگار سکیم کے بارے میں اخبارات میں پڑھا ہے؟"

"یس پاپا!"

"کیا خیال ہے تمہارا؟"

"اچھی سکیم ہے پاپا بے چارے غریب نوجوانوں کو روزگار مل جائے گا"

"اس میں غریب کی شرط نہیں ہے سن بلکہ واحد کوالیفیکیشن قرضے کے لئے امیدوار ہونا ہے چنانچہ ایم پی ایز ایم این ایز کے بچے بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور تم تو بے روزگار بھی ہو مائی سن"

"پاپا میں بے روزگار کہاں ہوں میں سیر گیمبرنگ کر رہا ہوں"

"یس مائی سن! یہ سکیم تم جیسے ذہین نوجوانوں ہی کے لیے ہے آج ہی قرضے کے لیے اپلائی کر دو!"

"میں نے قرضے کا کیا کرنا ہے پاپا؟"

"تنگ کر والا گئی ہے مائی سن! کئی دنوں سے تم پیچھے پڑے ہوئے تھے باقی جتنے پیسوں کی ضرورت پڑے گی وہ میں ڈال دوں گا!"

"رائٹ پاپا!"

"اوئے منے! تمہیں ایک لاکھ روپے مل جائیں تو کیا کرے گا؟"

"کالے کبوتر خریدوں گا استاد جی!"

"اوئے حمقی آدمی! ایک لاکھ کے کبوتر خریدے گا؟"

"ایک ٹی وی اور ایک وی سی آر بھی خریدوں گا استاد جی!"

"یہ تو صرف بیس ہزار ہوئے باقی ستر ہزار روپوں کا کیا کرو گے؟"

"اپنی شادی کراؤں گا استاد جی!"

''ستر ہزار روپے میں تو دو بندوں کی شادی ہو سکتی ہے کاکے منھے!''

''وہی کرالوں گا استاد جی!''

''تو بڑا بے شرم ہے بہر حال یہ لے فارم اور جا قرضے کے لئے اپلائی کر دے''

''کون سے قرضے کے لئے استاد جی؟''

''اوئے بے وقوف وزیر اعظم نے بے روزگار نوجوانوں کے لئے قرضہ سکیم شروع کی ہے۔''

''مگر میں تو بے روزگار نہیں ہوں استاد جی ڈیڑھ سو روپے دیہاڑی کماتا ہوں!''

''تبھی آج تک رنگین ٹی وی اور وی سی آر نہیں خرید سکا بس زیادہ بڑھکیں نہ مار اور آج ہی قرضے کے لیے درخواست دے''

''مگر استاد جی یہ قرض تو واپس بھی کرنا پڑے گا میں کہاں واپس کرتا پھروں گا؟''

''کاکے منھے یہ جو قرض ہے نا یہ قرض حسنہ ہے اور قرض حسنہ وہ ہوتا ہے جو واپس مانگا جائے تو آگے سے ہنس کر کہہ دیا جائے!''

''آپ کو کیسے پتہ ہے؟''

''جو لوگ بنک گارنٹی پر کروڑوں روپے کا قرض لیتے رہے ہیں وہ آج تک واپس نہیں ہوا یہ قرض تو ویسے ہی شخصی ضمانت پر مل رہا ہے۔ یوں بھی ہمارے وزیر اعظم صاحب نے اسے نوجوانوں کے لیے ''عید گفٹ'' کا نام دیا ہے''

''واقعی استاد جی؟''

''ہاں کاکے منھے اخباروں میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ قرضے پانچ سال میں واپس کرنا ہے اور کاکے منھے اس سے پہلے الیکشن آ جائے ہیں چنانچہ کسی انتخابی جلسے میں اس قرضے کی عام معافی کا اعلان ہو گا اور یہ عوام کے لئے ''الیکشن گفٹ'' ہو گا!''

''آپ نے تو بڑی ''سائنس'' پڑھائی ہے آج میں آپ کو استاد مان گیا ہوں استاد جی!''

''سیدھا یہ چالیس بے روزگار مسافر ہیں!''

''ٹھیک ہے یہ سب لوگ ایک لائن میں کھڑے ہو جائیں اور ایک ایک کر کے ان درخواستوں پر انگوٹھا لگاتے جائیں!''

''لگ گئے انگوٹھے؟ انہیں انگوٹھے لگانے کی فیس ادا کرو اور کمرے سے باہر نکال دو!''

''بس ٹھیک ہے یہ قرضے کی چالیس درخواستیں ان کی گارنٹی کا انتظام کرو اور صبح جمع کرا دو۔''

''واہ سیدھا بن گیا بیٹھے بیٹھے دو کروڑ کا قرضہ حاصل کر لیا آپ نے جو پہلے قرضے واپس نہیں کئے تھے اس سے اخباری سکینڈل بنا

تھا' اس قرضے کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔ ویسے بھی یہ سکیم ان فقیروں کے کام کی نہیں انہیں کوئی پچاس روپے ادھار نہیں دیتا' ان کی پچاس ہزار کی ضمانت کس لے دیتی ہے؟"

"یار بشیر آج کل تم ملتے ہی نہیں؟"

"پریس میں کام بہت زیادہ ہو گیا ہے' صبح تو بچے جاتا ہوں' رات بارہ بجے پریس سے واپس آتا ہوں۔"

"ان دنوں تو الیکشن بھی نہیں ہے کہ اشتہاروں کی چھپائی کا کام آیا ہو پریس میں تمہارا اوور ٹائم کیوں لگ رہا ہے؟"

"کرنسی نوٹ؟ وہ تو شاید پاکستان منٹ میں چھپتے ہیں اور تم پنگا پریس میں کام کرتے ہو!"

"میں تو پنگا پریس ہی میں کام کرتا ہوں' دراصل نوٹ اتنی بھاری تعداد میں چھپنے کے لیے دیئے گئے ہیں کہ پاکستان منٹ والے یہ کام مقررہ مدت پر ختم نہیں کر سکتے چنانچہ انہوں نے کچھ کام ہمیں بھی دے دیا ہے۔"

"لیکن حکومت کو اتنے نوٹ شائع کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟"

"وزیر اعظم نے نوجوانوں کے لیے جس گفٹ سکیم کا اعلان کیا ہے' اس کے لئے اربوں روپے درکار ہیں اور خزانے کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہ خالی ہے!"

"مگر یار کرنسی نوٹ تو بہت احتیاط سے چھاپے جاتے ہیں' تمہارے پریس میں جو نوٹ شائع ہوں گے وہ بالکل کاغذ کے ٹکڑے نہیں لگے گے؟"

"بالکل لگیں گے لیکن جب خزانہ خالی ہو اور نوٹ دھڑا دھڑ چھپتے چلے جائیں تو سنا ہے کہ پاکستان منٹ میں شائع ہونے والے نوٹ بھی کاغذ کے ٹکڑے ہی ہوتے ہیں!"

◆◆◆

مجنوں کھڑے ہیں خیمہ لیلیٰ کے سامنے!

ایک مقامی اخبار نے صفحہ اول پر بہت کمال کی تصویر دکھائی ہے۔ صبح صبح یہ تصویر دیکھ کر طبیعت نہال ہوگئی ہے۔ اس تین کالمی تصویر میں صدر غلام اسحاق' وزیراعظم نواز شریف' گورنر پنجاب میاں محمد اظہر اور سپیکر پنجاب اسمبلی میاں منظور وٹو ایک قطار میں کھڑے ہیں اور چیف آف آرمی سٹاف ان سے ہاتھ ملاتے ملاتے آخر میں میاں منظور وٹو تک پہنچے ہیں' میاں صاحب مصافحے کے لئے ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہیں' جنرل صاحب کا ہاتھ بھی ان کی طرف بڑھ رہا ہے مگر وہ گفتگو غالباً وزیراعظم سے کر رہے ہیں' اس تصویر کی خاص بات یہ ہے کہ صدر' وزیراعظم' گورنر اور سپیکر پلک جھپکائے بغیر پوری توجہ سے جنرل صاحب کی طرف متوجہ ہیں۔ تصویر کے نیچے لکھا ہے۔ ''لیفٹیننٹ جنرل چودھری سردار علی کے صاحبزادے کی دعوت ولیمہ میں صدر غلام اسحاق خان' وزیراعظم نواز شریف اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز بات چیت کرتے ہوئے۔ گورنر پنجاب میاں اظہر اور سپیکر منظور وٹو بھی ساتھ کھڑے ہیں۔'' جب کہ یہ تصویر اگر کوئی غیر ملکی دیکھے تو وہ جنرل آصف نواز کی پرسنیلٹی اور تصویر میں ان کا ''محل وقوع'' دیکھ کر سمجھے کہ شاید کسی دوست ملک کا سربراہ گارڈ آف آنر کے معائنے کے بعد مائکرین شہر سے ملاقات میں مشغول ہے!

یہ تصویر دیکھ کر میری طبیعت اگر نہال ہوئی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس میں ہمارے سیاستدانوں کے چہرے بہت واضح دیکھے جا سکتے ہیں' اس سے پہلے ہمیں جب کبھی انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے' انہیں ایک مربی کی صورت ہی میں دیکھا ہے' وہ کسی ضرورت مند کوئی وی کیمرے کے سامنے امدادی چیک دے رہے ہوتے ہیں تو اس مسکین کی ممنونیت ہمیں نظر آتی ہے' اس کا دعاؤں سے بھرا ہوا چہرہ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ اس کے مربی کے چہرے پر روشنی کے تاثرات ہوتے ہیں اور چونکہ ہمارے حکمران ہمہ وقت عوام ہی کے بارے میں سوچتے ہیں اور ان کی مدد کرنے میں لگے رہتے ہیں چنانچہ ہم لوگوں کو ان کا چہرہ ہمیشہ ایک مربی کا چہرہ ہی لگتا ہے' جب کہ اس تصویر میں صورت حال بدلی ہوئی ہے اور یوں میں عوام کے دلوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اس فوٹو گرافر کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس نے ہمیں معزز سوالیوں کی یہ تصویر بھی دکھائی!

طبیعت کے نہال ہونے کی ایک وجہ متوقع مارشل لاء کے بارے میں تمام خدشات کا دور ہو جانا بھی ہے۔ آپ یقین کریں کہ صرف یہ تصویر دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ مارشل لاء کے حوالے سے ہیر پھیر کی ساری پیش گوئیاں ڈرائنگ روم کی گپ شپ سے زیادہ

حیثیت نہیں رکھتیں۔ جہاں چیف آف آرمی سٹاف اور حکمرانوں کے درمیان اتنے خوشگوار تعلقات ہوں کہ پروٹوکول کو بھی اہمیت نہ دی جاتی ہو وہاں بھینس کا جھنجٹ پالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ویسے بھی جنرل صاحب کی ریپوٹیشن ایک سچے کھرے سپاہی کی ہے' ان کے دل میں کسی کو ایل بی ڈبلیو کرنے کی خواہش ہے اور نہ "بی ایم ڈبلیو" کی' جہاں تک ہمارے سیاستدانوں کا تعلق ہے اب وہ بھی جنرل صاحب کے مضبوط کردار کے قائل ہو چکے ہیں لیکن بقول شخصے احتیاط میں کیا حرج ہے؟

متذکرہ تصویر کے حوالے سے ایک اور خوشگوار پہلو جو میرے ذہن میں ابھرا ہے وہ صدر اور وزیراعظم کے مابین اختلافات کی افواہوں سے متعلق ہے' اگرچہ طرفین کے تردیدی بیانات میری نظروں سے گزرتے رہتے تھے لیکن دل کچھ مطمئن نہیں ہوتا تھا' اب الحمدللہ یہ خدشے بھی اس کی ایک تصویر نے ذہن سے دور کر دیئے ہیں۔ صدر غلام اسحاق خان اور وزیراعظم نواز شریف' جنرل آصف نواز کے سامنے کس انداز میں ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں اور جس طرح ہمہ تن گوش ہیں' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں سے نہ کوئی بندہ ہے' اور نہ بندہ نواز بلکہ معاملہ

بندہ و صاحب و محتاج و غنی یک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

والا ہے۔ جہاں محبت کا ایک اتنا مضبوط رشتہ موجود ہو وہاں اختلافات جنم لے ہی نہیں سکتے' چنانچہ جنہیں ہم اختلافات سمجھتے ہیں' وہ دراصل محض اتفاقات ہوتے ہیں۔

آخر میں یک ذرتے ذرتے بلکہ اس کے ساتھ کم از کم دس دفعہ "حاکم بدہن" کا اضافہ بھی کریں اور وہ یہ کہ اگر ملکی حالات اسی نہج پر چلتے رہے اور سیاستدان ہماری پالیسیاں صرف اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے بناتے رہے' جس سے انتشار میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو کوئی پتہ نہیں کل کلاں جنرل آصف نواز اپنے پیشروؤں کی تقلید میں "ملک و قوم کے بہترین مفاد میں" مارشل لاء نافذ کر دیں۔ متذکرہ تصویر کا کمال یہ ہے کہ اس صورت میں بھی یہ تصویر پوری طرح کارآمد ثابت ہوگی' صرف اس کی کیپشن تبدیل کرنا ہوگی' اور وہ کیپشن یہ ہوگی "صدر آصف نواز ائرپورٹ پر اپنی کابینہ کے ارکان سے ہاتھ ملاتے ہوئے!"

◆◆◆

ایک آسان کام!

حکومت کرنا بہت مشکل کام ہے اس لئے میں حکومت نہیں کرتا' حکومت کرنے کے لیے الیکشن کے دوران دس کروڑ عوام کی منگوی کرنا پڑتی ہے' ان سے ہاتھ ملانا پڑتا ہے' ان کی جھگیوں میں جانا پڑتا ہے اور ان کے ساتھ شوربے میں لقمہ ڈبو کر کھانا پڑتا ہے "وہابیوں" کے پیچھے نماز پڑھنا پڑتی ہے۔ مزاروں کو غسل دینا پڑتا ہے' مسلم لیگی بننا پڑتا ہے' بابائے خان کو حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ جاری کرنا پڑتا ہے' نواب حسین سے ملنے عزیز آباد جانا پڑتا ہے' جمیعت خاتم کا نامہ اعمال اپنے کھاتے میں ڈالنا پڑتا ہے' امریکہ کو آنکھیں دکھانا پڑتی ہیں' کبھی یہ آنکھیں جھکانا پڑتی ہیں' جرنیلوں کو سلیوٹ مارنا پڑتا ہے آئی ایس آئی سے بنا کر رکھنا پڑتی ہے' صدر کو گرانا پڑتا ہے' کبھی اسے منانا پڑتا ہے' جمہوریت کی بات کرنا پڑتی ہے' سود کو ناگزیر قرار دینا پڑتا ہے' غیروں کو نوازنا پڑتا ہے" بھوں کو ڈرانا پڑتا ہے' ایک سجدہ کرانے کے لئے سینکڑوں سجدے کرنا پڑتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں حکومت کرنا پسند نہیں کرتا!

یہی وجہ ہے کہ میں حکومت کرنے کی بجائے اخبار میں کالم لکھتا ہوں مگر کالم لکھنا بھی بہت مشکل کام ہے۔ لوگوں کو ایمانداری کا درس دینا پڑتا ہے اور اپنے بیٹے کو "ڈائرکٹ حوالدار" بھرتی کرانا پڑتا ہے۔ اپنے لکھے ہوئے ہر لفظ کو کیش کرانا پڑتا ہے اور "کیشنز" سے عزت کی توقع بھی کرنا پڑتی ہے' حکمرانوں کے علاوہ متوقع حکمرانوں سے بھی تعلقات رکھنا پڑتے ہیں' کسی کو جاتے دیکھ کر آنے والے کے استقبال کی تیاریاں کرنا پڑتی ہیں' جب کوئی آ جائے تو سابقہ کالموں میں سے کوئی ایک آدھ ایسا ٹکڑا تلاش کرنا پڑتا ہے جو "صفائی" کے کام آسکے' کرپٹ کے قاتل کا کردار بھی ادا کرنا پڑتا ہے اور حریت پسندی کا تاج بھی سر پر سجانا پڑتا ہے' ہوا اور وظیفے کو چھپانا پڑتا ہے اور خود کو شاہ کا مصاحب بھی مشہور کرنا پڑتا ہے' غرض کہ کالم نگاری بھی کوئی آسان کام نہیں۔

چنانچہ ان دنوں میں کوئی آسان کام کرنے کی سوچ رہا ہوں' مثلاً میرا ارادہ مسلم لیگ جائن کرنے کا ہے' میں نے ایک سو کے قریب بے روزگار نوجوانوں کو بھرتی کرنے کا پروگرام بنایا ہے' ان نوجوانوں کو میں نعرے بازی کی ٹریننگ دوں گا اور پھر جہاں صاحبان اقتدار کا جلسہ ہوگا اپنی اس فورس کے ساتھ وہاں پہنچ جاؤں گا۔ یہ زندہ باد کے نعرے صاحب جلسہ کے لئے اور ایک میرے لئے لگائیں گے' جس سے صاحب جلسہ کو میری قوت کا اندازہ ہوگا اور یہ بھی کہ ان کی ساری مقبولیت بھی میرے جیسے مقبول لیڈروں کی مرہون منت ہے۔ اس کے نتیجے میں مجھے صاحبان اقتدار کا قرب حاصل ہوگا اور سیاست دانوں کے پیارو گروپ میں

شامل ہو جاؤں گا' تاہم میں اپنی قوت کے اصل سرچشمہ یعنی نعرے باز بے روزگار نوجوانوں کو نہیں بھولوں گا بلکہ انہیں روزگار فراہم کرنے کے لیے ابتدائی سرمایہ اور تحفظ فراہم کروں گا جس سے وہ اپنے علاقے میں ہیروئن اور جوئے وغیرہ کے اڈے کھول سکیں اور یوں مسلم لیگ صحیح معنوں میں ایک عوامی جماعت بن سکے۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ کام بھی خاصا مشکل ہے کہ اس میں کمپیٹیشن بہت زیادہ ہے چنانچہ میرا ارادہ ہیرو کریٹ بننے کا ہے' اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس عمر میں ہیرو کریٹ بننے کے لئے میرے رستے میں کوئی قانونی بندش ہوگی' تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے' سارے قواعد وضوابط ایک جنبش قلم کی مار ہوتے ہیں۔ ہیرو کریٹ بننے کے بعد مرے جنبش قلم سے صاحبان اقتدار کے بھی کام کسی قواعد وضوابط کے بغیر ہوتے چلے جائیں گے' جس کے نتیجے میں میری عزت اور اقتدار میں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہوگی۔

مگر جب میں نے غور کیا تو' احساس ہوا کہ یہ کام بھی خاصا مشکل ہے مگر خدا بھلا کرے ایک صاحب کا جو میں اس کنفیوژن کے لمحے میں آن وارد ہوئے' پوچھنے لگے "کیا مسئلہ ہے؟" میں نے مسئلے کی تفصیل بیان کی تو انہوں نے کان میں اڑسی ہوئی بیڑی نکالی اور سلگانے کے بعد ایک لمبا سوٹا لگاتے ہوئے کہا "آپ یوں ہی پریشان ہوئے ہیں' یہ تو مسئلہ ہی نہیں' آپ لمبے چکروں میں پڑنے کی بجائے سیدھی طرح وہ کریں جو میں کر رہا ہوں' اللہ مشکل آسان کرے گا۔" میں نے کرسی اسی اعشی کے قریب سرکائی اور پوچھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ وہ اپنا منہ میرے کان کے قریب لایا اور سرگوشی کے انداز میں بولا" کچھ بھی نہیں' صرف اتنا کریں کہ مونچھیں رکھ لیں' کاندھوں پر پرنا ڈالیں' اور شام کو جہاں میں کھڑا ہوتا ہوں وہاں آپ بھی کھڑے ہو جایا کریں' میں ایک عرصے سے اس بازار میں لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں' اللہ عزت کی روٹی دیتا ہے اور ضمیر پر بوجھ بھی نہیں ہوتا کیونکہ جو ہوں' وہی نظر بھی تو آتا ہوں' یقین کریں جس طرح کام نگاری آپ کرتے ہیں اس سے یہ بہتر اور آسان کام ہے۔"

◆◆◆

ہم ''انجمن'' سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو!

یک مقامی اخبار میں اداکارہ انجمن کے حوالے سے ایک دلچسپ خبر شائع ہوئی جس کے مطابق اخبار کے نمائندے نے انجمن کو سٹوڈیو میں مصروف شوٹنگ پایا تو پوچھا کہ آپ نے تو اخبار کے ذریعے اعتکاف میں بیٹھنے کا اعلان کیا تھا لیکن آپ تو شوٹنگ میں مشغول ہیں یہ کیا معاملہ ہے؟ جس کے جواب میں انجمن نے کہا کہ میں تو اعتکاف میں بیٹھنا چاہتی تھی مگر فلمی مصروفیات نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اداکارہ انجمن نے فرمایا کہ حقوق اللہ سے حقوق العباد زیادہ اہم ہیں اور وہ فلموں میں کام کر کے حقوق العباد پورے کر رہی ہیں' انجمن نے کہا کہ ہو سکتا ہے وہ اگلے رمضان میں اعتکاف میں بیٹھیں!

اس ساری خبر میں' میں نے صرف لفظ ''فرمایا'' کا اضافہ کیا ہے اور یہ بھی صرف اس جگہ جہاں انجمن صاحبہ نے اعتکاف اور شوٹنگ میں سے شوٹنگ کو افضل عبادت قرار دیا ہے اور یوں خود کو متقی کے مقام پر فائز کر دیا ہے چنانچہ میرے لئے ممکن نہیں تھا کہ میں ''متقی صاحبہ'' کے ملفوظات کو ''کہا'' کے کھاتے میں ڈالنے کی گستاخی کروں لہٰذا میں نے دفورِ عقیدت میں ''فرمایا'' کا لفظ استعمال کیا' متذکرہ رپورٹر صاحب رواروی میں مناسب الفاظ کا استعمال نہیں کر سکے' مجھے یقین ہے کہ میرے توجہ دلانے پر اب وہ بھی دل میں نادم ہوں گے۔ بہرحال ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے' تاہم دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رپورٹروں کی اس فروگذاشت کو معاف فرما دیں!

جہاں تک انجمن صاحبہ کے حقوق العباد کا تعلق ہے میرے ایک دوست ریاض الرحمان ساغر کا کہنا ہے کہ انہوں نے واقعی اس ضمن میں بھی کوتاہی نہیں کی وہ وہ شادی سے پہلے اپنی والدہ اور اپنے بہن بھائیوں کی کفالت کا بوجھ اٹھاتی رہی ہیں' خود میں کچھ عرصہ سنسر بورڈ کے رکن کی حیثیت سے انجمن صاحبہ کی فلمیں پوری دلچسپی سے بلکہ ان کے موجودہ بیان کے حوالے سے' اگر اسلامی اصطلاح استعمال کی جائے تو پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دیکھ رہا ہوں' مجھ میں اتنا بھی اعتماد نہیں آیا کہ میں انجمن صاحبہ کی طرح پورے یقین سے یہ فتویٰ دے سکوں کہ وہ اپنی فلموں کے ذریعے حقوق العباد پورے کر رہی ہیں تاہم بہت محتاط لفظوں میں اس کی تصدیق ضرور کر سکتا ہوں کیونکہ جب وہ پردہ سکرین پر رقص کا مظاہرہ فرماتی ہیں تو تماشائی تو تماشائی خود سنسر بورڈ کے ارکان کے چہرے کھل اٹھتے ہیں اور وہ ان کا ایک ایک رقص کئی کئی دفعہ عینک لگا کر دیکھتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے ہر بار عربی کے کچھ کلمات بھی ادا کرتے

ہیں۔ اللہ کے بندوں کا دل قابو کرنا بھی میرے خیال میں حقوق العباد ہی کے زمرے میں آتا ہے بلکہ کہنے والوں نے تو "دل بدست آور" والے فعل کو "حج اکبر" کے برابر قرار دیا ہے اور بلھے شاہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ مندر ڈھا دو مسجد ڈھا دو اور اس کے علاوہ جو بھی چاہے ڈھا دو بس کسی کا دل نہ ڈھاؤ کہ خدا دل میں رہتا ہے! چنانچہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انجمن صاحب بارش میں جو مجیں فلم رہی ہیں اگرچہ وہ حقوق العباد کے زمرے ہی میں آتا ہے مگر تھوڑا بہت خیال حقوق العباد کے علاوہ حقوق اللہ کا بھی کرنا پڑتا ہے چنانچہ ہم سنسر بورڈ کے ارکان گرچہ بسا اوقات اس قسم کے سین پر قینچی چلا دیتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے ہمارے اپنے دلوں پر چھریاں چلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری یہ خطا معاف فرمائے!

ایک دوست نے مذکورہ خبر پڑھ کر کہا کہ انجمن نے حقوق العباد کی جو بات کی ہے وہ اپنی فلموں کے ناظرین کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنی فیملی کی کفالت کے حوالے سے کی ہے' مگر انجمن صاحبہ کے قریبی کی یہ تفسیر درست نہیں کیونکہ اب وہ ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں اور شادی کے بعد کفالت کی ذمہ داری بیوی پر نہیں شوہر پر عائد ہوتی ہے' باقی رہا والدہ اور بہن بھائیوں کا مسئلہ تو وہ اب خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے ہیں' نیز ایک اطلاع کے مطابق اب انجمن صاحبہ کے تعلقات ان کے ساتھ کچھ اتنے خوشگوار بھی نہیں ہیں کہ ان کی خاطر اعتکاف چھوڑ کر فلموں میں کام کرتی پھریں چنانچہ حقوق العباد سے ان کی مراد یقیناً ناظرین اور فلم سنسر بورڈ کے اراکین کو وہ "مسرت" فراہم کرنا ہے جس کا ایک قافیہ "حسرت" بھی ہے!

انجمن صاحبہ نے اپنے بیان میں ایک بات یہ بھی فرمائی ہے کہ ہو سکتا ہے وہ اگلے سال اعتکاف میں بیٹھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اعتکاف کے مقابلے میں اگرچہ فلم کو زیادہ اہم عبادت سمجھتی ہیں تاہم اعتکاف کی اہمیت سے وہ مکمل طور پر انکاری نہیں بلکہ وہ اسے بھی عبادت کا حصہ سمجھتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں والد ماجد کی لائبریری سے گاہے بگاہے استفادہ کیا کرتا تھا اور یوں دینی امور کے بارے میں مجھے کافی معلومات حاصل تھیں لیکن اب "حقوق العباد" والی مصروفیات کی وجہ سے دینی کتب کے مطالعے سے غافل ہوتا جا رہا ہوں چنانچہ صحیح طور پر یاد نہیں کہ خواتین اعتکاف اپنے گھر میں بیٹھتی ہیں یا انہیں مسجد میں بیٹھنے کی اجازت ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اعتکاف میں بیٹھیں تو مسجد کا انتخاب احتیاط سے کریں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے بادشاہی مسجد کا انتخاب کریں' ایک تو اس لیے کہ وہ اورنگ زیب نے تعمیر کرائی تھی جن کے خیالات فنون لطیفہ سے وابستہ لوگوں کے بارے میں کچھ اچھے نہیں تھے چنانچہ انجمن صاحبہ جب اس مسجد میں اعتکاف میں بیٹھیں گی تو اورنگ زیب عالمگیر کو اندازہ ہو گا کہ فنون لطیفہ سے وابستہ بھی لوگ مذہب بیزار نہیں ہوتے تو ان کی روح کو سکون ملے گا بلکہ میرے ایک دوست شیشے کے گلاس پر روحوں کو بلانے کا کام کرتے ہیں انہیں

رحمت دے کر اگر ورنگ زیب عالمگیر کی روح کو بلایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ انجمن صاحبہ نے قلم اور اعتکاف میں سے قلم کے افضل ہونے کا فتویٰ بھی دیا تھا تو وہ سوچ میں پڑ جائیں گے کہ اب وہ اپنے فتاویٰ عالمگیری کا کیا مصرف تلاش کریں؟ بہرحال بادشاہی مسجد کے انتخاب کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں حضرت مولانا عبدالقادر آزاد خطیب ہیں جو گریڈ بائیس کے عالم دین ہیں انہوں نے حال ہی میں لیڈی ڈیانا صاحبہ کو قبول اسلام کی دعوت دی تھی انجمن صاحبہ کو حضرت مولانا صاحب کی ذات بابرکات سے یہ فائدہ ہوگا کہ اعتکاف کے دوران اسلام کی تشریح و تعبیر کے ضمن میں غور و فکر کرتے ہوئے اگر کہیں انہیں کوئی الجھن درپیش ہوئی تو وہ حضرت مولانا سے فوراً استفادہ کر سکیں گی بلکہ خود انجمن صاحبہ نے اسلامی احکامات کے ضمن میں جس بصیرت کا ثبوت دیا ہے اس کے پیش نظر خود مولانا بھی ان سے استفادہ کر سکتے ہیں کہ علم کسی کی میراث نہیں بہرحال اگر اگلے برس انجمن صاحبہ کو قلمی معروفیت اجازت نہ دیں اور ان پر حقوق العباد کا کوئی بوجھ نہ ہو تو میری خواہش ہے کہ وہ اعتکاف میں ضرور بیٹھیں بلکہ مقررہ دنوں سے زیادہ دن اعتکاف میں بیٹھیں میں فتویٰ دیتا ہوں کہ اس طویل اعتکاف کی وجہ سے اگر ان کی ایک آدھ قلم مس بھی ہو گئی تو وہ اللہ کے حضور جواب دہ نہیں ہوں گی بلکہ ممکن ہے وہ ذات قلم مس ہونے کو بھی حقوق العباد کے کھاتے میں ڈال دے کہ بے شک یہ وہی ہے جو ہر بات کی حکمت سمجھنے والا ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

◆◆◆

جناب آپ کا اسم شریف!

مشتاق احمد یوسفی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہم نے غالب کو جب بھی پڑھا، وہ ہمیں ہر دفعہ نیا لگا" یہ بھید تو کافی عرصے بعد ہم پر کھلا کہ دراصل ہمارا حافظہ کمزور ہے۔" ان دنوں کچھ یہی حال میرا بھی ہے بلکہ میں اس ضمن میں یوسفی صاحب سے دو ہاتھ آگے ہوں کیونکہ مجھے ہر شخص غالب کی طرح نیا لگتا ہے اور اس کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ میں خوش اخلاق بہت ہو گیا ہوں' آپ مجھے یاد دلانا نہ بھولئے کہ آگے چل کر مجھے اس فقرے کی وضاحت کرنی ہے لیکن اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ہر شخص مجھے غالب کی طرح نیا کیوں لگتا ہے؟ دراصل ہوتا یوں ہے کہ کسی محفل میں کسی صاحب سے ملاقات ہوئی ہے' موصوف بہت تپاک سے ملتے ہیں' میں انہیں چہرے سے پہچان لیتا ہوں مگر ایک تو ان کا نام یاد نہیں رہتا اور دوسرے یہ کہ ان سے ملاقات کہاں ہوئی تھی؟ چنانچہ گفتگو کے دوران ایک تو میں ان کا نام نہیں لیتا کہ وہ مجھے آتا ہی نہیں اور دوسرے "پرانی شناسائی" کا ریفرنس درمیان میں نہیں آنے دیتا کہ وہ مجھے یاد ہی نہیں البتہ وہ اگر یہ حوالہ رضا کارانہ طور پر درمیان میں لے آئیں تو میں بہت خوش ہوتا ہوں اور دل ہی دل میں ان کی درازی عمر کے لیے دعائیں مانگتا ہوں' پھر مجھے ان کے نام کے بارے میں کھد بد ہونے لگتی ہے اور وہ لمحہ میرے لئے "نوید مسرت" کا ہوتا ہے جب کسی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے وہ صاحب اپنا نام درمیان میں لے آتے ہیں چنانچہ میں اطمینان کا گہرا سانس لیتا ہوں اور پھر ریلیکس ہو کر ان سے گفتگو کرتا ہوں۔

مگر اصل تشویشناک صورتحال تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی صاحب گفتگو کے دوران اچانک فرماتے ہیں کہ "لگتا ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں!" یہ سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں کہ اس راز کا انہیں کیسے پتہ چلا چنانچہ بھرم رکھنے کے لئے لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ "جناب کیسی باتیں کرتے ہیں' یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو نہ پہچانوں؟" یہ فقرہ کہتے ہوئے مجھے اندازہ نہیں ہوتا کہ میں نے کس "قوم" کو للکارا ہے؟ کیونکہ اس کے جواب میں وہ اپنی تمام تر اذیت پسندی چہرے پر جمع کر کے کہتے ہیں "تو پھر مجھے بتائیے میں کون ہوں؟" اس کے آگے جتنے بھی مرحلے آتے ہیں ڈکشنری میں ان کے لیے شرمندگی یا ندامت وغیرہ ہی کے الفاظ ملتے ہیں!

اعصاب شکن مرحلہ اس کے علاوہ ایک اور بھی ہے۔ یہ مرحلہ وہ ہے جسے مرحلہ دار و رسن بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایک صاحب بہت بے

تکلفی سے کاندھے پر دوہتڑ رسید کرتے ہیں لیکن میری سرد مہری پر وہ چونک جاتے ہیں "یار کہیں تم اپنے آپ کو بڑا آدمی تو نہیں سمجھنے لگ گئے' رے بھئی میں مشتاق ہوں جسے تم تاکا کہتے تھے۔ چوتھی جماعت میں ہم اکٹھے پڑھتے تھے" حالانکہ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ تین جماعتوں سے زیادہ نہیں پڑھے ہوں گے پھر وہ اپنی اور میری شرارتیں گنواتے ہیں جنہیں سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ میں بچپن میں کتنا شریر تھا مگر اس کے باوجود بہرحال مجھے یاد نہیں پڑتا کہ چوتھی جماعت میں ٹاٹ کے ایک سرے پر میں اور دوسرے سرے پر وہ بیٹھا کرتے تھے تاہم اپنے آپ کو اور انہیں ندامت سے بچانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان سے فوراً معانقہ کیا جائے اور کہا جائے "سوری یار پہچاننے میں ذرا دقت ہوئی' کیونکہ چوتھی جماعت میں تمہاری داڑھی سفید نہیں ہوتی تھی!"

اور خدا کا شکر ہے مجھے یاد آ گیا کہ حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے میں دن بدن خوش اخلاق کیوں ہوتا جا رہا ہوں' وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس سے ملنے والے کو شائبہ تک نہیں ہوتا کہ میں اسے پہچاننے میں دشواری محسوس کر رہا ہوں مگر اس میں ایک نقصان بھی ہے' مثلاً ایک صاحب کو میں خود آگے بڑھ کر بہت گرمجوشی سے ملا۔ وہ بھی کچھ اتنے ہی تپاک سے ملے مگر کچھ دیر بعد کہنے لگے "اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات عرض کروں؟" میں نے خوش اخلاقی اور بے تکلفی کو یکجا کرتے ہوئے کہا "یار یہ کیا تم نے آپ جناب لگائی ہوئی ہے' سیدھی طرح بات کرو!" کہنے لگے "مجھے یاد نہیں پڑتا آپ سے کہاں ملاقات ہوئی تھی' آپ کا اسم شریف؟ ویسے آپ چودھری غلام رسول تو نہیں ہیں؟"

◆◆◆

ہاتھی سوار محمود پیدل ایاز!

وہ بھی کیسے اچھے دن تھے جب رمضان المبارک میں ملک بھر کے ہوٹل بند ہوتے تھے اور باہر جلی حروف میں لکھا ہوتا تھا کہ "رمضان المبارک کے احترام میں ہوٹل بند ہے براہ کرم کھانا کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے تشریف لائیں" ان دنوں صورت حال مختلف ہے۔ آپ کو شہر بھر کے ہوٹل بند ملیں گے اور اس طرح کی کوئی عبارت بھی تحریری صورت میں نہیں ملے گی کہ کھانا کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے تشریف لائیں لیکن دنیا کے کام تو بہرحال چلتے رہتے ہیں چنانچہ اگر آپ کو کسی دکان کے تھڑے پر "چادر و درویش" پر اسرار انداز میں بیٹھے نظر آئیں تو آپ بھی سر جھکا کر ان کے قریب جا کھڑے ہوں اور انہیں مخاطب کرنے کے بجائے سامنے والی دیوار کو مخاطب کر کے معذرت خواہانہ انداز میں سرگوشی کریں "کچھ کھانے کو مل جائے گا" اس پر کوئی صاحب دل آپ کی طرف بڑھے گا اور آپ کو مخاطب کئے بغیر آسمان کی طرف منہ کر کے کہے گا "کیہ چاہی دا اے" آپ اس فقیرانہ انداز میں جواب دیں "جو مل جائے" اس پر وہ مرد قلندر برابر میں واقع اپنے مکان میں جائے گا اور شامی کباب اور سلائس یا نان چنے یا دہی بھلے کے پیک میں بند آپ کو دائیں ہاتھ سے اس طرح پکڑائے گا کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوگی۔ آپ بھی اس کو رقم کی ادائیگی اسی انداز میں کریں گے اور پھر کسی دیوار کی اوٹ میں یا جھاڑیوں کے پیچھے یا کسی نیم تاریک جگہ میں منہ کالا کریں گے مگر اس کے لئے شاہین فورس سے بچنا ضروری ہے کیونکہ جرائم پیشہ لوگ ان کی نظروں سے بچ سکتے ہیں گناہ گار نہیں وجہ صاف ظاہر ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں کی مدد کو سیاستدان اور وڈیرے پہنچ جاتے ہیں اور یوں ان "شاہینوں" کے ہاتھ کچھ نہیں آتا جب کہ گناہ گاروں کی مدد کو خود گناہ گار بھی نہیں پہنچتے!

گناہ گاروں کے لئے ان دنوں چند "مقامات وآہ و فغان" اور بھی ہیں۔ جن میں ریلوے اسٹیشن اور ہسپتالوں کی کینٹین خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان دنوں کسی ایک مریض کو گاڑی پر سوار کرانے کے لئے آدھا محلہ ساتھ چل پڑتا ہے۔ اسی طرح مریضوں کی عیادت کا جذبہ بھی زوروں پر ہے یا کسی شہر سے کوئی مسافر آجائے اور وہ کسی دوست سے ملنے اس کے گھر جانا چاہے تو کئی رستہ بتانے والے اس کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان دنوں گناہ گاروں میں مشرقی اقدار بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ ہم لوگ ایسے ہی واویلا کرتے رہتے ہیں کہ لوگوں کی آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔

ابھی تک میں نے جن گناہ گاروں کا ذکر کیا ہے یہ وہ گناہ گار ہیں جن پر پہلے سے خدائی مار ہے یعنی ان کا تعلق غریب غرباء سے ہے آپ چاہیں تو انہیں "کمی کمین" بھی کہہ سکتے ہیں لیکن گناہ گاروں کی ایک قسم اور بھی ہے جن کا شمار "شرفاء" میں ہوتا ہے میری مراد امیر لوگوں سے ہے۔ ہمارے صاحبان اقتدار نے ملک میں دو طرح کے اسلام نافذ کیے ہوئے ہیں۔ ایک اسلام غرباء کے لئے ہے اور ایک ان کے اپنے طبقے کے لئے۔ غریب گناہ گاروں کا احوال میں نے بیان کر دیا ہے جب کہ بحمد اللہ امیر گناہ گاروں کے لیے اس قسم کی کوئی پرابلم نہیں۔ رمضان المبارک کے مہینے میں شہر کے فائیو سٹار ہوٹل ان کے لئے کھلے ہیں' وہ کافی شاپ میں جائیں۔ ویٹر انہیں ایک فارم دے گا جس پر مریض' مسافر' غیر مسلم کے الفاظ درج ہوں گے' ان میں سے کسی ایک پر نشان لگا کر جو جی چاہے منگوائیں۔ کئی حقیقت پسند قسم کے گناہ گار تو مریض' مسافر یا غیر مسلم کے سامنے نشان لگانے کے بجائے اپنی طرف سے لفظ "ہنگری" لکھتے ہیں اور اس پر نشان لگا کر کام و دہن کی تواضع کافی اور برگر سے کرتے ہیں۔ "اصلی اسلام" میں مریض' مسافر اور غیر مسلم سے طبقاتی امتیاز نہیں برتا جاتا جبکہ نظریہ ضرورت والے اسلام میں امیروں اور غریبوں کے لیے الگ الگ قوانین بنائے گئے ہیں یہ وہ اسلام ہے جس میں محمود و ایاز مسجد کی ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن مسجد سے نکلنے کے بعد محمود ہاتھی پر سوار ہو جاتا ہے اور ایاز پیدل اپنے کوٹھڑی کی طرف چل پڑتا ہے!

◆◆◆

حدود کیس عدالتیں اور اسلام!

ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج لاہور صاحب زادہ اوصاف علی نے بلیو پرنٹ سکینڈل میں ملوث ملزماں کو قید اور جرمانے کی سزا میں سنائی ہیں' تاہم اپنے فیصلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہ کیس عدالت میں لا کر پولیس نے اسلامی قوانین کے خلاف کیا ہے کیونکہ اسلام ایسی باتیں مخفی رکھنے کی ہدایت کرتا ہے کہ جب کوئی مقدمہ عدالت میں لایا جائے گا تو قاضی کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ شواہد کی روشنی میں فیصلہ کرے انوائے وقت کے رپورٹر کے مطابق صاحب زادہ اوصاف علی خان نے اپنے فیصلے میں مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تجسس کی ممانعت کا حکم صرف افراد ہی کے لیے نہیں بلکہ اسلامی حکومت کے لئے بھی ہے۔ شریعت نے نہی عن المنکر کا جو فریضہ حکومت کے سپرد کیا ہے' اس کا یہ تقاضہ نہیں کہ وہ لوگوں کی چھپی ہوئی برائیوں کو ڈھونڈ کر نکالے اور ان پر سزا دے بلکہ اسے صرف ان برائیوں کے خلاف طاقت استعمال کرنی چاہیے جو ظاہر ہو جائیں۔ رہی مخفی خرابیاں تو ان کی اصلاح کا راستہ جاسوسی نہیں بلکہ تعلیم' وعظ و تلقین' عوام کی اجتماعی تربیت اور ایک پاکیزہ معاشرتی ماحول پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ عدالت نے حضرت عمر کا وہ قصہ بھی تحریر کیا جس کے مطابق وہ دیوار پھلانگ کر ایک شخص کے گھر داخل ہوئے تو اسے ایک عورت کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں پایا۔ اس شخص نے ان کے اس طرح سے گھر میں داخل ہونے پر اعتراض کیا اور کہا کہ آپ نے تین غلطیوں کی ہیں' ایک تو آپ اسلامی طریق کار کے مطابق صدر دروازے سے گھر میں نہیں آئے' دوسرے آپ نے گھر میں آنے کی اجازت طلب نہیں کی اور تیسری غلطی آپ نے یہ کی کہ کمرے میں داخل ہوئے۔ حضرت عمر نے یہ جواب سن کر اس شخص کو چھوڑ دیا اور اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی' اس لئے یہ امر بہت واضح ہے کہ حکومت کے اہلکاروں کو اس امر کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ لوگوں کے خفیہ گناہوں کو برسر عام لائیں اور ان کو فوجداری مقدمے میں ملوث کریں' اگر انسپکٹر طاہر عالم قابل اعتراض ویڈیو کیسٹوں کو تلف کر دیتا تو بہتر ہوتا' عدالت نے قرار دیا کہ اس جرم اور ملزموں کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی جس کی وجہ سے ملزموں کو شرمندگی و ندامت کا سامنا کرنا پڑا' یہ سب کچھ شریعت کے منافی تھا عدالت کی خواہش ہے کہ آئندہ اس قسم کی کوتاہی کا اعادہ نہیں ہونا چاہیے!

ممکن ہے عامتہ المسلمین کی نظروں سے اسلامی تعلیمات کا یہ پہلو اوجھل ہو کیونکہ ہمارے ہاں پولیس اور خود عوام الناس ایسے

معاملات کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔

حدود کیسوں میں اسلام کی پیروی کیا ہے؟ یہ ایک انتہائی آنکھیں کھول دینے والا موضوع ہے۔ جس سے صرف ہمارے علماء وکلاء یا جج صاحبان ہی واقف ہیں۔ اگر اس طرح کے کیسوں میں اسلامی قوانین کے مطابق فیصلہ ہو تو معاشرہ پولیس کی اس بلیک میلنگ سے محفوظ ہو جائے جو راہ چلتے لوگوں سے نکاح نامے طلب کرتی ہے اور "تجسس" کو بروئے کار لاتے ہوئے گھروں پر چھاپے مار کر گرفتار شدگان کو "شارع عام پر بوس و کنار کرتے ہوئے گرفتار" کی خبریں لگواتی ہے۔ یہ اسلامی قانون کی سراسر خلاف ورزی اور بے حرمتی ہے۔ اور تمام مکتبہ فکر کے علماء اس پر متفق ہیں۔ شریعت کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کر کے انہیں ایسے اقدامات سے باز رکھنا ہے جو صالح معاشرہ میں اختلال پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ سخت سزائیں خوف کے لئے ہیں لیکن اس معاملے میں انتہائی احتیاط سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے حضور اکرم نے فرمایا کہ جتنا تم سے ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو دفع کیا کرو، اگر ذرا بھی گنجائش ہو کہ ملزم سزا سے بچ جائے تو اسے بچ جانے دو کیونکہ معاف کر دینے میں اگر حاکم سے غلطی سرزد ہو جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ سزا دینے میں اس سے غلطی ہو اور حضور نے عملی طور پر اس ضمن میں اس اصول کو سامنے رکھا۔ چنانچہ قبیلہ اسلم کے ایک شخص ماعز اسلمی نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر زنا کا اعتراف کیا تو آپ نے چار دفعہ اس کے اعتراف پر منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو حتیٰ کہ یہ بھی فرمایا کہ کیا تو پاگل ہے؟ یہ حضور گریز صرف یہیں تک نہیں بلکہ ماعز اسلمی کو ان کے اصرار پر سنگسار کیا گیا تو وہ پتھر کی چوٹ لگنے پر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن حضرت عبداللہ بن انس نے انہیں اونٹ کی ہڈی سے پیا مارا کہ وہ ہلاک ہو گئے پھر جب حضرت عبداللہ بن انس نے حضور سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا "تم نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا ہو سکتا تھا کہ وہ توبہ کرتا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا!""

مولانا مفتی محمود کے پیش نظر غالباً یہی روایت تھی کیونکہ جب کسی نے ان سے کہا کہ سنگساری ایک بہت سفاکانہ عمل ہے اس کی بجائے ملزم کو ہلاک کرنے کے لیے پستول کی گولی سے کام لینا چاہیے تو مفتی صاحب کا جواب تھا کہ یہ ملزم کے لیے بہتر نہیں کیونکہ پستول کی ایک گولی سے وہ وہیں مر جائے گا جب کہ اسلامی رو سے زنا کا الزام ثابت ہونے کے لئے چار متقی گواہوں کی ضرورت ہے اور اس کے علاوہ ملزم کا اعتراف بھی لازمی ہے بلکہ اس اعتراف کے بعد اگر سنگساری کے وقت بھی وہ کہہ دے کہ اس نے اس گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تو اس پر حد ساقط ہو جاتی ہے اور یوں اسے معاف کیا جا سکتا ہے جب کہ دوسری صورت میں پہلی گولی ہی اس کا کام تمام کر دے گی۔ میرے خیال میں سزا دینے کے ضمن میں اس سے زیادہ احتیاط دنیا کے کسی مذہب یا قانون میں موجود نہیں" کہ حضور

کے علاوہ رحمۃ للعالمین بھی کوئی نہیں!

اسلام اس نوع کے معاملات میں تجسس کے اس درجہ خلاف ہے کہ اس ضمن میں ہمارا موجودہ سارا نظام سر سر غیر اسلامی نظر آتا ہے۔ حضور ایک غزوہ سے واپس آئے تو مدینہ کے قریب پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا اور ڈھول بجانے کا حکم دیا۔ ایک صحابی نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ کیا یہ ڈھول فتح کی خوشی میں بجایا جا رہا ہے؟'' تو حضور نے فرمایا ''نہیں' بلکہ اس لئے کہ غزوہ کی وجہ سے لوگ کافی عرصے تک اپنے گھروں سے باہر رہے ہیں' یہ ڈھول اس لئے بجایا جا رہا ہے تاکہ واپسی کی خبر ہو جائے اور اگر کسی گھر میں کوئی ناپسندیدہ شخص موجود ہے تو وہ چلا جائے'' گناہوں کی جاسوسی کے ضمن میں یہ امر بھی کس قدر اہم ہے کہ حضور یا خلفائے راشدین کے زمانے میں ریاست کی طرف سے کسی پر زنا کا مقدمہ نہیں چلایا گیا بلکہ درج بالا مثالوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور اکرم کی عدالت میں اگر کوئی ملزم از خود پیش ہو گیا اور اعتراف گناہ بھی کیا تو حضور نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں' اس کے اعتراف پر حد نافذ کی نہ تعزیر قائم کی اور اگر اس کے بار بار توجہ دلانے پر سزا دی تو سزا کے دوران، سکے بھاگ جانے کا سن کر فرمایا ''تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا' ہو سکتا تھا کہ وہ توبہ کرتا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا!''

ہم لوگ اسلام کا جو رخ عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں اس میں صرف سزا ہی سزا ہے جس کے نتیجے میں اسلام دشمنوں کو اپنے خبث باطن کے اظہار کا موقع ملتا ہے جب کہ اسلام عفو و درگزر کا بھی نام ہے۔ صاحب زادہ اوصاف علی خان نے اپنے فیصلے میں پولیس' اخبارات اور عوام کی توجہ اس اہم مسئلے کی طرف دلائی ہے لیکن میرے خیال میں محض توجہ دلانے سے کام نہیں چلے گا بلکہ اس ضمن میں اسلامی اصولوں کی روشنی میں قانون سازی بھی ہونی چاہیے یا اگر پہلے سے کوئی قانون موجود ہے تو عدالتوں کو اس پر عمل درآمد کا اہتمام بھی کرنا چاہیئے آخر میں ایک سوال میں فاضل جج صاحب سے بھی کرنا چاہتا ہوں'' کیا وہ واقعی عفو و درگزر سے کام نہیں لے سکتے تھے؟''

◆◆◆

ٹریفک پولیس چند کلیوں پر قناعت کر گئی!

ٹریفک پولیس والوں کی غریب پروری سے تنگ آ کر میں نے ریڑھا چلانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یقیناً آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ ٹریفک کی بتی سرخ ہونے پر صبر نہیں والے جب ایک سیلاب کی صورت میں چوک کراس کرنے لگتے ہیں، کوئی ریڑھا سوار لوکیل چونچ والا سریا اوپر فضا میں چھتنا بلند کئے مخالف سمت سے نمودار ہوتا ہے جسے دیکھ کر لوگوں کی اور کاروں سکوٹروں کی چیخیں نکل جاتی ہیں جس کے نتیجے میں اس شہنشاہ کی سواری پورے کروفر اور سہولت سے چوک سے گزر جاتی ہے۔ آپ جھنجلاہٹ کے عالم میں ٹریفک پولیس سے شکایت کریں کہ اس نے سارے ٹریفک کو درہم اور لوگوں کو برہم کر دیا ہے تو اس کے جواب میں آپ کو خندہ استہزا کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اسی طرح تانگے والے اور ویگن والے جو سلوک ٹریفک سے کرتے ہیں اور ٹریفک پولیس کے سامنے کرتے ہیں، وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ ان لمحوں میں پولیس والے ہفتہ خوش اخلاقی منانے لگتے ہیں!

اس کے علاوہ کچھ مناظر آپ نے ہائی وے پر بھی دیکھے ہوں گے، بسیں جس طرح آپے سے باہر ہوئی ہوتی ہیں، ٹریکٹر اور ٹرالیاں جس طرح خلقِ خدا کا امتحان لیتی ہیں، کالے بھینسوں کا ریوڑ جس طرح چرواہے کی قیادت میں تیز رفتار ہائی وے پر اچانک قدم رنجہ فرماتا ہے، یہ سب مناظر ٹریفک پولیس والوں کے لئے عالمِ تاتنک کا کام دیتے ہیں، ورنہ آئے روز سڑکوں پر انسانوں کا یوں قتل عام نہ ہوتا۔ اکبر الہٰ آبادی نے کہا تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور زیادہ "افسوس" کی بات یہ ہے کہ فرعون کو کالج کے علاوہ ٹریفک پولیس کی بھی نہ سوجھی ورنہ وہ سارے "موسیٰ" پیدا ہوتے ہی سڑک پر مروا دیتا۔ پولیس والوں کی دیہاڑی بھی بن جاتی، فرعون کا کام بھی ہو جاتا اور وہ بدنام بھی نہ ہوتا!

ٹریفک پولیس کی "طبقاتی" پالیسی کا ایک دلچسپ ثبوت اس وقت ملتا ہے جب کوئی کار ٹریفک کے کسی رول کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ اس پر چوک میں کھڑا ٹریفک پولیس کا کانسٹیبل دونوں ہاتھوں کو کتھک ڈانس کے انداز میں حرکت دیتا ہے اور "کوڈی کوڈی" کہتا ہوا عین کار کے سامنے یوں آن کھڑا ہوتا ہے جیسے اگر آپ نے اس کے اشارے پر کار نہ روکی تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا اور وہ آپ کی

کار کے پیچھے آ کر جان دے دے گا ان لمحوں میں ملکہ ترنم بہت یاد آتی ہیں۔

دل توڑیں گا تے دے دیاں گی جاں

توں جا کے دتا تے سکی

پھر اس کے بعد بھاؤ تاؤ ہوتا ہے لیکن اگر کار میں سوار شخص کوئی "بگ گن" ہے تو بھاؤ ختم ہو جاتا ہے اور باقی "تاؤ" رہ جاتا ہے اور بے چارہ کانسٹیبل بجائے تاؤ کسی اور پر نکالنے کی کوشش کرتا ہے!

تاہم اگر ٹریفک پولیس کے اصل کمالات دیکھنے ہوں تو اس وقت دیکھیں جب مال روڈ پر کوئی جلوس نکلا ہو جلوس کے شرکاء کی تعداد اس ضمن میں زیادہ اہمیت کی حامل نہیں' چنانچہ یہ جلوس اگر چند درجن افراد پر بھی مشتمل ہو تو ٹریفک پولیس انتظامیہ کے بزرجمہروں کے تعاون سے مال روڈ کی طرف جانے والے تمام رستے بند کر دیتی ہے اور پھر ارد گرد کی سڑکوں پر جو کہرام مچتا ہے' ٹریفک جس طرح جام ہوتی ہے' نفسا نفسی کا جو عالم نظر آتا ہے اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے روزِ محشر کی ریہرسل ہو رہی ہو۔ یک دفعہ میں نے یک پولیس والے سے پوچھا کہ تم اس طرح کیوں کرتے ہو؟ اس نے اطمینان سے جواب دیا "ہمیں جتنی تنخواہ ملتی ہے اس کے نتیجے میں ہمارے گھر روزانہ وہی صورتحال پیدا ہوتی ہے جو مال روڈ بند کرنے کی صورت میں آپ کو ارد گرد کی سڑکوں پر دکھائی دیتی ہے"

ٹریفک پولیس کے "بڑے دماغ" شہر میں ٹریفک کی جس طرح پلاننگ کرتے ہیں اس کے پیش نظر میری خواہش ہے کہ ان کا دماغ عارضی طور پر نیورو سرجن ڈاکٹر بشیر کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ پتہ چلا سکیں کہ ان دماغوں میں ایسی ایسی نادر چیزیں آتی کس طرح ہیں؟

آپ نے دیکھا ہو گا کہ کبھی کبھی چوک میں راؤنڈ اباؤٹ تعمیر کر دیا جاتا ہے' کبھی ڈھا دیا جاتا ہے' کبھی ایک اضافی لین بنائی جاتی ہے جس کا مقصد اللہ جانے کیا ہوتا ہے لیکن اس کا نتیجہ اگر "بہترین" فارم میں دیکھنا ہو' کبھی ایک چکر سرکلر روڈ کا لگائیں اس "دورے" کے دوران آپ کو پتہ چلے گا کہ مسلم مسجد کے سامنے ٹریفک کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کچھ بھٹو کے زمانے میں اس خوفناک فائرنگ کے نتیجے میں بھی نہیں ہوا تھا جس کی یاد سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک ٹریفک پولیس کی صلاحیتیں ایک محدود پیمانے پر استعمال کر کے ان کے ساتھ اور قوم کے ساتھ زبردست زیادتی کی جا رہی ہے کہ ان کے سارے پلان اور ان کی ساری پلاننگ صاحبانِ اقتدار والی ہے' یعنی دونوں کی پالیسیوں کے نتیجے میں قوم پریشان ہوتی ہے' لہٰذا ٹریفک پولیس کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اس دو ٹکے کی نوکری کو ٹھوکر ماریں اور سیاست میں آئیں تاکہ ان کے جوہر پوری طرح کھل سکیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

◆◆◆

خرافات!

میں نے اپنے آپ سے پوچھا "تم کون ہو؟" میں نے جواب دیا۔ "میں وہ ہوں جسے تم جانتے ہو!" میں نے کہا "تم وہ نہیں ہو جسے میں جانتا ہوں۔ ان دنوں کوئی بھی وہ نہیں ہے جیسے لوگ جانتے ہیں کہ وہ یہ ہے۔"

"پھر تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں انڈہ ہوں!" میں نے جواب دیا۔

"اگر تم انڈے ہو تو یہ بتاؤ پہلے مرغی پیدا ہوئی تھی یا انڈہ پیدا ہوا تھا۔"

"میں اس بارے میں نہیں جانتا' میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میں انڈہ ہوں' اور تین روپے درجن کے حساب سے فروخت ہو رہا ہوں!"

"میں تم سے ریٹ نہیں پوچھ رہا' یہ ریٹ تو گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں' تم یہ بتاؤ کہ پہلے انڈہ پیدا ہوا تھا یا مرغی پیدا ہوئی تھی؟"

"میں تمہارے سوال کا جواب سوچ کر دوں گا پہلے مجھے ایک شعر کا مطلب بتاؤ۔"

"کون سا شعر؟"

"وہی انڈے اور ہاتھی والا....."

یکایک یکایک یہ کیا ہو گیا
کہ انڈے پہ ہاتھی کھڑا ہو گیا

"بھلا یہ بھی کوئی شعر ہے۔ تم دانشور ہو کر عوام الناس کی باتوں کو سنجیدگی سے لے رہے ہو؟"

"اچھا تو اس شعر کا مطلب سمجھاؤ۔"

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

"پھر وہی شعر و شاعری' میں پوچھ رہا ہوں کہ پہلے..... ....."

''یہ تو میں تمہیں سوچ کر بتاؤں گا' تم مجھے بتاؤ کہ پنکھے کو پنکھا کیوں کہتے ہیں' آلو بخارا یا تربوز کیوں نہیں کہتے؟''

''اس لئے کہ سب سے پہلے کسی شخص نے پنکھے کو پنکھا کہہ دیا تھا۔ اس لئے اسے آج تک پنکھا کہا جا رہا ہے۔ اگر کسی نے آلو بخارا کہہ دیا ہوتا تو ہم اسے آج آلو بخارا ہی کہہ رہے ہوتے!''

''میں آج سے پنکھے کو آلو بخارا کہوں گا' یہ آلو بخارا چلاؤ مجھے گرمی لگ رہی ہے!''

''صبح سے خنک ہوائیں چل رہی ہیں اور تمہیں گرمی لگ رہی ہے میں تمہارا مسئلہ سمجھتا ہوں' تم ذہنی طور پر پریشان ہو۔ تمہاری طرح کے کچھ اور لوگ بھی پریشان ہیں' اس پریشانی کے مثبت حل کے لئے آؤ تبادلہ خیال کریں۔ لہٰذا یہ بتاؤ کہ پہلے انڈہ پیدا ہوا تھا یا مرغی پیدا ہوئی تھی؟''

''میں نے تمہیں بتایا کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں' میں کتابوں کا مطالعہ کر کے بتاؤں گا کہ صحیح صورت حال کیا ہے۔''

''میں نے کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کتابوں کی ایک ایک سطر میں کتنے ہی نکات پوشیدہ ہیں۔ کسی شق سے پتہ چلتا ہے کہ انڈہ پیدا ہوا تھا اور کوئی دوسری شق بتاتی ہے کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی تھی۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے۔''

''میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں انڈہ ہوں اور تین روپے درجن فروخت ہو رہا ہوں' اگر مزید گرمی پڑی تو میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑا ہوا ملوں گا۔ آلو بخارا چلاؤ مجھے گرمی لگ رہی ہے!''

''میں تمہیں پنکھے کو آلو بخارا کہنے کی اجازت نہیں دوں گا تمہیں پنکھے کو پنکھا ہی کہنا پڑے گا۔''

''چلو میں اسے پنکھا کہہ لیتا ہوں' مجھے گرمی لگ رہی ہے یہ پنکھا چلا دو۔''

''موسم بہت خوشگوار ہے میں پنکھا نہیں چلاؤں گا۔''

''موسم خوشگوار نہیں ہے' خدا کے لیے پنکھا چلاؤ!''

''تم انڈے ہو' باہر سے بھی سفید اور ہے ہو' اندر سے بھی زرد ہو۔ میں تمہیں تین روپے درجن کے حساب سے خرید لوں گا' میں پنکھا نہیں چلاؤں گا۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تم سے صرف ایک مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''اور مسئلہ یہ ہے کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی تھی یا انڈہ پیدا ہوا تھا؟''

◆◆◆

سفید پوشوں کے لئے قیمتی مشورے!

سفید پوشوں کو مشورے دینے والے بہت ہیں اور ابھی تک یہ مشورے ان مشورے دینے والوں کے لئے بھی بہت قیمتی ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً ہر سفید پوش کو روٹی کپڑا اور مکان کے حصول کا مشورہ دینے ہی کی بدولت عوامی حکومت وجود میں آئی۔ لیکن سفید پوش بھی ان مشوروں کی برکات سے بہرحال مستفید ہوئے۔ چنانچہ آج روٹی کپڑا اور مکان میں سے جو چیز چاہیں وہ رقم ادا کر کے بازار سے خرید سکتے ہیں تاہم روٹی کپڑا اور مکان اور دیگر ضروریات زندگی کے سلسلے میں یہ سہولتیں صرف سفید پوشوں ہی کو مہیا نہیں کی گئیں بلکہ اس ضمن میں ان اشیاء کے چور دروازوں کو بھی برابر کے مواقع فراہم کیے گئے۔ تاکہ وہ سفید پوشوں سے ان اشیاء کے منہ مانگے دام وصول کر سکیں۔ چنانچہ اس انقلابی سکیم پر عمل پیرا ہونے سے آج شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے نظر آتے ہیں اور یوں نوشیرواں عادل کے دور کی یاد تازہ ہو گئی ہے سفید پوشوں کی فلاح و بہبود کا یہ کام صرف سرکاری سطح ہی پر نہیں ہوا بلکہ بعض "نجی سیکٹروں" میں بھی اسی نوع کے منصوبوں پر کام جاری ہے چنانچہ وطن عزیز کے مختلف حصوں میں اس نوع کے بھی خواہ سفید پوشوں کو یہ مشورے دیتے ہیں کہ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان مسلمان غریب عوام مل کر اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھائیں بلکہ زبان اور نسل کے اختلاف پر وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ کیونکہ اس میں ان کی بھلائی ہے اس نوع کے مشورے بھی ابھی تک ان مشورے دینے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کو انہوں نے "بنگلہ دیش" بنا لیا اور خود وہاں حاکم بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ تاہم بنگالی سفید پوشوں کو یہاں بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوا ہے۔ کیونکہ اب انہیں "پنجابی" نہیں لوٹتا۔ بنگلی لوٹتا ہے یا بھارت کا ہندو لوٹتا ہے۔

ہم یہ سطور یہاں تک لکھ چکے تھے کہ اچانک خیال آیا کہ ہم کن چکروں میں پڑ گئے ہیں ہمیں اداریہ نہیں فکاہی کالم لکھنا ہے اور فکاہی کالم نگار "اخیری بھانڈ" ہوتا ہے۔ جس کا کام لوگوں کو ان کے مسائل یاد دلانا نہیں بلکہ اپنی "کتولیا" باتوں سے یہ مسائل بھلاتا ہوتے ہیں ایسا کرنے پر قیمتی سوٹوں میں ملبوس "عوام" نہ صرف یہ کہ خوش ہوتے ہیں بلکہ جی بھر کر "ویلیں" بھی دیتے ہیں اور ظاہر ہے دو چار "تر" کھا کر بھاری رقوم پر مشتمل "ویلیں" وصول کرنا کوئی گھاٹے کا سودا نہیں، سو سودا خوش رکھے ہم سفید پوشوں کو اب ایسے ہی مشورے دیتے چلے ہیں۔ جن سے کوئی مسئلہ حل ہو نہ ہو بہرحال کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا۔ چنانچہ ان کے لئے ہماری پہلی تجویز

یہ ہے کہ اگر وہ اپنے معاشی حالات کی بنا پر دوپہر کا کھانا اسی برکتے کے تندور سے کھاتے ہیں تو انہیں یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ البتہ اپنا معاشرتی بھرم قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی برکتے کے تندور سے کھانا کھا کر ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے شاہی دروم کے سامنے جا کھڑے ہوں اور وہاں کم از کم آدھ گھنٹے تک خلال کرتے رہیں۔ اسی طرح کی اور بہت سی تجاویز ہمارے ذہن میں ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے غریب عوام سینہ تان کر اس دھرتی پر چل سکتے ہیں لیکن ہمیں خدشہ ہے کہ ہماری کسی تجویز پر بھی ان کی طرف سے عمل درآمد ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ ہم بیان کردہ ایک تجویز اور دیگر ناگفتنی تجاویز کو واپس لیتے ہوئے صرف یہ تجویز ان کے سامنے رکھتے ہیں کہ تمام سفید پوش سفید لباس پہننا چھوڑ دیں اور اس کی جگہ سیاہ لباس پہننا شروع کر دیں۔ یہ سیاہ لباس کسی احتجاج کے طور پر نہیں ہوگا بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگ انہیں "سفید پوش" کہنا چھوڑ دیں جس سے ان کے معاشرتی وقار میں خاصا اضافہ ہوگا۔ نیز اس سے پوری دنیا میں پاکستان کا وقار بھی بلند ہوگا کیونکہ بیرونی دنیا میں ہمیں یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ پاکستان میں ایک بھی سفید پوش نہیں۔"

"مولا خوش رکھے، ہم نے بڑا کام دکھایا ہے اب کچھ "دوائیاں" بھی ملیں۔ ہم نے اگر زردے "لتر" کھانے ہوتے، تو تقی نے بچے جاتے یہ "تو تو ہیا" باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

◆◆◆

ایک غلطی کا ارتکاب!

ہم نہ خود کو اذیت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو اذیت میں مبتلا کر کے خوش ہوتے ہیں مگر خدا جانے اس وقت ہمیں کیا ہوتا ہے جب کوئی بڑے ثقہ قسم کے بزرگ ہمارے امریکہ یاترا سے آگاہی کی صورت میں بظاہر یہ معصوم سا سوال پوچھتے ہیں کہ ”حضرت، سنا ہے وہاں اخلاق کی دھجیاں روز روشن میں بکھیری جاتی ہیں کیا درست ہے؟“ تو ہم صرف ہاں میں جواب دے کر بات کا رخ دوسری جانب پھیر دیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ پھر اسی جانب لوٹ آتے ہیں ”یہ بھی سنا ہے کہ وہاں لڑکیاں ایسا لباس پہنتی ہیں کہ شرافت اپنا منہ پیٹ کر رہ جاتی ہے۔“ سمجھنے کو تو ہم شروع ہی میں سمجھ گئے تھے جو وہ سننا چاہتے ہیں مگر ایک بار پھر تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے ”آپ نے یہ صحیح سنا“ کہہ کر بات کا رخ کسی اور طرف موڑ دیتے ہیں۔ اس پر وہ بزرگ بے چینی سے کروٹ لیتے ہیں، ہمت نہیں ہارتے اور سہ بارہ کہتے ہیں ”پڑھنے میں یہ بھی آیا ہے کہ وہاں کی دوشیزاؤں کے نزدیک شرم و حیا یا عصمت نام کی کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ خوب کھل کھیلتے ہیں۔“ ہم دل ہی دل میں مسکراتے ہیں مگر ان کے چاہنے کے باوجود کوئی سی بات نہیں کہتے جس سے وہ حظ اٹھا سکیں اور یوں ان کی بتائی ”حقیقت“ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک بار پھر ”جی ہاں بالکل ایسے ہی ہوتا ہے“ کہہ کر ہونٹ سی لیتے ہیں۔ اب وہ صاحب پھٹنے کے قریب ہو جاتے ہیں اور اپنی بلیک اینڈ وائیٹ مونچھوں پر انگشت شہادت پھیرتے ہوئے کہتے ہیں ”مگر یہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے یعنی..... یعنی..... صاحب ذرا تفصیل سے بتائیے نا۔“

”یہ سب کچھ تفصیل سے سننے کے بعد ایک سوال اور پوچھا جاتا ہے یعنی یہ کہ ”آخر آپ کو واپس آنے کی ضرورت کیا تھی؟“ گویا ہمارا وجود اس دھرتی پر بوجھ کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم ان نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے ہیں، تاہم انہیں بتاتے ہیں کہ ”گو ہمارے پاس وہاں آٹومیٹک، پاور سٹیئرنگ، پاور بریک، ایئر کنڈیشنڈ امپالا گاڑی تھی۔ سینٹرل ہیٹڈ اور ایئر کنڈیشنڈ اپارٹمنٹ تھا، جو وال ٹو وال کارپٹڈ تھا اور جس میں کلر ٹی وی، سٹیریو، ٹیلی فون، ریفریجریٹر، نہانے کا تالاب اور تالاب کی زینت کا بھی سامان موجود تھا، مگر یہ سب کچھ تو ٹام، ڈک اور ہیری کے پاس بھی تھا۔ ہماری انا کو آخر کس طرف سے تسکین پہنچتی؟ اس کے برعکس دیکھئے ہم نے یہاں گو قسطوں میں ایک سکوٹر خریدا ہے مگر صبح کس شان سے اس پر سوار ہوتے ہیں اور دفتر تک پہنچتے پہنچتے کئی پیدل اور سائیکل سواروں کو میلوں پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اس طرح وہاں کام پر عام لوگوں کی طرح ہم بھی بھیر گری کھاتے تھے جبکہ یہاں بھی ایسا کرتے ہیں تو

طبقہ امراء میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ وہاں ایک عام امریکی کی طرح گھر میں جھاڑو لگاتے تھے' کھانا پکاتے اور برتن مانجھتے تھے' کپڑے دھوتے تھے اور لان کا گھاس کاٹتے تھے اور یہ سب کچھ کرنے کے علاوہ آٹھ گھنٹے دفتر میں کام بھی کرتے تھے' جبکہ یہاں گھنٹوں تصرجاناں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔

وہ صاحب ہماری یہ باتیں پورے غور سے سنتے ہیں اور آخر میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں "مگر صاحب! آپ کو واپس آنے کی ضرورت کیا تھی؟"

"یہ فقرہ ہمیں اتنی بار سننا پڑا ہے کہ ہم خود سوچ میں پڑ گئے ہیں اور ان دنوں سنجیدگی سے اس امر پر غور و خوض کر رہے ہیں کہ آیا واقعی ہمیں واپس آنے کی ضرورت نہیں تھی' یہ بات ہم ان لمحوں میں خصوصاً زیادہ سوچتے ہیں جب سودا لینے کے لئے خود بازار جانا پڑتا ہے اور وہاں پہنچتے ہی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا ہے صرف آٹے دال ہی کا نہیں بلکہ پیاز کا بھی' جو چند ماہ پیشتر ایک روپے کا آٹھ سیر ملتا تھا اور اب ڈیڑھ روپے میں ایک سیر ملتا ہے۔ چنانچہ ہمیں یقین واثق ہے کہ اس دور میں اگر کسی کو سو جوتیاں یا سو پیاز کھانے کی سزا میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو وہ مخالف کو شدید زک پہنچانے کے لئے پیاز کھانے ہی کو ترجیح دے گا' ادھر ترکاریاں گوشت کے بھاؤ بک رہی ہیں اور بکرے کے گوشت کی قیمت انسانی گوشت کے قریب قریب پہنچ گئی ہے۔ رہی دال سو وہ اب مہینے کی پہلی تاریخ ہی کو پک سکتی ہے۔ چنانچہ اب اگر مہمان' میزبان کو یہ کہے کہ "صاحب کوئی تکلف نہیں کر سکا' بس دال روٹی حاضر ہے!" تو اسے محض انک رکھنا چاہیے۔ یہی حال کپڑے کا ہے' خریدنے جائیں تو غالب کی بات کو صائب تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ تن کی عریانی ہی بہترین لباس ہے' مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق اوپر سے انگریزی فلموں اور پوسٹروں کی پیدا کردہ گھٹن ہے۔ غنڈہ گردی اور لاقانونیت ہے۔ کارل مارکس انسانی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت پیٹ کو دیتا ہے اور فرائڈ جنس کو' جبکہ ایک تیسرا طبقہ اخلاق کو سب سے اہم گردانتا ہے اور ہمارے ہاں یہ تینوں چیزیں بحران کا شکار ہیں۔ بقول شخصے:

ایک دکھ ہو تو کوئی اس کا مداوا بھی کرے
درد دل' درد جگر' درد کمر تینوں ہیں!

غالباً ہمارے دوست ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ "آخر تمہیں وطن واپس آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

◆◆◆

دشمنوں کے درمیان دوستوں کی ایک شام!

یوتھ کلچرل آرگنائزیشن کی طرف سے شملہ کانفرنس کے بارے میں جس مذاکرہ (اور بعد ازاں تاریخ انعقاد میں تبدیلی) کی پورے زور و شور سے پبلسٹی کی گئی تھی اس میں شرکت کا ہمیں بھی موقع ملا۔ مہمان خصوصی مولانا کوثر نیازی تھے جو نہ آ سکے اور اداکار محمد علی سمیت دیگر مقررین موقع پر پہنچ گئے۔ ٹاؤن ہال کا اپیر کنڈیشنڈ ہال حاضرین (جو بعد میں مظاہرین نکلے) کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ وہ انہوں کھڑے ہو کر تقریریں سنیں' بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تقریریں کیں۔ دراصل ہوا یوں کہ جو مقرر بھی شملہ میں ہونے والے معاہدہ کے حق میں تقریر کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا اس سے پہلے حاضرین اٹھ کھڑے ہوتے اور دھواں دھار تقریر کر ڈالتے۔ اسے "حسن اتفاق" ہی سمجھئے کہ حکومت کی سرپرستی میں قائم "یوتھ کلچرل آرگنائزیشن" نے مدعو کیا ہی ایسے مقررین کو تھا جو معاہدہ کی حمایت میں تھے وہ یوں پہلے مقرر سے لے کر آخری مقرر تک جلسہ میں سامعین اور مقررین کی آوازیں آپس میں گڈمڈ رہیں۔ سوائے جناب ایس ایم ظفر کی تقریر کے' جنہوں نے معاہدہ کی ایک بالکل اچھوتے رنگ میں تعبیر کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایوان میں ملک کے ایک بہت بڑے فلمی ہیرو کی موجودگی کی باوجود حاضرین نے جناب ظفر کو اپنا ہیرو ٹھہرایا۔ ان کی تقریر کے دوران پورے جوش و خروش سے نعرے لگائے اور تالیاں پیٹیں۔

جلسہ کا آغاز قریباً سات بجے شام ہوا اور تمام تر "تعرہ ہائے مستانہ" کے باوجود نو بجے تک جاری رہا۔ اس تقریب کے سامعین خاصے ستم ظریف واقع ہوئے تھے چنانچہ ان کی طرف سے بار بار نکتہ ریزی کے باعث بیچارہ مقرر گھبرا جاتا تھا اور تیار کردہ تقریر بھول کر اس قسم کی تقریر شروع کر دیتا۔ جس کی جھلک پطرس بخاری کے ایک مضمون "مرید پور کے پیر" میں ملتی ہے۔ جلسہ میں چوہدری ظہور الٰہی ایم این اے جناب ایس ایم ظفر رانا پھول ایم پی اے خلیل الرحمن رمدے اور اداکار محمد علی نے تقاریر کیں۔ صدارت کے فرائض عبدالرحمن میوں ایم پی اے رہے تھے اور تقریب بازی میں سامعین کے مد مقابل اگر کوئی تھا تو وہ صاحب صدر ہی تھے۔ بے وزن شعر پڑھنے سے قطع نظر وہ درمیان میں کبھی سامعین اور کبھی مقررین پر جملے چست کرتے رہے اور غالباً ان کے اسی رویے کے باعث تمام تر بدنظمی کے باوجود کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ تقریب کی کارروائی اخبارات میں شائع ہو چکی ہے یہاں آپ صرف سامعین کی غیر مطبوعہ ستم ظریفیاں ملاحظہ فرمائیں۔

"مذکرہ" کے پہلے مقرر ہمارے دوست خلیل الرحمن رمدے تھے۔ سامعین کی طرف سے پہلا اعتراض ان کے نام کے دوسرے حصے پر ہوا' اس مرحلے سے بخیر و عافیت گزرنے کے بعد انہوں نے شملہ میں ہونے والے معاہدہ کے حق میں تقریر شروع کی تو مختلف کونوں سے مختلف اعتراضات شروع ہو گئے۔

آواز۔ آپ کس پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں؟

صدر۔ سامعین کرام! آپ کو نام کھانے سے غرض ہے یا بیچ گننے سے؟

مقرر۔ میں کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتا' میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں!

آواز۔ پھر آپ ایک سیاسی موضوع پر بولنے کی زحمت کیوں گوارا فرما رہے ہیں؟

مقرر۔ میں ایک شہری کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں!

آواز۔ یہ شہری دفاع کا جلسہ نہیں!

اس جرح کے بعد خلیل الرحمن دوبارہ معاہدہ شملہ کی طرف لوٹے تو حاضرین نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

صدر۔ معزز سامعین! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے معاہدہ شملہ پر دستخط صدر بھٹو نے کئے ہیں' خلیل الرحمن رمدے نے نہیں!

آواز۔ لگتا یوں ہے کہ انہوں نے بھی کئے ہیں!

ایک اور آواز۔ جناب صدر! آپ کا ارسال کردہ دعوت نامہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں فاضل مقررین کے نام درج ہیں' لیکن اس میں خلیل الرحمن صاحب کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ ہمارا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟

صدر۔

وہ بات سارے فسانے جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

مقرر۔ حضرات! آپ اس وقت معاہدہ شملہ کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتے' لیکن آپ نے صدر بھٹو کو پورے اختیارات دے کر خود بھارت بھیجا تھا' کیا اس وقت کسی نے کہا تھا کہ وہ بھارت نہ جائیں۔

اس پر ایک خاتون سے صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور سینے پر ہاتھ مار کر بولے "میں نے کہا تھا!"

آواز۔ جناب صدر! مقرر کتنے دنوں تک بولنے کا ارادہ رکھتے ہیں!

صدر۔ اگر وصل کے بھیجیں تو چند لمحے اور ہجر کی صورت میں بس کچھ نہ پوچھیے۔

"خلیل الرحمن رمدے حاضرین کے نعروں اور تالیوں کا جواب ہاتھ کے اشارے سے وصول کرتے ہوئے رخصت ہوئے تو چودھری پرویز ظہور الٰہی پسینہ پونچھتے ہوئے اسٹیج پر آئے اور رنگ محفل دیکھ کر آتے ہی یہ مصرعہ پڑھا۔

"اے ہم نشین عزت و ذلت خدا کے ہاتھ"

اور اس کے بعد بھی وہ موقع محل کے مطابق درمیان درمیاں میں شعر پڑھتے رہے۔ ہمیں اس امر کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ ہم چودھری صاحب کو اس سے قبل محض ایک سرمایہ دار ہی سمجھتے تھے' جو اپنے سرمائے کے بل بوتے پر سیاست میں داخل ہوا۔ لیکن ٹکڑوں ٹکڑوں میں ان کی تقریر سنے اور جس پامردی سے انہوں نے ستم ظریف سامعین کے حملوں کا مقابلہ کیا وہ دیکھنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ چودھری صاحب نہ صرف یہ کہ سیاست کے امور سے آگاہ ہیں بلکہ شعر و ادب کا بھی عمدہ ذوق رکھتے ہیں تاہم سامعین کے ہاتھوں ان پر جو بیتی اور ان کے ہاتھوں سامعین پر جو گزری اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

چودھری صاحب نے معاہدہ شملہ پر اظہار خیال سے قبل اچھی خاصی تمہید باندھی۔ 1947ء میں جو مغویہ خواتین بھارت میں رہ گئی تھیں ان کی بازیابی کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا ذکر کیا۔ سامعین کے موڈ کو جان کر یہ بھی کہا کہ مجھے علم ہے آپ کے جذبات کیا ہیں! آپ نہیں چاہتے کہ ظالم ہندو کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا جائے لیکن عزیزان من

آواز۔ چودھری صاحب ہمیں آپ کی تمہید سے پتہ چل گیا ہے کہ آپ معاہدہ کے حق میں بولنا چاہتے ہیں سو یہ تمہید چھوڑ دیں اور اصل بات کہیں جو کہنا چاہتے ہیں۔

چودھری صاحب۔ معزز سامعین یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ حضور کے زمانے میں 360 بت تھے اور......

آواز۔ اور آج بائیس ہیں!

چودھری صاحب نہیں حضرات ایسا نہیں۔ آپ مسلمان ہیں اور حساب نہیں جانتے یہاں بائیس بت نہیں بلکہ ہر صاحب اختیار اپنی جگہ ایک بت ہے۔

"چودھری صاحب نے ایک موقع پر سیاسی صورت حال پر تجزیہ کرتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھا

"میرے ماضی میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں!"

اس پر ایک آواز آئی۔

چودھری صاحب آپ نے آج سچ بولا ہے!

دریں اثناء چودھری ظہور الٰہی کافی حد تک اکھڑ چکے تھے لیکن انہوں نے ایک بار پھر اپنے حواس مجتمع کئے۔ ترنم ریز انداز میں للکارا اور کہنے لگے۔

''حضرات آپ اگر شملہ معاہدہ کے اتنے ہی خلاف ہیں تو آپ نے صدر بھٹو کو اندرا گاندھی سے بات چیت کے لئے جانے ہی کیوں دیا تھا؟''

اس پر ململ کے شلوار اور قمیض میں ملبوس ایک صاحب جو شکل وصورت سے طالب علم لگتے تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور گرج دار آواز میں کہنے لگے۔

''جناب عالی! پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم کے دوران جناب بھٹو نے کہا تھا کہ اگر پارٹی برسر اقتدار آ گئی تو وہ بیت المقدس آزاد کرائے گی ہم نے جناب بھٹو کو اس موقع پر بھارت بھیجا تھا کہ وہ بیت المقدس نہیں تو بیت المکرم ضرور آزاد کرا لیں گے لیکن افسوس کہ اس گفتگو کے نتیجے میں ہمارے ہاتھ سے کشمیر بھی جا رہا ہے۔''

اس پر چودھری صاحب کا پارہ تقریر کے دوران پہلی بار چڑھ گیا اور انہوں نے فرمایا۔

''حضرات! چاہے آپ اسے پسند کریں یا نہ کریں لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ بھارت میں اس معاہدہ کی مخالفت جن سنگھی کر رہے ہیں اور پاکستان میں بھی اس کی مخالفت کرنے والے جن سنگھی ہیں!''

یہ فقرہ چودھری صاحب کو خاصا مہنگا پڑا۔ پہلے ربردست مخالفانہ نعرے لگے اور پھر ''جن سنگھیں'' نے سٹیج پر ان کا گھیراؤ کر لیا۔ نتیجتاً انہیں اپنے الفاظ واپس لینا پڑے۔

چودھری صاحب کے بعد اسی ایم ظفر آئے اور پورے سکون بلکہ تحسین ومرحبا کے نعروں میں تقریر کر کے چلے گئے ان کے بعد معروف اداکار محمد علی کی باری تھی۔ وہ ہمارے پاس ہی بیٹھے تھے ان کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگرچہ انہوں نے زندگی میں بہت ڈرامے دیکھے اور کئے ہیں لیکن یوتھ کلچرل آرگنائزیشن کے زیر اہتمام ہونے والا یہ ڈرامہ ان کے لئے بالکل منفرد نوعیت کا حامل ہے بہرحال اگرچہ محمد علی تالیوں کی گونج میں سٹیج پر آئے لیکن پانچ منٹ بولنے کے بعد ہی انہیں علم ہو گیا کہ قلم میں تقریر کر لینا اور بات ہے اور سیاسی سٹیج پر بولنا اور بات! انہوں نے اپنی گھمبیر آواز میں تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا

''معزز سامعین امیر تعلق فلم انڈسٹری ہے اور کام اداکاری' لیکن اداکاری میں صرف سٹوڈیو کی چار دیواری میں کرتا ہوں۔''

''اس پر آوارہ بلند ہوا'' آج آؤٹ ڈور شوٹنگ سمجھئے اس پر محمد علی اپنی لکھی ہوئی تقریر کے تین چار صفحے یکدم پلٹ گئے اور درمیان میں سے پڑھنا شروع کر دیا دریں اثناء پھر آواز آئی کہ تمہید چھوڑیے۔ یہ بتایئے کہ آپ شملہ معاہدہ کے حق میں یا خلاف' اس پر محمد علی نے کاغذوں کا پلندہ بغل میں دبایا اور کچھ اس قسم کے بات کہتے ہوئے اسٹیج سے اتر گئے کہ میں اس معاہدہ کے حق میں ہوں۔ آپ نے جو کرنا کریں۔

جلسہ کے آخری مقرر رانا پھول خان ایم پی اے تھے۔ رانا صاحب کی شگفتہ بیانیاں مشہور ہیں لیکن یہاں ایک سے ایک شگفتہ بیان پہلے سے موجود تھا ہم تک ان کی صرف یہی بات پہنچ سکی کہ حضرات! میں ان پڑھ پینڈو ہوں' سکول میں تیسری کے بعد چوتھی جماعت سے بھاگ گیا تھا اس کے بعد وہ بہت کچھ کہتے رہے لیکن یہ نقار خانہ تھا اور یہاں ان کی آواز طوطی کی آواز تھی۔

''اجلاس کے اختتام پر ہمیں رہ رہ کر صاحب صدر کی وہ تمہیدی تقریر یاد آتی رہی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ معزز سامعین! جب یوتھ کلچرل آرگنائزیشن کے سٹیج سے آپ کو ''معزز سامعین'' کہا جاتا ہے تو یقین کریں ہم آپ کو واقعی معزز سمجھتے ہیں۔ کیونکہ آپ آج تک اس کا ثبوت دیتے آئے ہیں جلسہ کے بعد ان سے ملاقات نہ ہو سکی ورنہ ضرور پوچھتے کہ حضرت آپ اپنی رائے پر بھی تک قائم ہیں یا اس پر نظر ثانی کر لی ہے؟

◆◆◆

گرین کارڈ ہولڈر ہیرو!

ان دنوں جب کوئی دوست مجھے اپنی کتاب کی اشاعت کی خوشخبری سناتا ہے تو میرا دل ڈوب جاتا ہے کہ اب ایک اور کتاب کے بارے میں جھوٹ بولنا پڑے گا۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غفور الرحیم ہے لیکن یہ اس کی واحد صفت تو نہیں ہے چنانچہ جب نجیب احمد نے نرگس کنول کے ناولٹ ''ہجر کی پہلی بارش'' کی ایک کاپی مجھے تھمائی اور کہا کہ تم نے اس پر مضمون پڑھنا ہے تو مجھے خوشی ہوئی کہ چلو اگلے پچھلے جھوٹ کا کفارہ اس کتاب کے بارے میں سچ بول کر ادا کر دوں گا مگر اگلے ہی لمحے نجیب احمد نے یہ بتا کر میری ساری خوشی خاک میں ملا دی کہ کتاب کی مصنفہ اس کی سگی ہمشیرہ ہے چونکہ دوست کی بہن بھی بہن ہی ہوتی ہے لہٰذا میں اپنی بہن کی کتاب کے بارے میں بے رگ رائے کیسے دے سکتا ہوں بس یہ سوچ کر ایک دفعہ پھر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر ایک خیال ذہن میں یہ بھی آیا جس سے میری خاصی ڈھارس بندھی اور وہ خیال یہ تھا کہ نجیب احمد ایسے تخلیقی شاعر کی بہن، مگر برا ناولٹ لکھنا بھی چاہے تو زیادہ سے زیادہ کتنا برا لکھ لے گی؟ بس اسی قسم کے کچھ ملتے جلتے خیالات تھے جن کے درمیان میں نے ''ہجر کی پہلی بارش'' کا مطالعہ شروع کیا۔

ابھی میں نے اس ناولٹ کے پچیس تیس صفحے ہی پڑھے تھے کہ ناول کے ہیرو صاحب جن کا نام نامی اسم گرامی یوسف تھا درمیان میں ٹپک پڑے۔ موصوف ناول کی ہیروئن کے بھائی کے دوست تھے اور امریکہ سے تشریف لائے تھے۔ ان کی گفتگو سے لگتا تھا جیسے وہ ہیروئن کو فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہیروئن کے انداز ظاہر کرتے ہیں جیسے وہ ان سے متاثر نہیں ہو رہی مگر یہ قاری کی بھول ہے کیونکہ ہیرو صاحب بھی پہلی نظر میں اسیر محبت ہو چکے ہیں اور ہیروئن صاحبہ بھی سو جان سے ان پر فدا ہو چکی ہیں۔ میرے خیال میں یہ اچھا رجحان ہے کیونکہ اس سے قاری کے علاوہ خود ہیرو ہیروئن کا بھی خاصا وقت بچتا ہے' جو کام سو دو سو صفحات اور دو ماہ بعد ہونا ہے وہ شروع ہی میں ہو جائے تو اچھا ہے۔ لیکن یہ فروعی بات ہے اصل کہانی اس کے بعد شروع ہوتی ہے ناول کی ہیروئن کے لیے رشتے آ رہے ہیں ان میں سے ایک رشتہ ڈاکٹر سہیل کا بھی ہے جو فریقین کو پسند آ جاتا ہے معافی چاہتا ہوں فریقین کے والدین کو پسند آ جاتا ہے مگر فی الحال منگنی وغیرہ کی نوبت نہیں آئی دریں اثنا ناول کا ہیرو یوسف ناول کی ہیروئن کو شادی کی پیش کش کرتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ وہ آج تک اپنی والدہ کی خواہش کو ٹالتا آ رہا تھا کیونکہ اس پر اپنی بہنوں کی شادی کا بوجھ تھا جن میں سے دو کی شادیاں کر

چکا ہے تحسین کی شادی ابھی کرنی ہے بلکہ وہ بتاتا ہے کہ اس نے اپنے عزیز وطن کو بھی محض اس لئے الوداع کہا ہے تاکہ وہ اپنے گھریلو فرائض سے عہدہ برآہ ہو سکے۔ مگر اب وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو چکا ہے چنانچہ وہ گھر کے علاوہ اپنی حالت پر بھی توجہ دے رہا ہے۔ ہیروئن جو دل و جان سے ہیرو سے محبت کرتی ہے اس پیش کش پر خوشی سے پھولے نہیں سماتی اور جھجکتے جھجکتے اپنی والدہ کو اپنی پسند سے آگاہ کرتی ہے۔ والدہ رضامند ہو جاتی ہے مگر پیشتر اس کے کہ نوبت شادی تک پہنچے وہ بیمار پڑ جاتی ہے۔ علاج وہی ڈاکٹر کمیل کر رہا ہے جو امیدوار نمبر ایک ہے۔ ایک دن پتہ چلتا ہے کہ شوگر کی زیادتی کی وجہ سے والدہ کے دونوں گردے متاثر ہو چکے ہیں اس ناول کا ہیرو جلد شادی پر بضد ہے کیونکہ اس کی چھٹی ختم ہو رہی ہے اور اسے واپس امریکہ جانا ہے۔

یہاں سے ناول کا کلائمکس شروع ہوتا ہے۔ یہی ہیروئن کے اندر ایک نہایت اذیت ناک کشمکش شروع ہو جاتی ہے وہ محسوس کرتی ہے کہ یوسف کے بغیر اس کی زندگی مکمل طور پر ویران ہے مگر یہ احساس بھی اسے تنگ کرتا ہے کہ اس کا بھائی امجد پہلے ہی امریکہ میں ہے، اب وہ بھی امریکہ چلی گئی تو ماں کی خدمت کون کرے گا" بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچتی ہے اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ وہ یوسف کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ یہ فیصلہ غم کے ایک پہاڑ کی طرح ناول سے ہیرو اور ہیروئن پر ٹوٹ کر گرتا ہے۔ ہیرو واپس امریکہ چلا جاتا ہے کچھ عرصے کے بعد ہیروئن کی والدہ انتقال کر جاتی ہے اور ناول کا اختتام ان لائنوں پر ہوتا ہے۔ "آج امی کا چالیسواں ہے اور آج ہی مجھے بھائی جان کا ٹیلی گرام موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے میرے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے اور اپنے نہ آسکنے کی وجہ "مصروفیت" بیان کی ہے!"

میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے ناول کی تلخیص بیان کرنے میں خاصا وقت لے لیا ہے، مگر یہ بہت ضروری تھا کیونکہ مجھے آپ کو بتانا ہے کہ جس کردار کو آپ "ہجر کی پہلی بارش" کا مرکزی کردار سمجھ بیٹھے ہیں وہ اس ناولٹ کا مرکزی کردار نہیں ہے۔ بظاہر اس ناولٹ کے دو مرکزی کردار ہیں ایک ہیرو اور دوسرا ہیروئن، لیکن آپ یقین کریں یہ وہ فنکارانہ چابکدستی ہے جس کا مظاہرہ مصنفہ نے اس ناولٹ میں کیا ہے جس سے یہ ناولٹ اردو میں موضوع کے لحاظ سے اپنی نوعیت کا پہلا ناول بن گیا ہے کیونکہ اس ناول کا مرکزی کردار دراصل ہیروئن کا بھائی امجد ہے جو امریکی زندگی کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے اپنی والدہ کے سوگ میں شرکت سے محروم رہ جاتا ہے۔ نرگس کنول اپنے اس ناولٹ میں متعدد مقامات پر مادی مفادات کے لئے اپنے وطن کو خیرباد کہنے والے افراد پر تنقید کرتی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ وہ مقامات ہیں جہاں ان میں اور دوسرے لوگوں میں کوئی فرق نہیں، فرق تو وہاں محسوس ہوتا ہے جب خود غرضیوں اور انسانی رشتوں کی حرمت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے اور انسان تمام مادی فوائد کو ٹھکرا کر اپنا وزن روپیہ زدوں انسانی رشتوں

کے پلڑے میں ڈال دے۔ نرگس کنول نے اپنے ناول میں اس نقطہ نظر کی وکالت کی ہے اور امجد کو اس مادی سوچ کا نمائندہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے جس کے نزدیک بہر حال ایک بڑا ڈرافٹ گھر بھیجنے اور عزیز و اقارب کے لیے تحفے تحائف ارسال کرنے سے ماں کی ممتا کے علاوہ اس کے اپنے ضمیر کی تشفی ہو سکتی ہے۔ میں نے مغرب میں مقیم پاکستانیوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے کیونکہ میں ان کے درمیان دو سال رہا ہوں' آپ یقین کریں ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے پردیس میں اپنی ماں اپنے باپ یا اپنے بھائی بہن کی وفات کی خبر نہ سنی ہو اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے ضمیر کی خلش میں مبتلا نہ ہو گیا ہو کہ وہ اپنے ان پیاروں کے جنازوں کو کاندھا تک نہ دے سکا تھا۔ بڑے سے بڑا بینک ڈرافٹ اپنی پیاری والدہ کے لئے رات بھر جاگنے اور اسے اپنی گود میں اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ آپ یقین کریں مغرب میں مقیم پاکستانی جب اس نوع کے حادثے سے دوچار ہوتے ہیں تو اس کے بعد انہیں بی ایم ڈبلیو کاریں ائرکنڈیشنڈ گھر اور دنیا جہان کی آسائشیں بچھو کی طرح ڈنک مارنے لگتی ہیں یہ ڈنک تو انہیں اس وقت بھی لگتے ہیں جب ان کی بچی کسی گورے سے شادی کر لیتی ہے اور ان آسائشوں کی قیمت تو انہیں اس وقت بھی ادا کرنا پڑتی ہے جب انہیں اعلیٰ ترین پوزیشنوں کا حامل ہونے کے باوجود دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے۔

امریکہ میں قیام کے دوران میرا دھیان بار بار ان تمام باتوں کی طرف جاتا تھا اور میرے لئے سب سے زیادہ اذیت ناک سوچ یہی ہوتی تھی کہ میری عدم موجودگی میں اگر میرے بوڑھے والد کو کچھ ہو گیا تو کیا دنیا کی بڑی سے بڑی خوشی بھی میرے اس غم کا مداوا بن سکے گی؟ چنانچہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس آ گیا ہوں اور میں خود کو دنیا کے خوش قسمت ترین انسانوں میں سمجھتا ہوں کہ میرے والد نے میری گود میں دم توڑا اور اب میرے بچے ان کی دعاؤں کے سائے میں ایسے ماحول میں پرورش پا رہے ہیں جن کی فضا میں میرے اپنے کلچر کی خوشبو سے رچی بسی ہے۔

ان سطروں میں یہ ذاتی واردات میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ مجھے نرگس کنول کی ژرف نگاہی پر حیرت ہوئی ہے۔ جس کا مظاہرہ انہوں نے اتنی آسانی سے مسئلے کی تہہ تک رسائی کی صورت میں کیا ہے۔ انہوں نے تفصیل میں جائے بغیر سرمایہ داری نظام میں انسانی جذبات و احساسات کے کچلے جانے کا نوحہ ایک ایسے کردار کے ذریعے پڑھا ہے جو بظاہر اس ناول میں ہیرو تو کیا ”ایکسٹرا“ بھی نظر نہیں آتا جو سٹیج پر ایک لمحے کے لئے بھی ظاہر نہیں ہوتا لیکن کہانی کا کلائمکس اس کے بغیر وجود میں نہیں آتا یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ اپنا وطن' اپنے عزیز و اقارب' اپنے دوست' اپنے گلی کوچے' اپنا کلچر یہ سب کچھ ایک گرین کارڈ کی مار ہے یہ وہ تلخ حقیقت ہے جس کا مشاہدہ امریکن تو نصیحت کے باہر لگی ان طویل قطاروں سے کیا جا سکتا ہے جس میں اسلام کے لیے جان قربان کر

دینے والے اور پاکستان کے لئے آہیں بھرنے والے اس ملک کے لئے اپنا ویزہ حاصل کرنے کے لئے اپنے نمبر کا انتظار کرتے ہیں جو اسلام اور پاکستان کا دشمن نمبر ایک ہے۔ گذشتہ دنوں "مجاہد اسلام" صدام حسین کی حمایت اور امریکہ کی مخالفت میں بڑے عظیم الشان جلوس شہر میں نکلے اگر اس جلوس میں کوئی ایک شخص کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دیتا کہ "برادرانِ اسلام آپ میں سے جن حضرات کو امریکہ کا ویزہ چاہیے وہ براہ کرم ایک طرف ہو جائیں" تو آپ یقین کریں یہ برادرانِ اسلام ایک سیکنڈ کی تاخیر کئے بغیر جلوس میں سے نکل جاتے اور پھر امریکی قونصلیٹ کے باہر قطار میں لگے ہوئے نظر آتے ہیں آخر میں نرگس کنول کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے بہت فنکارانہ مہارت کے ساتھ اس موضوع کو برتا ہے۔ جسے ابھی تک کسی سے چھوا نہیں گیا تھا اور یہ کارنامہ وہی سرانجام دے سکتی تھیں۔ آخر وہ نجیب احمد کی بہن ہیں!

◆◆◆

([illegible])

ننگِ اسلام بزرگ!

عام حالات میں ہمارا بازاری لنچ سادہ چنوں اور دو روٹیوں پر مشتمل ہوتا ہے لیکن جب ہم قوم کی زبوں حالی اور اپنے اردگرد افلاس کی تصویریں دیکھ کر مغموم ہوں تو اس روز مرغ کھاتے ہیں' تاکہ غم بھلانے میں مدد ملے۔ گزشتہ روز ہم پر کچھ اسی قسم کی کیفیت طاری تھی چنانچہ ہم نے مرغ چھولے منگوائے خاصے صحت مند مرغ کا ایک ضخیم حصہ ہمارے سامنے پلیٹ میں دھرا تھا' لیکن جب ہم کھانے بیٹھے تو یوں لگا جیسے ربڑ چبانے کی کوشش میں مشغول ہوں۔ جب کوشش بسیار کے باوجود ہماری یہ سعی ناکام ہی رہی تو ہم نے دکاندار سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بھیا' یہ کیا پکایا ہے؟"

"مرغ" اس نے جواب دیا۔

"ہم سمجھے "شتر مرغ" ہے!" ہم نے ایک بار پھر ڈرتے ڈرتے کہا۔

خدا کا شکر ہے کہ دکاندار کی حس مزاح کچھ اتنی کمزور نہ تھی کہ یہ سن کر وہ پانچ روپے کا نوٹ ہمارے منہ پر دے مارتا اور کچھ اسی قسم کی بات کہتا جو انڈے کے چھوٹا ہونے کی شکایت کرنے والے ایک گاہک کو کسی دل جلے دکاندار نے کہی تھی' بلکہ وہ تو خاصا ایماندار اور سادہ لوح بھی نکلا' اس نے ہنس کر کہا۔

"جناب! بات دراصل یہ ہے کہ جوان مرغ ذرا مہنگے داموں دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس "بزرگ مرغ" سستے داموں مل جاتے ہیں' یہ جو آپ کھا رہے ہیں خاصا بزرگ مرغ ہے اسی لئے آپ کو چبانے میں دشواری محسوس ہو رہی ہے۔"

دکاندار کی یہ وضاحت سن کر ہمیں اندازہ ہوا کہ بزرگوں کے ساتھ کسی ایک شعبہ زندگی میں نہیں بلکہ ہر جگہ زیادتی ہو رہی ہے وہ بیچارے سستے داموں بکتے بھی ہیں مگر خریدنے والا پھر بھی ناک بھوں چڑھاتا ہے اور اس کے برعکس جوان مرغ کو مہنگے داموں خرید جاتا ہے اور ان کے قصیدے بھی پڑھے جاتے ہیں بلکہ بزرگوں کے ساتھ ان زیادتیوں کا سلسلہ تو بہت اہم جہت ہے اور بزرگ سیاستدان خصوصاً ان زیادتیوں کا ہدف بنتے ہیں چنانچہ جب بھی ملک پر کوئی بحران آتا ہے گھوم پھر کر ان بزرگوں ہی کی شامت آتی ہے کہ تحریک پاکستان میں تو ان لوگوں نے مثبت کردار ادا کیا مگر قیام پاکستان کے بعد یہ لوگ کرپٹ ہو گئے اور انہی ان کرتوتوں

کے منطقی نتیجے کے طور پر وہ مجبور ہو گئے کہ اپنی آنکھوں کے سامنے ملک ٹوٹتا دیکھیں اور مہر بہ لب رہیں۔ ان بزرگ سیاستدانوں کے ساتھ یہ بات زیادتی کے ضمن میں بھی آتی ہے کہ اس نوع کے طعنے انہیں عموماً انہیں حلقوں سے سننے پڑتے ہیں جنہوں نے ان بزرگوں کو سستے داموں خریدا ہوتا ہے ہوتا یوں ہے کہ "بلی" چھڑانے کے بعد انہیں اپنے دسترخوان پر لاتے ہیں اور پھر لقمہ منہ میں ڈال کر چبانے کی اور پھر نگلنے کی کوشش کرتے ہیں یہ چبائے اور نگلے نہیں جاتے تو پھر انہیں اگلنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جب اس میں بھی کامیابی نہیں ہوتی تو پھر ایسے مرغ کو شتر مرغ کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی جاتی ہے۔

بزرگوں کے ساتھ یہ زیادتی سیاسی زندگی کے علاوہ معاشرتی زندگی میں بھی ہو رہی ہے ہماری آپ کی نگاہ نارکلی میں ادھر ادھر بھٹک جائے تو ہم ٹوکنے والے کو یہ شعر سنا کر فوراً "پدرا" کر دیتے ہیں۔

سبھی مجھ سے ہی کہتے ہیں کہ نیچی رکھ نظر اپنی
کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں میاں ہو کر

جس پر وہ بے چارہ لاجواب ہو کر خاموش ہو جاتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ عالم شباب کی مجبوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شک کا فائدہ دے کر بری کر دیتا ہے لیکن اگر کوئی بزرگ بینائی کمزور ہونے کی بناء پر خواہ اپنی کسی عزیزہ کو پہچاننے ہی کی کوشش میں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے میں مشغول ہو اور ایسا اکثر ہوتا ہے تو یار لوگ یوں برا مانتے ہیں گویا ان کی حق تلفی ہو رہی ہو۔ یورپ اور امریکہ میں بھی ایسے بزرگوں کو ناحق برے برے ناموں سے پکارا جاتا ہے جس میں سے ایک نام "ڈرٹی اولڈ مین" بھی ہے جس کا سلیس ترجمہ "نظر کی بزرگ" ہے۔

متذکرہ کوائف کی روشنی میں ہم دنیا کے تمام خطوں میں پائے جانے والے ایسے بزرگوں کے خلاف کی جانے والی زیادتیوں کی بھرپور مذمت کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ فوراً ختم کیا جائے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یک نہ ایک دن ہمارا شمار بھی بزرگوں میں ہوتا ہے، اور ہمیں خدشہ ہے کہ ہم ان بزرگوں سے کچھ مختلف بھی نہیں ہوں گے۔

◆◆◆

خواتین کی "حق تلفی"

تحریک آزادیٔ نسواں کی علمبردار خواتین سے امریکہ میں تو ہماری مڈبھیڑ ہوتی رہتی تھی اور ان سے علمی مباحثے بھی ہوتے تھے مگر پاکستان میں کبھی ان سے دوبدو ملاقات نہیں ہوئی۔ اگر کبھی کسی کے بارے میں بتایا بھی گیا کہ یہ محترمہ عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کی مبلغ ہیں تو صرف دو تین بار شرف ملاقات حاصل ہونے پر یہ کھلا کہ موصوفہ مردوں سے برابری کے حقوق کی طلب گار تو ہیں مگر وہ توقع رکھتی ہیں کہ مرد ان سے اٹھ کر بسیں ان کے لئے نشست خالی کریں، ان کے لئے کار کا دروازہ کھولیں، ان کی کسی درشت بات کا جواب درشت لہجے میں نہ دیں، حتیٰ کہ گالیاں کھا کے بھی بے مزا نہ ہوں کہ مردوں اور عورتوں کی برابری کا مسئلہ اپنی جگہ عورتوں کے لئے یہ سب مراعات مردوں کی "شیولری" کا تقاضا ہیں، چنانچہ ہم نے ایسے بہت سے مردوں کو دیکھا ہے جن کی "شیولری" نے دیکھتے دیکھتے انہیں "شوفر" کے مرتبے پر فائز کر دیا اور ظاہر ہے۔

"یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا"

بھلا ہمارے اور آپ کے حسد کرنے سے کیا ہوتا ہے اور اب اگر سچ پوچھیں تو یہ سب باتیں جو ہم نے کی ہیں محض اپنے باتونی ہونے کی وجہ سے کی ہیں، کیونکہ کہنا ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ عورتوں کے حقوق کے لئے لڑنے والی خواتین عورتوں کے ساتھ ہونے والی کیسی کیسی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتی رہتی ہیں، مگر ایک ناانصافی کی طرف ان کا دھیان کبھی نہیں گیا، اور یہ ناانصافی خواتین کو مخاطب کرنے کے ضمن میں ہے اس کی وضاحت کچھ یوں کی جا سکتی ہے کہ کسی مرد کو اگر خط میں مخاطب کرنا ہو تو اس کے لئے کتنے ہی لفظ ہیں، مثلاً مکرمی محترمی، عزیز دوست، قبلہ و کعبہ، حضور والا، برادرم اور پیر و مرشد وغیرہ، اگر یہ لفظ کم پڑ جائیں تو محمد طفیل کے خاکوں کی کتابوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے جن کے نام غالباً اسی مشکل کو آسان کرنے ہی کے لئے رکھے ہیں، جب کہ عورتوں کو مخاطب کرنے کے لئے ایسے لفظوں کا سخت قحط ہے۔ مثلاً اگر انہیں مکرمی کے مقابلے میں مکرمہ کہنے کی کوشش کی جائے تو دھیان مقدس مقامات کی طرف چلا جاتا ہے "محترمہ" کے لفظ کا استعمال جس طرح ہوتا ہے اس کے پیش نظر محترمہ کہنے کے بعد باقاعدہ ڈائیلاگ بولنے کو بھی جی چاہتا ہے اسی طرح ایک عزیز دوست کے جواب میں "عزیز سہیلی" کے لفظ خواتین تو ایک دوست کو لکھ سکتی ہیں، مگر مرد اس ذیل میں نہیں آتے۔ یہ لفظ لکھنے سے ان کی سیکس خطرے میں پڑ جاتی ہے اب قبلہ و کعبہ کتنا اچھا لفظ ہے مگر اس پر بھی صرف مردوں کا اجارہ

ہے۔ آپ کسی خاتون کو قبلہ و کعبہ نہیں کہہ سکتے "قبلی کعبی" ہی کہہ سکتے ہیں البتہ برادرم کے جواب میں "بہن جی" لکھا جا سکتا ہے۔

مگر اس تخاطب سے یوں لگتا ہے جیسے بانو بازار میں کسی پراندے بیچنے والے نے آواز لگائی ہو، باقی رہا پیر و مرشد کہنے کا مسئلہ تو اگر کوئی "پیری و مرشدی" بنا کر سمجھے کہ اس نے زبان اور اپنے تخاطب کے ساتھ انصاف کیا ہے تو اس کی سزا وہ خود پائے گا کیونکہ کسی خاتون کو 'پیری' کا طعنہ اپنے رسک ہی پر دیا جا سکتا ہے ہاں ایک لفظ 'آنجنابہ' بھی ہے مگر نہ جانے کیوں ہمیں اس کی ساؤنڈ طنزیہ سی لگی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کو مخاطب کرنے کی بجائے طعنے مارے جا رہے ہوں بلکہ یہ آنجنابہ تو ہمیں کوئی آنجہانی قسم کی چیز لگتی ہے سوال یہ گیند حقوق نسواں کی علمبردار خواتین کی کورٹ میں ہے، اگر وہ جذبہ صادق رکھتی ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اوّلین فرصت میں لفظوں پر مردوں کی اس اجارہ داری کے خلاف آواز اٹھائیں!

حقوق نسواں کی علمبردار خواتین کو اس اہم مسئلے کی طرف توجہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دراصل اس کے پس منظر میں مرد اِستعمار کی استعماری فطرت جھلک رہی ہے اور وہ استعماری فطرت یہ ہے کہ وہ عورت کو صرف ایک مقام دینے کے لئے تیار ہے اور یہ مقام وہ ہے جو تصویر میں رنگ کا ہوتا ہے چنانچہ اس خیال کی تشریح و تفسیر سے دیوان بھرے ہوئے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ تمام شعراء غزل کا موضوع صرف محبوب کو بناتے ہیں بیوی کو یعنی اپنی بیوی کو کوئی نہیں بناتے، چنانچہ آج تک مولانا حالی اور عارف عبدالمتین کے علاوہ کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اپنی شاعری میں بھی بیویوں کے حقوق پورے کرتے، یہ بات درمیان میں دراصل ایک اور بات کہنے کے لئے آ گئی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ انہی شاعروں اور ان کے بھائی بندوں نے اپنے جذبوں کی تسکین کے لئے تو کتنے ہی کول الفاظ برائے تخاطب اختراع کئے ہیں مثلاً جانِ من، جانِ جاناں اور ایسے ہی بیسیوں دوسرے الفاظ جن میں سے ہر ایک پر شرفاء کے منہ سے لاحول ولا قوۃ نکلتا ہے مگر جونہی یہ رشتہ درمیان سے غائب ہوا یہ فصیح البیان اہل زبان گونگے بن کر رہ گئے اور ہمارے آپ کے لئے محترمہ آنجنابہ یہ طرز تخاطب چھوڑ گئے اس پر ہم نے تو خیر احتجاج کرنا ہے البتہ حقوق نسواں کی علمبردار بہنوں سے ہم ضرور گزارش کریں گے کہ وہ مردوں کی اس استعماری فطرت کے خلاف آواز اٹھائیں کہ اصلی خواتین تو یہی ہیں باقی بے چاری تو گائیں بھینسیں ہیں اور ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کی اس آواز میں ہم ایسے کتنے ہی نیک نفس مردوں کی آواز شامل ہوگی اور یہ آواز ہم بدست خود اٹھاتے مگر داناؤں نے کہا ہے کہ

جس کا کام اسی کو ساجھے
اور کرے تو ٹھینگا باجے

اور حقوق نسواں کی علم بردار بیبیوں کے جس ذہن کے احتجاج ہم آج کل دیکھ رہے ہیں اس کے پیش نظر یہ کام، نبی کو "سمجھتا"
ہے۔

◆◆◆

غفار خان کی عید!

خان عبدالغفار خان کے بارے میں خبر شائع ہوئی ہے کہ انہوں نے ملک کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر عید نہ منانے کا فیصلہ کیا ہے' تاہم وہ عید کے روز چارسدہ میں نماز ادا کریں گے اور خطاب بھی کریں گے۔ یہ خبر پڑھ کر ہم سوچ میں پڑ گئے ہیں کہ خان صاحب عید کی نماز بھی ادا کریں گے اور خطاب بھی فرمائیں گے تو پھر عید نہ منانے کے لیے انہوں نے کیا "انتظامات" کئے ہیں؟ ہماری سمجھ میں جو بات آتی ہے اس کے مطابق خان صاحب عید کا بائیکاٹ غالباً کچھ اس صورت میں کریں گے کہ عید کی صبح کو سحری کے وقت ٹین کھڑکانے والا جب ان سے عیدی لینے آئے گا تو وہ اس سے معذرت کریں گے اور کہیں گے کہ ملک کی موجودہ سیاسی حالت کے پیش نظر وہ اسے عیدی نہیں دے سکتے' ویسے بھی تم آدھی رات کو کنستر کھڑکا کھڑکا کر مظلوم کنستر کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہوتے رہے ہو اور یوں تم نے "عدم تشدد" کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے' لہٰذا تمہیں تو عیدی دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ڈاکیہ ان سے عیدی وصول کرنے آئے گا تو اسے کہیں گے کہ تم آج تک کونسی اچھی خبر لائے ہو جو آج عیدی وصول کرنے آ گئے ہو' گھر کے ملازم عیدی طلب کریں گے تو نہیں ڈانٹ پلائی جائے گی کہ تم نے یا تمہارے بڑوں نے پاکستان کے سلسلے میں صوبہ سرحد میں ہونے والے ریفرنڈم میں کونسی میری بات مانی تھی جو میں آج تمہیں عیدی دوں' اسی طرح بچوں سے کہا جائے گا کہ بچو! تم تو میرے بچے ہو' تم جانتے نہیں ملک کے سیاسی حالات کی وجہ سے میں عید نہیں منا رہا' لہٰذا میں تمہیں عیدی بھی نہیں دے سکتا بلکہ تمہیں جو عیدی وصول ہو وہ میرے پاس جمع کرو' مجھے بھارت نے جو تھیلی پیش کی تھی میں یہ رقم اس میں شامل کر کے ملک و قوم کی زیادہ اعتماد سے خدمت کر سکوں گا لیکن بچے تو آخر بچے ہوتے ہیں چنانچہ اگر انہوں نے پوچھ لیا کہ دادا ابا' یہاں ملک سے آپ کی مراد کون سا ملک ہے اور قوم سے مراد کونسی قوم ہے؟ تو باچا خان انہیں کیا جواب دیں گے' کچھ نہ کچھ تو خیر جواب دیں گے کیونکہ تجربہ بڑی چیز ہوتی ہے۔

عید نہ منانے کے سلسلے میں خان عبدالغفار خان کا اگلا اقدام غالباً یہ ہوگا کہ وہ اس روز سویاں نہیں کھائیں گے' اس کی پہلی وجہ تو یہی ہوگی کہ وہ عید نہیں منا رہے تاہم دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سویاں کھانا صرف ایک مہذب آدمی کا نہیں' تین چار آدمیوں کا کام ہوتا ہے ایک آدمی کھائے اور باقی تین آدمی سویاں سنبھالنے کے لیے درکار ہوتے ہیں' کیونکہ سویاں کھاتے ہوئے چمچے اور منہ کے درمیان کئی سخت مقامات آتے ہیں اور ایک تیسری وجہ ممکن ہے یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے سویاں کھانے کو بدعت قرار دے رکھا

ہے اور غفار خان اب آخر کار "موحد" ہو گئے ہیں' کیونکہ انہیں "بتوں" کی طرف سے رنج بھی تو بہت ملے ہیں۔

اور عید نہ منانے کا ایک طریقہ یہ بھی ممکن ہے کہ خان صاحب جب چارسدہ میں نماز عید ادا کریں اور نماز عید کے بعد لوگ انہیں عید ملنے کے لئے آگے بڑھیں تو خان صاحب یہاں بھی معذرت کر دیں اور کہیں کہ میں ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کی وجہ سے تمہیں گلے نہیں لگا سکتا' ویسے بھی تم لوگ اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں گلے لگایا جائے۔ تم سرحد پار سے آنے والے افغان مہاجرین کو مجھ سے اجازت لئے بغیر گلے لگا رہے ہو' تم ظالم پنجابیوں کو گلے لگاتے ہو اور پاکستان کے لئے تو گلے کٹاتے بھی ہو لہٰذا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تم عید مناؤ' تم نے آج تک میری کون سی بات مانی ہے جو آج میری مانو گے بلکہ ممکن ہے کہ عید کے روز یہ سب کچھ دیکھ کر ان پر اتنی رقت طاری ہو کہ جب رات کو عید کے ہنگامے سرد پڑ جائیں تو وہ اسی پرسوز آواز میں کہ پے در پے ناکامیوں کے بعد آواز بہر حال پرسوز ہو جاتی ہے' مکیش کا یہ گیت گنگنانا شروع کر دیں کہ

مجھ کو اس رات کی تنہائی میں آواز نہ دو
مجھ کو جو ساز رلا دے مجھے وہ ساز نہ دو

مگر یہ "نے نوازی" بعد از وقت ہو گی اور یوں ان کے کام نہ آ سکے گی کہ عید کا سارا دن لوگ عید کا ساز بجاتے ہوں گے بلکہ اگلے روز بھی یہ ساز بجیں گے جو بڑے خان صاحب کو ایک بار پھر رلا دے گا۔

ویسے ایک بات جو ہمیں سمجھ نہیں آئی اور سمجھ اس لئے نہیں آئی کہ خبر میں اس کی کوئی وضاحت موجود نہیں اور وہ یہ کہ خان صاحب نے ملک کی جس سیاسی صورت حال کے پیش نظر عید نہ منانے کا فیصلہ کیا ہے وہ سیاسی حالات ان کے نزدیک کیا ہیں؟ یہ ان کے نزدیک والی "قید" ہم نے اس لئے لگائی ہے کہ جو سیاسی بلکہ سماجی اور معاشی صورت حال ہے وہ بہر حال ہمارے پیش نظر ہے یعنی یہ کہ انتخابات نہیں ہو رہے' دہشت گردی اور لاقانونیت زوروں پر ہے' عوام مہنگائی کی چکی میں پس رہے ہیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں اور اس پر بہت مضطرب ہیں لیکن خان صاحب کی شکایتیں بھی اسی نوعیت کی ہیں' ممکن ہے اسی نوعیت کی ہوں' لیکن جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق' خان عبدالغفار کو ایک عظیم محب وطن قرار دے چکے ہیں اور خان صاحب بھی ان سے وعدے وعید کر چکے ہیں کہ وہ ان سے مکمل تعاون کریں گے اب یہ بیچ میں کیا رخنہ آن پڑا ہے کہ خان صاحب وعدے وعید تو کیا عید منانا بھی بھول گئے ہیں۔ یہ ضرور دشمنوں نے کوئی چال چلی ہے اور یوں "ظالم سماج" کا کردار ادا کیا ہے' لیکن ایک خیال ہمیں یہ بھی آیا ہے کہ عید وغیرہ کے سلسلے میں شاعر لوگ بھی بہت کچھ کہا کرتے ہیں یعنی وہ عید کے لئے نہ چاند کا نظر آنا ضروری سمجھتے ہیں اور نہ علامہ محمود احمد رضوی کے عید

ہونے یا عید نہ ہونے کے اعلان کو کوئی اہمیت دیتے ہیں بلکہ ان کی عید اسی روز ہوتی ہے جس روز انہیں محبوب کا چہرہ نظر آ جائے۔ ایک محبوب اپنے خان صاحب کا بھی ہے جس کا نام بیرک کارمل ہے خان صاحب بہت دنوں سے کابل نہیں گئے اور یوں ان کی آنکھیں اپنے محبوب کے دیدار کو ترس گئی ہیں' چنانچہ غفار خان کی عید تو اس روز ہوگی جس روز انہیں بیرک کارمل کا دیدار نصیب ہوگا یا پھر خدانخواستہ پاکستان میں بیرک کارمل جیسا کوئی چاند طلوع ہوگا سو اس چاند کو دیکھے بغیر خان صاحب کیسے عید منائیں۔ انہوں نے اپنے "روزے" خراب کرنے ہیں؟

◆◆◆

سگریٹ پینے والا شیر!

ان دنوں سگریٹ پینے والوں کی جان پر بنی ہوئی ہے' ادھر وہ ٹی وی آن کرتے ہیں ادھر ان کا موڈ آف ہو جاتا ہے' کیونکہ تھوڑی دیر بعد ٹی وی پر جو کمرشل دکھائی جاری ہوتی ہے اس کے مطابق سگریٹ پینے والوں کے دن گنے جا چکے ہیں اور

تک میر جگر سوختہ ہر کش کو زندگی کا آخری کش
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

کے مصداق یہ جگر سوختہ ہر کش کو زندگی کا آخری سمجھ کر لگاتے ہیں کہ آخر چراغ سحری کا کیا بھروسہ ہے؟

مگر جس طرح خود زہر میں زہر کا تریاق موجود ہوتا ہے' اسی طرح ٹی وی سے سگریٹ نوشی کے خلاف چلائی جانے والی اس مہم کا توڑ بھی خود ٹی وی نے نکالا ہے چنانچہ ان دنوں مختلف سگریٹ کمپنیوں کے کمرشلز بھی اس مہم کے شانہ بشانہ دکھائے جاتے ہیں جن میں سگریٹ نوشی کا گلیمر دکھایا جاتا ہے لیکن ان میں سب سے موثر فلم کے ٹو سگریٹ والوں کی ہے جس نے سگریٹ نوشوں کے حوصلے بلند کر رکھے ہیں ورنہ وہ تو ان دنوں خواجہ اسلام کی کتاب "موت کا منظر' مرنے کے بعد کیا ہوگا" پڑھتے تھے اور گریہ کرتے تھے' جس کمرشل کا ذکر ہم کر رہے ہیں اس میں ایک شیر دل نوجوان کو دکھایا گیا ہے جو کے ٹو کا ایک سگریٹ پی کر ایک بپھرے ہوئے شیر پر حملہ آور ہوتا ہے اور سخت مقابلے کے بعد اسے چت گرا دیتا ہے اس پر ہمیں ایک کار کی سینہ کمرشل یاد آئی جس میں ایک دوشیزہ کو ہائی وے پر کار دوڑاتے دکھایا گیا ہے' اس کے اوپر فضا میں ایک ہوائی جہاز پرواز کر رہا ہے جو کار سے آگے نکلنے کی کوشش میں ہے مگر کار کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر پاتا' حتیٰ کہ جہاز کا پائلٹ جہاز کو ایک مناسب جگہ پر لینڈ کرتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دوشیزہ کے پاس پہنچتا ہے اور پوچھتا ہے یہ کار کس کمپنی کی ہے؟ جس پر دوشیزہ اس کمپنی کا نام بتاتی ہے اور ساتھ ہی یہ کمرشل ختم ہو جاتی ہے حالانکہ پوچھنے کی بات یہ تھی کہ یہ جہاز کس کمپنی کا ہے؟

اور اگر شیر کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو آج جنگل کے اس نام نہاد بادشاہ کا پول کھول ہی دیں' خیر ہم نے یہ پول کیا کھولنا ہے ہماری طرح ہزاروں دوسرے ناظرین نے بھی جنگل پر فلمائی گئی وہ حقیقی فلم ضرور دیکھی ہوگی جس میں جنگل کا یہ بادشاہ جھاڑیوں کی اوٹ سے ایک بارہ سنگھے پر حملہ آور ہوتا ہے مگر جب بارہ سنگھا جوابی حملہ کرتا ہوا اس کی پسلیوں میں اپنے سینگ چبھوتا ہے اور اسے دھکیلتا ہوا دور تک

لے جاتا ہے تو تھوڑی ہی دیر بعد یہ بادشاہ سلامت دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے۔ یہ فلم دیکھ کر شیر کے بارے میں ہمارے تمام تصورات خاک میں مل گئے تھے اوپر سے کسی رسالے میں ہم یہ بھی پڑھ بیٹھے کہ جنگل کے یہ بادشاہ سلامت درحقیقت انتہائی سست الوجود مخلوق واقع ہوئے ہیں' ان کی آنکھیں سارا دن تارے گننے میں لگی رہتی ہیں کہ کہیں فضا میں منڈراتی ہوئی گدھیں انہیں نظر آ جائیں' یہ فوراً وہاں پہنچ جاتے ہیں کہ یقیناً یہیں کوئی جانور مرا پڑا ہوگا' چنانچہ بیشتر صورتوں میں یہ بادشاہ سلامت مردار پر گزارہ کرتے ہیں اپنے ہاتھ پاؤں صرف اسی صورت میں ہلاتے ہیں جب گدھ خود ان کے سر پر منڈلانا شروع کر دیتے ہیں سو ہمارا خیال تو یہ ہے کہ شیروں نے اپنی بہادری کے قصے خود پھیلائے ہیں یا یہ کہ ان کے پاس کچھ جھوٹے قسم کے پی آر او ہیں' جن سے ان کا ایجنٹ بنا ہوا ہے ورنہ شیر کوئی ایسی طاقت ور مخلوق نہیں جس سے مرعوب ہوا جائے' سے بھگانے کے لیے تو یک بارہ سنگھ کافی ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے سینگوں سے خود کو کھجلانے کے بجائے انہیں بادشاہ سلامت کو چبھونے کے کام لائے۔

پس ثابت ہوا کہ ٹی وی پر دکھائی جانے والی سگریٹ کمرشل میں اگر شیر دل نوجوان سگریٹ کا ایک کش لگا کر شیر کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے' ورا سے چت گرا دیتا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں یا دوسرے لفظوں میں اس میں سگریٹ کا اتنا کمال نہیں جتنا شیر کے زوال کا ہے' تاہم ایک خیال ہمارے ذہن میں یہ بھی آتا ہے کہ شیر بہرحال شیر ہوتا ہے۔ وہ بالکل گیا گزرا بھی ہو' تو بھی تو وہ شیر رہتا ہے' چنانچہ متذکرہ ٹی وی کمرشل پر ایمان لانے کو کچھ جی نہیں چاہتا۔ اس شک کا اظہار ہم نے اپنے ایک دوست سے کیا' تو اس نے ہمارے شک کی تصدیق کی اور کہا "تم ٹھیک کہتے ہو' لیکن اس کمرشل میں سگریٹ کی جو کرامت دکھائی گئی ہے وہ درست ہے' البتہ قدرے مختلف ہے' ہم نے پوچھا وہ کیسے؟ بولا" وہ یوں کہ سگریٹ اس نوجوان کو نہیں' مقابلے سے پہلے شیر کو پلایا گیا ہے' بلکہ یہ شیر تو مجھے عادی سگریٹ نوش لگتا ہے' ورنہ وہ ایک جھٹکے میں یوں نیچے نہ آن گرتا' مجھے تو شبہ ہے کہ یہ شیر نہیں کوئی شاعر ہے میں نے اسے حلقہ ارباب ذوق میں بیٹھ کر سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے اور بحث کرتے دیکھا ہے۔"

◆◆◆

دال روٹی!

سبحان اللہ دعوت تو کل ہم نے کھائی ہے اس دعوت میں شرکت سے قبل میزبان کی مہمان نوازی کے صرف قصے ہی سنے تھے مگر شریک طعام ہوئے تو معلوم ہوا کہ جو سنا تھا وہ کم تھا اس دعوت میں شہر کے چیدہ چیدہ لوگ شامل تھے جب دستر خوان بچھا تو ہم نے دیکھا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک انواع واقسام کی دالیں سجی ہوئی تھیں بس آپ کوئی بھی دال تصور میں لائیں وہ اس دستر خوان پر موجود تھی۔ چنے کی دال، مونگ کی دال، ماش کی دال، مسور کی دال گویا جدھر دیکھتے تھے ادھر دال ہی دال تھی ہمارے اس میزبان کو گھوڑ سواری کا بھی بہت شوق ہے چنانچہ باہر دو عربی نسل گھوڑے بھی اس کے تھان میں بندھے تھے۔ ہم جب تک مصروف طعام رہے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز ہمیں سنائی دیتی رہی۔ وہ بار بار اپنے کھر بھی زمین پر مارتے تھے اس وقت تو ہم نے کھانے سے ہاتھ نہ کھینچے مگر اب ضمیر نے ملامت کیا ہے کہ تم نے "غریب مار" کی یہ بے زبان رات کو بھوکے سوئے ہوں گے۔ یہ ضمیر بھی عجیب چیز ہے غلط کام سے نہیں روکتا صرف اس کا مزا کرکرا کرتا ہے۔

مگر یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے کیونکہ چند روز قبل ایک اور دعوت میں بھی ہم شریک ہوئے تھے میزبان خیر سے بڑے معقول شخص ہیں لیکن جب دستر خوان کھلا تو جو کچھ سنا تھا وہ سب فسانہ معلوم ہوا ایک ڈش اٹھا کر دیکھی تو اس میں گھوڑا مرغ تھا، دوسری میں بھنا تو نرگسی کوفتے، تیسری میں مچھلی کے قتلے چوتھی میں بکری کی روسٹ رانیں اور باقیوں میں بھی یہی رہا تھا اوپر سے موصوف نے بڑا تیر مارا تھا یعنی بریانی بنائی ہوئی تھی۔ تین چار سویٹ ڈشیں بھی بھاڑ سا منہ کھولے دستر خوان پر دھری تھیں۔ ہم لوگ نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کہ شاید اس کنجوس مکھی چوس نے ایک آدھ ڈش دال کی بھی اپنا بھرم رکھنے کے لئے کہیں چھپا رکھی ہو مگر یہاں کوئی "جرأت رندانہ" بیانہ تھا جسے بار آخر "پائندہ" کہنے کا موقع ملا ہو سو یاروں نے یہاں کھانا کیا کھانا تھا بس زہر مار کیا اور ہاتھ دھو کر اپنے گھروں کی راہ لی اب یہ میزبان شہر میں منہ چھپاتا پھرتا ہے۔

یہ دونوں دعوتیں ہم ذہن میں لائے اور ہمیں ملا نصیر الدین کا وہ لطیفہ یاد آیا جب ایک شخص ملا کے پاس آیا اور کہا "آپ کا بڑا کرم ہوگا اگر آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔" ملا نے کہا "میاں تکلف کی کوئی بات نہیں جو دال روٹی ہم گھر میں کھاتے ہیں وہی حضور کی نذر کروں گا۔" ملا جب رات کو اس شخص کے گھر پہنچے دستر خوان کھلا تو دیکھا وہاں واقعی دال روٹی دھری تھی۔ اس اثنا میں

میزبان کا بچہ اپنے باپ کے پاس آیا اور اس سے پیسے مانگے میزبان نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "دفعہ ہو جاؤ یہاں سے اگر تم نے اب پیسے مانگے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا" ملا نے فوراً بچے کو گود میں اٹھایا اور اسے پچکارا اور کہا کہ ابو سے سب واقعی پیسے نہ مانگنا' یہ شخص جو کہتا ہے وہی کرتا ہے!"

دراصل اس موقع پر یہ لطیفہ ہمیں یوں یاد آیا کہ بعض حلقوں کی طرف سے اس کی عجیب و غریب توجیہات کی جاتی ہیں کچھ مفسد قسم کے لوگ تو ماضی میں اسے دال کے خلاف استعمال کرتے آئے ہیں۔ اور اس لطیفے سے نتیجہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ ملا دسترخوان پر دال روٹی دیکھ کر بدمزہ ہو گئے تھے چنانچہ انہوں نے موقع پاتے ہی میزبان پر چوٹ کر دی حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے معاملہ یہ ہے کہ دال صرف آج ہی نایاب نہیں عہد ملا نصیر الدین ہی کے وقت سے نایاب ہے اور انہوں نے جب دسترخوان پر دال دیکھی تو فرط مسرت سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور پھر انہوں نے موقع پاتے ہی میزبان کے متعلق یہ کہہ کر سے خراج تحسین پیش کیا کہ اس شخص کے قول و فعل میں تضاد نہیں یعنی جو کہتا ہے وہی کرتا ہے پرانے زمانے ہی سے دال کی نایابی والے خدشے کی تصدیق اس مراثی کے واقعے سے بھی ہوتی ہے جو کسی دوسرے گاؤں میں اپنے ایک عزیز کے ہاں مہمان ہوا۔ انہوں نے اس کی بہت آؤ بھگت کی اور پھر میاں بیوی آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ آج کیا پکانا چاہیے میاں نے کہا چنوں کی دال پکا لیتے ہیں۔ بیوی نے مونگ کی دال کا مشورہ دیا۔ اس وقت صحن میں مرغیاں بھی پھر رہی تھیں۔ مراثی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اس کے میزبان اپنی قیمتی دالیں اس کے لئے پکائیں چنانچہ اس نے اپنے میزبان کو مخاطب کیا اور کہا "باہر میرا گھوڑا بندھا ہے۔ آپ دو پکا لیں میں مرغی پر بیٹھ کر واپس گاؤں چلا جاؤں گا!"

"اور اب یہ گھوڑے کا ذکر آیا ہے تو ہمارا دھیان ایک بار پھر اس دعوت کی طرف چلا گیا ہے جس میں میزبان نے نوع واقسام کی دالوں سے معزز مہمانوں کی تواضع کی اور اس کے عزیز گھوڑے تھان پر بندھے ہنہناتے رہتے اور بار بار اپنے کھر زمین پر مارتے رہے۔ اس وقت تو ہمیں ان پر ترس آیا تھا لیکن ان دنوں دالوں کی اس قدر میزبانی دیکھ کر اچانک ہمیں خیال آیا ہے۔ کہ غریب مار "ہم نہیں' وہ تو یہ گھوڑے کرتے ہیں۔ جو انسانوں کا رزق کھا جاتے ہیں اور جس کے نتیجے میں بڑے بڑے متمول میزبان بھی ان دنوں دعوت کے بعد مہمانوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے پیشتر اس کے کہ گھوڑوں کی اس لوٹ کھسوٹ اور استحصال کے نتیجے میں انسانوں اور گھوڑوں کے درمیان طبقاتی کشمکش کا آغاز ہو صورتحال کا سدباب ابھی سے کرنا ہے ہم اس موقع پر استحصالی گھوڑوں کو یہ انتباہ کرنا بھی ضرور سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے از خود اپنے رویے میں تبدیلی نہ لائی تو ہم یہ معاملہ اپنے کامریڈ دوستوں کے سپرد کریں گے جس کے نتیجے میں خواہ ہمیں دال روٹی نہ ملے لیکن ان کا دانہ پانی تو بند ہو گا!

◆◆◆

فائیو سٹار ہوٹل

سفید پوش وہ ہے جو ماہی برکتے کے تندور سے کھانا کھا کر نکلے اور ہوٹل ہلٹن کے باہر کھڑے ہو کر خلال کرتا پایا جائے۔ مگر کچھ سفید پوش ایسے بھی ہیں جن کا "مقدّر" اگر کسی فائیو سٹار ہوٹل میں لگ جائے تو وہ وہاں سے کھانا کھا کر نکلتے ہیں اور ماہی برکتے کے تندور کے سامنے کھڑے ہو کر خلال کرنے لگتے ہیں۔ خود ہمارا شمار بھی انہی سفید پوشوں میں ہوتا ہے مگر ہم میں اور دوسرے سفید پوشوں میں فرق یہ ہے کہ مختلف میٹنگوں اور کانفرنسوں وغیرہ کے دوران ہمیں فائیو سٹار ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوتا ہے لیکن کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ہم عادتاً نہیں احتیاطاً چائے کسی ڈھابہ ہوٹل میں جا کر پیتے ہیں' احتیاطاً اس لیے کہ کانفرنس کے منتظمین بالعموم صرف کمرے کا کرایہ اور کھانے کا بل ادا کرتے ہیں' چنانچہ جو مہمان ان ہوٹلوں میں چائے پیتے ہیں' وہ اکثر اپنے "رسک" پر پیتے ہیں' بلکہ جن کانفرنسوں کا ہم نے ذکر کیا ہے' ان کے منتظمین کی طرف سے جو "ہدایت نامہ" جاری کیا جاتا ہے' اس میں ایک ہدایت یہ بھی ہوتی ہے کہ لانڈری اور استری وغیرہ کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے' چنانچہ جو سمجھدار مہمان ہیں وہ ہوٹل میں "استری" اپنے ساتھ لاتے ہیں۔

"جس طرح ہر کام کے پس پردہ کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے' اسی طرح یہ کالم لکھنے کی بھی ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ ہم ان فائیو سٹار ہوٹلوں کے بہت زخم خوردہ ہیں اور وہ یوں کہ کبھی کبھار اگر "مقدّر" نہ لگے تو وضع داری قائم رکھنے کے لئے اس "قماش" کے ہوٹلوں میں اپنے خرچ پر بھی ٹھہرنا پڑ جاتا ہے' بصورت دیگر احباب پر سفید پوشی کا بھرم کھل جاتا ہے' گزشتہ دنوں ہم نے ایک اسی قسم کے ہوٹل میں قیام کے دوران ناشتہ منگوایا اور ناشتے کے بعد بل کا مطالعہ شروع کیا تو اس میں انڈے کے چودہ روپے لگائے گئے تھے' ہم نے ویٹر سے پوچھا کہ بھائی اس انڈے کے سلسلے میں منیجر صاحب کو خود بھی کوئی زحمت اٹھانا پڑتی ہے جو ہم پر غصہ اتارنے کے لیے اتنے پیسے چارج کیے ہیں' مگر وہ بیچارا جواب میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

اسی طرح ایک دفعہ غلطی سے ہم نے شلوار کرتہ دھونے کے لئے دے دیا' شام کو دیا' صبح دس بجے چاہیے تھا' لانڈری بوائے نے کہا جناب ارجنٹ پڑے گا' ہم نے بے نیازی سے کہا پھر کیا ہوا؟! مگر پھر ہوا یہ کہ اس شلوار کرتے کی دھلائی کے ہمیں پچپن روپے ادا کرنا پڑے۔ جب کہ یہ سوٹ ہم نے مثل سے قریباً تیس روپوں میں خریدا تھا اور اس وقت اس کی ری سیل ویلیو تیس روپے سے

زیادہ دلکش تھی۔"

"ان فائیو سٹار ہوٹلوں کے خلاف ہمارے غصے کی ایک وجہ بلکہ بنیادی وجہ جو ہم نے ابھی تک نہیں بتائی تھی یہ ہے کہ ہم سفید پوشوں کی انا کو ٹھیس پہنچانے کے لئے ان میں سے ہر ہوٹل نے بجلی کی وائرنگ ٹیلی ویژن ریڈیو اور میوزک سسٹم فلش سسٹم اور اس طرح کے جتنے بھی دوسرے سسٹم ہیں دوسرے ہوٹلوں سے مختلف رکھے ہوئے ہیں اور ان میں کچھ اتنی پُراسراریت پائی جاتی ہے کہ اگر تلاش بسیار کے بعد بجلی لیمپ جلانے کا سوئچ مل گیا ہے تو باقی روم کی لائٹ آن کرنے کے "سسٹم" کا سراغ نہیں مل رہا۔ اسی طرح اگر میوزک آن کرنے کی "ٹیکنالوجی" تک رسائی ہو گئی ہے تو فلش سسٹم کا پتہ نہیں چل رہا۔ غرضیکہ ہر فائیو سٹار ہوٹل میں ایک نہ ایک "گھنڈی" ایسی رکھ دی جاتی ہے کہ ہر دفعہ جھجکتے جھجکتے ہوٹل کے ملازم کو بلانا پڑتا ہے اور اسے اعتماد میں لے کر پوچھنا پڑتا ہے کہ بھائی بتی کس طرح جلائی جاتی ہے۔ اور فلش کس طرح چلایا جاتا ہے اور اس کے جواب میں وہ موذی آپ کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ "پتہ نہیں کتھوں آ جاندے نیں" "بس یہی ان ہوٹلوں کا "بزنس سیکرٹ" بھی ہے کہ گاہک کو احساس کمتری میں مبتلا کرو اور اس کی آنکھیں اتنی چکا چوند کر دو کہ وہ ہر دفعہ

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

والا شعر پڑھتے ہوئے ہوٹل سے رخصت ہو اور اس طرح رخصت ہو جس طرح سکندر دنیا سے رخصت ہوا تھا!

"تاہم واضح رہے کہ ہم نے ابھی تک ان ہوٹلوں کا صرف تاریک رخ دکھایا ہے۔ روشن رخ تو دکھایا ہی نہیں اور ان ہوٹلوں کا رخ "روشن" تو ایسا ہے کہ پروانوں کو سمجھ ہی نہیں آتی کہ وہ شمع کی طرف جائیں یا اس رخ روشن کا طواف کریں مثلاً ایک مثبت پہلو ان ہوٹلوں کا یہ ہے کہ جو کاروباری سودے لاکھوں میں طے ہونے ہوتے ہیں وہ ان ہوٹلوں کے ذریعے کروڑوں میں طے ہو سکتے ہیں۔

ان ہوٹلوں میں اٹھنے بیٹھنے اور بیٹھنے والا شخص اس قدر معزز سمجھا جاتا ہے کہ اس کا کالا دھن بھی سفید ہو جاتا ہے بلکہ بیشتر صورتوں میں تو خون سفید ہو جاتا ہے۔ دوسروں کو چھوڑیں انسان اپنے طور پر خود کو اتنا معزز لگنے لگتا ہے کہ اسے دوسرا کوئی شخص معزز ہی نہیں لگتا اور یوں ان پر ہوٹلوں کے ذریعے معاشرے میں عزت کا جو "خود تشخیصی نظام" نافذ ہوا ہے اس کے نتیجے میں ساری قدروں پر از سر نو نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے تاہم ان معاشی اور معاشرتی حوالوں کے علاوہ ان فائیو سٹار ہوٹلوں کی ایک قومی خدمت

بھی ہے۔ جسے کم از کم ہم پاکستانی فراموش نہیں کر سکتے' سقوط مشرقی پاکستان کے موقع پر جب عام پاکستانی مکتی باہنی اور بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں گاجروں مولیوں کی طرف کٹ رہے تھے۔ ہمارے بڑے بڑے افسروں اور معززین نے ڈھاکہ کے ایک فائیو سٹار ہوٹل ہی میں پناہ لی تھی!

◆◆◆

بھولے بادشاہ!

آج کے دور میں پتہ نہیں کون لوگ ہیں جنہیں شہنشاہوں کی زندگی پر رشک آتا ہے' ہم تو ان بے چارے شہنشاہوں کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان پر ترس آتا ہے لاہور کے شاہی قلعے میں واقع ہم نے شیش محل کی صورت میں مغل بادشاہ کی قیام گاہ دیکھی ہے جس کمرے کو اس کا بیڈ روم بتایا جاتا ہے وہ کمرہ 12x10 سائز کا ہے۔ موصوف نے بڑی عیاشی کی ہوگی تو اس کے در و زوں پر نہایت اعلیٰ درجے کے پردے لٹکائے ہوں گے' چھت پر قیمتی فانوس ہوں گے' فرش پر نہایت بڑھیا درجے کا قالین بچھا ہوگا اور اس سے زیادہ وہاں کیا ہوگا؟ جبکہ آج کل مڈل کلاس کے لوگ بھی اس سے بہتر زندگی بسر کرتے ہیں' بلکہ جو آسائشیں آج کے انسان کو حاصل ہیں ان بے چارے شہنشاہوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوں گی۔ مثلاً بادشاہ سلامت اپنی تمام تر دولت و حشمت کے باوجود ایک فریج خریدنے کی "استطاعت" نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس زمانے میں فریج ہی نہیں تھا پانچ چھ گھڑوں کے پیندوں میں سوراخ کر کے انہیں، اوپر تلے رکھتے تھے اور تب کہیں موصوف کو ٹھنڈے پانی کا ایک گھونٹ میسر آتا تھا۔

مورخوں نے ان بادشاہوں کی عیش و عشرت کے بڑے قصے مشہور کر رکھے ہیں مثلاً یہ کہ وہ گانا سنتے تھے' روز رقص دیکھتے تھے حالانکہ ان کے یہ مشاغل اپنے حساس محرومی کو چھپانے کے لئے تھے کیونکہ ان کے پاس ٹیلی وژن نہیں تھا' وی سی آر نہیں تھا بلکہ ان بے چاروں کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اس طرح کی کوئی چیز وجود میں آ سکتی ہے جبکہ آج گھر گھر میں وی سی آر اور ٹیلی وژن ہے اور جس رقص اور جس موسیقی سے صرف شہنشاہ سلامت لطف اندوز ہوتے تھے' وہ آج ایک مزدور تندور پر روٹی کھانے جاتا ہے تو کھانے کے دوران اس رقص اور موسیقی سے دل بہلاتا رہتا ہے' اسی طرح بادشاہ سلامت گھر سے نکلتے تھے تو ہاتھی پر سوار ہو کر نکلتے تھے' آج کل چڑیا گھر میں بچے تفریحاً ہاتھی پر سواری کرتے ہیں جبکہ سفر وغیرہ کے لئے تیز رفتار بسیں' ویگنیں' کاریں اور موٹر سائیکل موجود ہیں۔ مغل اعظم شہنشاہ اکبر کی کتنی دہشت دلوں پر بٹھائی گئی ہے مگر موصوف کی کسمپرسی کا یہ عالم تھا کہ کبھی سکوٹر پر نہیں بیٹھے تھے۔ قصہ گو کو رات بھر بٹھائے رکھتے تھے اور اس سے اڑن کھٹولوں کی صرف کہانیاں سنتے تھے جبکہ آج کا انسان ان اڑن کھٹولوں پر دنیا بھر میں اڑتا پھرتا ہے!

ان بے چارے شہنشاہوں کی محرومی کی داستان بہت طویل ہے' کہتے ہیں جہاں وہ رہتے تھے اسے قلعوں اور ہنڈولوں وغیرہ

سے بلکہ نور بنایا جاتا تھا ٹھیک ہے ایسے ہی ہوگا مگر آج مزدور بھی اپنی جھونپڑی میں داخل ہوتا ہے تو ایک بٹن دبا کر اپنے کمرے کو روشن کر دیتا ہے۔ بڑے بڑے کروفر والے شہنشاہ اپنے کمرے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ہزار جتن کرتے تھے' مگر اس مخصوص قیام گاہ کے باہر ان کی ساری شہنشاہی دھری کی دھری رہ جاتی تھی ان بے چاروں نے ائرکنڈیشنر کی بھی شکل تک نہیں دیکھی' آج یک ایک گھر میں آٹھ آٹھ ائرکنڈیشنڈ لگے ہوئے ہیں۔ جو خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ 5روپے کی ٹکٹ خرید کر کسی ائرکنڈیشنڈ سینما میں جا بیٹھتے ہیں' ناچ گانا بھی دیکھتے ہیں اور پوری دوپہر بھی وہاں گزار دیتے ہیں!

آپ یقین کریں کہ اگر ہم ان تمام تہی دست فرمانرواؤں کی غربت کا احوال لکھنے بیٹھیں تو یہ داستاں کہیں ختم نہ ہو' چنانچہ ہم گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے بس اتنا بتاتے چلیں کہ ملک پر ملک فتح کرنے والے یہ شہنشاہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بیٹھے بٹھائے ایک ملک سے دوسرے ملک میں اس طرح بات ہو سکتی ہے جیسے آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہو رہی ہے۔ ایک بادشاہ کا بخار تازہ وتازہ۔ بیمار شدہ کسی مغربی دوا سے فوراً اتر گیا تو اس نے انعام میں گوروں کو اتنی سہولتیں دے دیں کہ وہ گورے رفتہ رفتہ اس کے ملک پر قابض ہو گئے۔ بس یہاں آ کر ماضی اور حال کی صورت حال میں قدرے مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم جیسے پسماندہ ملک کے ''بادشاہ سلامت'' بھی ان گوروں کی ٹیکنالوجی وغیرہ بلکہ بعض اوقات تو محض آسائشیں استعمال کرنے کے شوق میں آہستہ آہستہ اپنا ملک ان کے پاس رہن کرتے چلے جاتے ہیں اور پتہ نہیں اس وقت چلتا ہے جب چڑیاں کھیت چگ گئی ہوتی ہیں!

خیر یہ بات تو برسبیل تذکرہ درمیان میں آ گئی ورنہ ہم تو ماضی کے فرمانرواؤں کی مجبوریوں اور محرومیوں گنو رہے تھے یعنی کہنے کو تو یہ بادشاہ تھے مگر ان بے چاروں نے ساری عمر فریج کا پانی نہیں پیا' ائرکنڈیشنڈ کمرے کی شکل نہیں دیکھی' ٹی وی پر کوئی فلم نہیں دیکھی' جہاز' کار اور موٹرسائیکل تو چھوڑیں بے چاروں کو بس میں بیٹھنے کا بھی موقع نہیں ملا اور تو اور ان بے چاروں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے کتنی مشقتیں اٹھانا پڑتی تھیں' سینکڑوں میل گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں تلوار سونت کر بنفس نفیس دشمن پر حملہ آور ہوتے تھے چنانچہ کئی دفعہ تخت یا تختہ کی نوبت آ جاتی تھی جبکہ ان دنوں کسی ملک پر قبضہ کرنے کے لیے کسی کو سینکڑوں میل کا سفر گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر طے نہیں کرنا پڑتا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے ایک گولی بھی نہیں چلانی پڑتی بس یک سہانی شام کو جب لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہے ہوتے ہیں انہیں اپنے نئے حکمران کی تصویر ٹی وی سکرین پر نظر آتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد برس ہا برس تک روزانہ یہی تصویر نظر آتی ہے۔ دراصل ماضی کے مطلق العنان فرمانرواؤں کے مقابلے میں جہاں آج کا عام آدمی بھی بہتر زندگی بسر کرتی ہے وہاں آج کے مطلق العنان فرمانروا بھی ان شہنشاہوں سے بہت بہتر پوزیشن میں ہیں کہ بغیر لڑائی

مارکنائی کے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس وقت تک اقتدار کی نہیں چھوڑتے جب تک کوئی نانجار یہ کرسی نیچے سے کھینچ نہیں لیتا' ان میں سے جو سمجھ دار ہوتے ہیں اور جنہوں نے گرم و سرد زمانہ چکھا ہوتا ہے وہ اس مطلبی دوست کی بو سونگھ کر خود تھوڑی دیر کے لئے پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور اس کے بعد مناسب موقع دیکھ کر وہ دوبارہ کرسی پر براجمان ہو جاتے ہیں سو اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ماضی کے بادشاہ محض بھولے بھالے بادشاہ تھے ہمیں تاریخیں پڑھ پڑھ کر ان سے خوامخواہ مرعوب نہیں ہونا چاہیے!

◆◆◆

ایک دردناک لطیفہ!

یک شخص نے بابو ہوٹل میں آرڈر دیا "چھ پلیٹ مرغی' چار پلیٹ دال' آٹھ پلیٹ سبزی' پانچ پلیٹ قورمہ' ایک ڈش پلاؤ اور پچاس روٹیاں" تھوڑی دیر بعد یہ آرڈر میز پر سجا دیا گیا اور وہ شخص چشم زدن میں یہ سب کچھ چٹ کر گیا۔ کسی سرکس کا مالک یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا' اس نے نوجوان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "سرکس میں کام کرو گے؟" نوجوان نے پوچھا "کام کیا ہے؟" مالک نے کہا "یہی جو تم ابھی کر رہے تھے!" نوجوان نے حامی بھر لی۔ چنانچہ اس نے جب پہلے شو میں اس "خوراک دشمنی" کا مظاہرہ کیا حاضرین نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سرکس کا مالک خوشی سے بانچھا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا "نوجوان! اگر تم دوسرے شو میں بھی اپنے اس فن کا مظاہرہ کرو تو میرے اور تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے کیونکہ سارے شہر میں تمہاری دھوم مچی ہوئی ہے اور لوگ ٹکٹ خریدنے کے لئے مرے جا رہے ہیں۔" نوجوان نے کہا "ٹھیک ہے' تم خوراک کا انتظام کرو" چنانچہ دوسرے شو میں بھی اس نے چھ پلیٹ مرغی' چار پلیٹ دال' آٹھ پلیٹ سبزی' پانچ پلیٹ قورمہ' ایک ڈش پلاؤ اور پچاس روٹیاں چشم زدن میں صاف کر ڈالیں جس پر پنڈال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ سرکس کا مالک شو کے اختتام پر اس کے پاس آیا اور کہا "نوجوان! اگر میری مانو تو تم تیسرا شو بھی کرو تو کہ کاروباری لوگ دکانیں بند کر کے اب فارغ ہوتے ہیں' انہوں نے تمہارے فن کے مظاہرے کی دھوم سنی ہے اور وہ سب سرکس کا رخ کر رہے ہیں' میں تمہاری فیس چار گنا کر دوں گا' تم تیسرا شو ضرور کرو" یہ سن کر نوجوان نے کاندھے سکوڑے اور کہا "معافی چاہتا ہوں جناب' اب میں مزید کوئی شو نہیں کروں گا' آخر گھر جا کر کھانا وانا بھی تو کھانا ہے!"

میں نے اپنے ایک دوست کو یہ لطیفہ سنایا تو وہ ہنسے کی بجائے یہ لطیفہ سن کر رنجیدہ ہو گیا۔ میں نے کہا برادرم تم نے لطیفے کے ساتھ خواتین والا سلوک کیوں کیا؟ بولا جسے تم لطیفہ کہہ رہے ہو' یہ ہماری قوم کا سانحہ ہے۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ بولا گزشتہ کئی حکومتیں اسی طرح برسر عام کھاتی رہی ہیں اور عوام ان کا ہاتھ پکڑنے کی بجائے ان کے جلسوں میں تالیاں بجاتے رہے ہیں چنانچہ یہ لوگ کھا پی کر فارغ ہوتے ہیں تو آرام سے امریکہ یا یورپ میں واقع اپنے گھر میں چلے جاتے ہیں اور زندگی کے بقیہ دن پورے سکون سے گزارتے ہیں۔ میں نے کہا تف ہے تم پر' تم نے لطیفے کا مزہ ہی کرکرا کر دیا ہے!

اپنے اس دوست سے دل برداشتہ ہو کر میں نے یہی لطیفہ اپنے ایک صحافی دوست کو سنایا تو پورا لطیفہ اس نے نہایت دلچسپی سے سنا

اور لطیفے کے اختتام پر اسی محویت کے عالم میں پوچھا جب بسیار خور نے تیسرا شو کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ اس نے بھی گھر جا کر کھانا بھی کھانا ہے تو پھر کیا ہوا؟ میں نے اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے کہا تم پر خدا کی لعنت ہو تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟ صحافی دوست نے کہا میں پوچھ نہیں رہا اس شخص کی حماقت پر افسوس کر رہا ہوں اگر وہ تیسرے شو میں بھی کھانے پینے کا مظاہرہ کر لیتا تو کیا حرج تھا کہ اس نے گھر جا کر کچھ کھانا تھا وہ تو پہلے سے ہی کھا چکا تھا!

میرے ایک علامہ صاحب دوست ہیں جو بہت خوش ذوق اور لطیفہ شناس ہیں میں اپنے لطیفے کی اس قدر بے حرمتی برداشت نہ کر سکا چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا مگر لطیفہ سن کر علامہ صاحب کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہوئے اور ایک لمبے کے توقف کے بعد فرمایا۔ "ماشاء اللہ کیسی دار نوجوان ہے اللہ تعالیٰ اسے نظر بد سے بچائے اور اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے" پھر وہ اٹھ کر برابر والے کمرے میں گئے اور ایک شیشی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ چورن میں نے بطور خاص اپنے لئے تیار کرایا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس پر اس دار نوجوان کا بھی حق ہے آپ اسے میری طرف سے بطور ہدیہ پیش کریں۔" میں واپس جانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھا اور جب دروازے کے قریب پہنچا تو علامہ صاحب میرے پاس آئے اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "آپ ذرا پتہ کریں وہ سرکس والا ایک شو کا کتنا معاوضہ ادا کرتا ہے نیز یہ کہ کیا مینو میں اپنی مرضی کے مطابق رد و بدل ہو سکتا ہے؟"

اب میرے لیے یہ لطیفہ ایک چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا تھا چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا جب تک کوئی اس پر ہنسے گا نہیں میں چین سے نہیں بیٹھوں گا لہٰذا میں گھر سے نکل کر سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ ایک شخص موٹر سائیکل پر اپنے تین بچوں اور ایک بیوی کو بٹھائے گزر رہا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا اس نے میرے قریب پہنچ کر موٹر سائیکل روک دی میں نے کہا جناب آپ کو ایک لطیفہ سنانا ہے کہ ایک شخص نے ایک ہوٹل میں چھ پلیٹ مرغی چار پلیٹ دال آٹھ پلیٹ سبزی۔ . . "مگر اس نے پورا لطیفہ سنے بغیر موٹر سائیکل کو کک ماری اور جاتے ہوئے بولا۔ "میں نے یہ لطیفہ سنا ہوا ہے یہ تمہیں لوگوں کا کمال ہے کہ اس قسم کی باتوں کو لطیفہ بنا کر پیش کرتے ہو" اس کے جانے کے بعد میں نے کتنے ہی راہ چلتے لوگوں کو یہ لطیفہ سنانے کی کوشش کی مگر ہر بار مجھے محسوس ہوا کہ یہ قوم حس مزاح سے محروم ہو گئی ہے چنانچہ آخری حربے کے طور پر میں نے ایک فاقہ مست قسم کے شخص کو روکا جس کے چہرے پر بھوک اگ رہی تھی مگر لطیفہ سن کر ہنسنے کے بجائے اس کے منہ میں پانی بھر آیا اس پر مجھے شدید غصہ آیا اور میں نے کہا "کیوں اتنے مزیدار لطیفہ پر تم ہنس نہیں سکے؟" بولا "ہنس سکتا ہوں!" میں نے کہا "وہ کیسے؟" کہنے لگا آپ مجھے سامنے والے تندور سے ایک پلیٹ دال اور دو روٹیاں لے دیں اس کے بعد میں اگلے کھانے تک ہنستا رہوں گا"

جب میں نے محسوس کیا کہ اس لطیفے پر کوئی بھی نہیں ہنس رہا تو میں خود سوچ میں پڑ گیا چنانچہ اس دفعہ یہ لطیفہ میں نے اپنے آپ کو سنایا اور تہیہ کر لیا کہ خواہ مجھے کوئی پاگل سمجھے مگر میں اس پر اکیلا ہی قہقہہ لگاؤں گا لیکن ہوا یوں کہ لطیفہ سننے کے بعد میں نے خود کو ایک دو مرتبہ رسید کیا اور کہا کہ "یہ کوئی لطیفہ ہے؟ یہ تو حرام خوروں کا پراپیگنڈہ ہے۔" چنانچہ میں نے اسی وقت اینٹی کرپشن کے محکمے کا رخ کیا اور اپنے ایک دوست کو یہ لطیفہ سنانے کے بعد اس معاملے کی تحقیقات کرنے کی درخواست کی۔ میں نے دوست سے کہا کہ جس شخص کی ایک وقت کی خوراک کم از کم پانچ سو روپے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پندرہ سو روپے روزانہ اور پینتالیس ہزار روپے ماہانہ کا صرف کھانا کھاتا ہے۔ لہٰذا اس کے ذرائع آمدنی کی تحقیقات ہونی چاہیے۔ دوست نے کہا "بالکل ٹھیک ہے تم مجھے اس شخص کا ایڈریس بتاؤ" پھر وہ دوست مجھے دفتر کے دروازے تک چھوڑنے آیا اور آہستہ سے میرے کان میں کہا "اس طرح کے کوئی اور کیس بھی تمہارے علم میں ہیں تو مجھے مطلع کر دیا کرو ہم دونوں بھائی ففٹی ففٹی کر لیا کریں گے۔"

پہنچنا انسان کا چاند پر!

ماہ نورد چاند پر کئی گھنٹے قیام کے بعد زمین پر واپس بھی پہنچ گئے ہیں اور قریباً ساٹھ کروڑ افراد نے اپنی آنکھوں سے ٹیلی وژن کے ذریعے انہیں چاند پر چہل قدمی کرتے بھی دیکھا ہے۔ لیکن آپ کے ہاں کے "رمضانی" اور "نورے" بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ سب چکر پڑھے لکھے لوگوں نے انہیں (اردو میں) بے وقوف (اور پنجابی میں ناگفتنی) بنانے کے لیے چلا یا ہے چنانچہ ان کی اپنے اس موقف میں پختگی کے ضمن بہت سے واقعات دیکھنے میں آئے ہیں۔ ایک کوچوان نے جس کا مریل گھوڑا رنگ محل سے بھاٹی گیٹ تک جانے میں لیت ولعل سے کام لے رہا تھا اسے زور سے چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پہنچ سکتا' بابو جی' چاند تک نہیں پہنچ سکتا۔"

مجھے خود اس حقیقت کا اچھی طرح اندازہ تھا چنانچہ میں نے قناعت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تو چلو پھر بھاٹی گیٹ تک ہی پہنچا دو۔"

اس پر اس نے میری طرف بری طرح گھور کر دیکھا اور بولا۔

"میں نسان کی بات کر رہا ہوں بابو جی' خدا سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔" یہ کہہ کر اس "فاضل کوچوان" نے تاریخ کے ورق پلٹنے شروع کئے اور فرعون اور نمرود کے عبرتناک انجام کی مثالیں پیش کیں۔ میں نے خوش ہو کر اس "محقق" کی ہتھیلی پر چونی رکھی اور تانگے سے نیچے اتر آیا۔

گوالمنڈی میں چند نوجوانوں کو اخبار ہاتھ میں تھامے تسخیر ماہتاب کی خبریں پڑھنے میں مشغول دیکھ کر یک براق جیسے بالوں والی بڑھیا چلتے چلتے رکی۔ اس دانا بڑھیا نے پہلے تو ان نادانوں کی سادہ لوحی پر ایک پرزور قہقہہ لگایا' پھر ہاتھ فضا میں نچا کر بولی۔

"بیٹا' ذرا بتانا تو یہ لوگ چاند پر کس وقت پہنچے؟"

ایک نوجوان نے جواب دیا "ماں جی! صبح کے وقت!"

اس جواب پر بڑھیا ایک بار پھر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی اور پیٹ پکڑے پکڑے بولی۔

"ان لوگوں کے جھوٹ کا یہیں سے پتہ چل گیا' بھلا دن کو چاند کہاں ہوتا ہے!"

اپنی اس دلیل کا وزن محسوس کرتے ہوئے اس نے تسخیر ماہتاب کے افسانے کا مزید تیا پانچہ کیا اور ہاتھ سے اشارہ کر کے بولی۔

"چاند اتنا سا تو ہوتا ہے اس میں انسان اور ان کی گاڑی بھلا کیسے اتری؟ ہونہہ!"

اور پھر بڑی بے یقینی کے انداز میں سر جھٹک کر وہاں سے چل دی' مجھے یوں لگا جیسے یہ وہی بڑھیا ہو جو کسی زمانے میں چاند میں بیٹھ کر چرخہ کاتا کرتی تھی اور اب بے گھر ہونے پر دل کا غبار نکال رہی ہے۔

حجام کی دکان پر شیو کرانے والوں کا ہجوم تھا' اپنی باری کا انتظار کرنے والے کا یک بچارے مفتوح چاند کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھے۔ ایک "پڑھا لکھا جاہل" انہیں اس امر کا یقین دلانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا کہ انسان واقعی چاند پر پہنچ گیا ہے۔ حجام شیو کرتے کرتے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس "بے خبر" کو گھور کر دیکھتا ہے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کی باری آئی تو نائی نے شیو بناتے بناتے استرا اس "ملحد" کی شہ رگ پر لا کر روک دیا اور پوچھا۔

"تو بابو جی کیا خیال ہے آپ کا' انسان چاند پر پہنچ گیا ہے؟"

یہ مردمیدان اس وقت چاند سے بھی اگلی منزل پر جانے کے موڈ میں نہیں تھا' چنانچہ اس نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا'

"یار وامیں تو مذاق کر رہا تھا!"

تسخیر ماہتاب کے واقعہ پر دوسرا ردعمل ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا ہے سنا ہے کہ ان حلقوں میں بھی صف ماتم بچھی ہوئی ہے چنانچہ حلقہ ارباب ذوق میں امجد اسلام امجد نے تو "شاعرو ماتم کرو" کے عنوان سے باقاعدہ ایک نظم بھی پڑھی ہے ان کے اس "ماتم" کرنے کی دردمندانہ اپیل پر ہو سکتا ہے شاعروں میں سے سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی وغیرہ کے کان کھڑے ہوئے ہوں مگر یہ تو جملہ معترضہ تھا بات شاعروں کی ہو رہی تھی سو وہ اس بڑے سانحے سے دوچار ہیں کہ محبوب کے حسین چہرے کو اب وہ کس سے تشبیہ دیں گے۔ تاہم یہ پریشانی بھی شاعروں کی نہیں بلکہ اس کا تعلق شعراء کے ایک مخصوص طبقے سے ہے۔ علامتی شاعری کرنے والوں کے نقطہ نظر سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں وہ تشبیہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی گوناگوں مخلوق میں سے گائے اور بھینس وغیرہ کو بھی منتخب کر سکتے ہیں۔

ایک نقطہ نظر کے حامل وہ دانشور ہیں جنہیں انسان کے چاند پر پہنچتے ہی زمین کے باسیوں کے تمام دکھ درد یاد آ گئے ہیں اور وہ ان کا نوحہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے ہیں۔ مگر یہ وہ لوگ ہیں جو انسانیت کے تمام دکھ درد ختم ہو جانے پر بھی اس امر کو نوحہ پڑھیں گے کہ اب وہ کس کا نوحہ پڑھیں۔

یہ سب رویے دراصل اس ذہنی گھبلاہٹ کا نتیجہ ہیں جو نت نئے انکشافات اور اقدار کی شکست و ریخت کے نتیجے میں جنم لیتی ہے اور اس طرزِ عمل کا پس منظر یہ ہے کہ ہم لوگ ابھی تک پوری فراخدلی سے حقائق کا سامنا کرنے کی تاب نہیں رکھتے۔ جب ہماری قوم کے نورے اور دانشور حقائق سے آنکھیں چار کرنا سیکھ جائیں گے اور اس دن چاند پر پاکستانی پرچم ضرور لہرائے گا"

◆◆◆

کریکٹر کی قیمت!

کل کی غیر منصفانہ بارش کے دوران ایک قلندر کی بات ہمیں پانی پانی کر گئی اس بارش کو ہم نے غیر منصفانہ اس لئے کہا کہ یہ کہیں ہوئی ہے اور کہیں نہیں ہوئی۔ اور یک قلندر کی بات نے ہمیں پانی پانی یوں کیا کہ سڑک کے بیچوں بیچ بہتے ہوئے ایک دریا کو موٹر سائیکل سے عبور کرنے کے دوران راہ چلتے اس مرد قلندر سے ہم یونہی پوچھ بیٹھے کہ حضرت اس سڑک کے کون سے حصے میں پانی کم گہرا ہے تاکہ ہم عین منجدھار میں چلنے کے بجائے اسی راہگذر کو اپنائیں۔ اس پر اس مرد قلندر نے ہمیں اس سمت چلنے سے منع کیا جس سمت ہم جا رہے تھے کہ بقول ان کے اس طرف پانی گہرا تھا اور فرمایا کہ بائیں جانب فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ چلیں سو ہم نے ان کے اس مشورے کو پلے باندھ کر ابھی چند قدم ہی گئے تھے کہ موٹر سائیکل ایک گڑھے میں گر کر یوگا کے انداز میں سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے کھڑا ہو گیا اور یوں اس مرد قلندر کی بات ہمیں واقعی پانی پانی کر گئی۔ نہ صرف پانی پانی کر گئی بلکہ ''تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن میرا نہ من'' کی تفسیر بھی تسلی بخش طور پر سمجھ آ گئی۔ کیونکہ اس عمل کے دوران نہ صرف یہ کہ ہم سچ مچ پانی پانی ہو گئے بلکہ اس اچانک گڑھے کے سامنے ''جھکنے'' کے باعث تھوڑی دیر کے لئے ہمیں پاؤں من من کے لگے۔ اس ناپسندیدہ ورزش سے فراغت کے بعد ہم نے مڑ کر دیکھا تو یہ مرد قلندر کھڑا دانت نکال رہا تھا تب ہم پر یہ بھید کھلا کہ یہ شخص مرد قلندر ذرا ''کھولیا'' ہے۔ ورانہی کھولیوں کی وجہ سے لاہور والے ''زندہ دلان لاہور'' کہلاتے ہیں۔

لیکن جو سچ پوچھو تو صرف ان کھولیوں ہی کی وجہ سے لاہور کے شہری زندہ دلان لاہور نہیں کہلاتے بلکہ یہ شہر بھی روح میں خود بھی خاصا کھولیو واقع ہوا ہے۔ چنانچہ حق تو یہ ہے کہ اس شہر کو زندہ دل لاہور اور اس کے شہریوں کو زندہ دلان لاہور کہا جائے تو ترازو کے دونوں پلڑے تب برابر ہوتے ہیں' اس کھولئے شہر کے صرف شہریوں کو زندہ دل کہنا ڈنڈی مارنے کے مترادف ہے۔ مثلاً یہ شہر سب سے بڑا کھول تو یہ کرتا ہے کہ خود کو ''عروس البلاد'' یعنی شہروں کی دلہن کہلاتا ہے اور اس دلہن کا یہ عالم ہے کہ اس کا دامن جگہ جگہ سے تار تار ہے' اس کی سڑکوں میں گڑھے پڑے ہوئے ہیں' اس کے نلکوں میں پانی نہیں آتا' اس کی بجلی کبھی آتی ہے اور کبھی چلی جاتی ہے' سیوریج اس کا ٹھیک نہیں ہے اوپر سے سوئی گیس اور ٹیلی فون والے جو آئے روز پھاوڑے اور کدالیں لے کر اس کے ''دوالے'' ہو جاتے ہیں بس یوں سمجھیں کہ یہ دلہن ''کنتھیا'' کالی کھانسی' آشوب چشم و دیگر امراض میں مبتلا ہے لیکن چونکہ ذرا کھولیو واقع ہوئی ہے اس لئے عروس البلاد

کہلاتی ہے۔

مگر دوستو! یہ سطور لکھتے ہوئے ہمیں اچانک خیال آیا کہ ہم اس عروس البلاد سے کچھ زیادتی کر گئے ہیں کیوں کہ دلہن اگر بیمار شمار رہتی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی قدر و قیمت سے انکار کر دیا جائے کہ اصل چیز تو کریکٹر ہے۔ اس کی وضاحت کچھ اس لطیفے سے ہو گی جس کے مطابق ایک شخص بھینس خریدنے کے لیے بازار گیا' بیوپاری نے اسے ایک بھینس دکھائی اور کہا یہ روزانہ بیس سیر دودھ اور سال میں ایک کٹا دیتی ہے اس کی قیمت دس ہزار روپے ہے۔ پھر اس نے دوسری بھینس دکھائی اور کہا یہ دودھ دیتی ہے اور نہ "کٹا" دیتی ہے اس کی قیمت بیس ہزار روپے ہے۔ یہ سن کر گاہک پریشاں ہوا اور متجسس ہوا کہ معاملہ کیا ہے چنانچہ اس نے حیرت بھرے لہجے میں بیوپاری سے پوچھا "بھائی صاحب یہ کیا معاملہ ہے کہ جو بھینس روزانہ بیس سیر دودھ اور سال میں ایک کٹا دیتی ہے اس کی قیمت دس ہزار روپے ہے۔ اور جو نہ دودھ دیتی ہے نہ کٹا دیتی ہے اس کی قیمت بیس ہزار روپے ہے؟" یہ سن کر بیوپاری نے گاہک کی سوچ یا ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا "صاحب بہت افسوس کی بات ہے آپ کی نظروں میں کریکٹر کی کوئی قیمت ہی نہیں؟" سو معاملہ یوں ہے کہ عروس البلاد لاہور کی قدر و قیمت بھی اس کے کریکٹر ہی کی وجہ سے ہے یوں اس کی ذات سے وابستہ جن تلخیوں کا ذکر ہم نے اوپر کی سطور میں کیا ہے انہیں فراموش ہی کر دینا چاہیے کہ اس کے بعد یہ سب چیزیں فروعی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

''اصلی'' طنز و مزاح کانفرنس!

گزشتہ ماہ اسلام آباد میں ایک طنز و مزاح کانفرنس بڑے دھوم دھڑلے سے منعقد ہوئی' جس میں ملک کے معروف مزاح نگاروں نے شرکت کی' ہمارا خیال تھا کہ کالم نگار اس کانفرنس کے بارے میں کالم آرائیاں کریں گے' کیونکہ ''سلام آباد'' کی طنز و مزاح کانفرنس کو اس طرح نظر انداز کرنا ممکن نہیں' لیکن افسوس کہ یاران سریل کا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا۔ اتفاق سے ہم اس کانفرنس میں موجود تھے۔ اگر بزم اکبر کے سید ضمیر جعفری' ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور سرفراز شاہد اس کانفرنس کے انعقاد سے قبل ہم سے مشورہ کر لیتے اور اس کے پروگرام ہمارے ''قیمتی'' مشوروں کی روشنی میں مرتب کرتے تو یقین جانیں اس کانفرنس کی ''مشہوریاں'' اندرون ملک تو کیا بلکہ بیرون ملک تک جا پہنچتیں' تاہم ہمارے خیال میں اب بھی کچھ نہیں بگڑا' کیونکہ منتظمین کا ارادہ اگلے برس بھی اس کانفرنس کے انعقاد کا ہے' سو وہ ہمارے مشوروں کو ''ریزرو'' رکھتے ہوئے اگلے برس استفادہ کر سکتے ہیں۔

کانفرنس کے ضمن میں ہمارا پہلا مشورہ یہ ہے کہ اس میں صرف ادیبوں ہی کو نہیں بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں کے ''ن'' نمایاں افراد کو بھی مدعو کیا جائے جو مزاح لکھتے تو نہیں' مگر اپنی گفتگو میں مزاح بولتے ہیں' بلکہ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ ان تمام لوگوں کو بھی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جائے جو نہ صرف مزاح لکھتے ہیں' نہ مزاح بولتے ہیں' البتہ گزشتہ چالیس برس سے مسلسل قوم کے ساتھ مذاق کرتے چلے آ رہے ہیں۔ نیز یہ کانفرنس چونکہ اسلام آباد میں منعقد ہوتی ہے لہٰذا اس کے مختلف سیشنوں کی صدارت ادیبوں وغیرہ سے کرانے کے بجائے صاحبان اقتدار سے کرائی جائے تاکہ نیلی وژن وغیرہ پر اس کی معقول کوریج بھی ہو سکے۔ سو بہتر ہوگا کہ آئندہ برس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت صدر جنرل ضیاء الحق اور اختتامی اجلاس کی صدارت کے لئے وزیر اعظم محمد خان جونیجو کو دعوت دی جائے۔ صدر ضیاء الحق ماشاء اللہ اگرچہ مزاح نگار نہیں' لیکن مزاح کو ضرور ہیں اور اپنی تقریر میں ایسی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں کہ محفل کو کشت زعفران بنا دیتے ہیں' چنانچہ اب تو شہر میں یہ افواہ گردش کر رہی ہے کہ صدیق سالک صدر ضیاء الحق سے لکھواتے ہیں۔ طنز و مزاح کانفرنس کی صدارت کا استحقاق صدر ضیاء الحق کو اس لئے بھی ہے کہ گزشتہ نو برسوں میں ان کی حکومت نے ایسے کئی اقدامات کئے ہیں جن پر قوم کو باقاعدہ ہنسنے کا موقع ملا ہے' اسی طرح وزیر اعظم محمد خان جونیجو بھی اختتامی اجلاس کے لیے موزوں ترین صدر ہیں۔ کیونکہ جس مارشل لاء کا افتتاح صدر ضیاء الحق نے کیا تھا' اس کا اختتام وزیر اعظم جونیجو پر ہوا ہے' لوگ جس

طرح مارشل لا کی دفری پر ہنستے تھے اسی طرح موجودہ جمہوریت کی صحت پر ہنستے ہیں جس کے وزیر وزیر اعلیٰ سے ملنے کے بعد صدر اور وزیر اعظم سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔

تاہم ہمارے نزدیک یہ طنز و مزاح کانفرنس اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک اس میں پیر پگاڑا کو مدعو نہ کیا جائے جس میں انہیں "شہنشاہ ظرافت" کا خطاب دیا جائے۔ اگرچہ چھوٹے موٹے مزاح نگار ہم بھی ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم پیر صاحب کے خاک پا بھی نہیں بلکہ ہمارے سمیت ملک کے تمام مزاح نگار ایک طرف ہوں اور دوسری طرف پیر صاحب پگاڑا ہوں' تو آپ یقین جانیں پیر پگاڑا صاحب کا پلڑا بھاری رہے گا۔ آپ اندازہ لگائیں کہ جو مسئلے قوم کی زندگی اور موت کے ہوتے ہیں اور جن پر قوم خوف کے زیر اثر سوری ہوتی ہے' پیر صاحب پگاڑا ان مسائل پر قہقہہ بار گفتگو کرتے ہیں جس کے لئے ایک تو بڑا دل گردہ چاہیے' اور دوسرے اس امر پر یقین بھی کہ ایسے مسائل جو قوم کو مسلسل پریشان رکھتے ہوں' ان کو اسی طرح غیر سنجیدگی کی مار دینی چاہیے تاکہ یہ مسائل ہمارے سنجیدہ برتاؤ سے امپارٹنس نہ حاصل کر جائیں' سیاست دانوں میں ایک سیاست دان ولی خان بھی ہیں جن سے طنز و مزاح کانفرنس کے ایک سیشن کی صدارت کرائی جا سکتی ہے' جس میں ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی صدارتی تقریر میں اپنے اس موقف کو دہرائیں کہ 1947ء میں صوبہ سرحد نے پاکستان کے حق میں ووٹ نہیں دیا تھا اور کالا باغ ڈیم کا ڈیزائن خواہ کچھ ہو' نہیں بننے دیں گے اور اس کے علاوہ بھی جتنی سنجیدہ باتیں چاہیں' وہ اپنی تقریر میں کریں' ہمیں یقین ہے کہ لوگ ان کی باتوں سے پوری طرح محظوظ ہوں گے۔

یہاں پروگرامنگ میں ہم سے تھوڑی سی غلطی ہو گئی ہے۔ یعنی ایک تو ہمیں ولی خان اور پیر صاحب پگاڑا کا ذکر ایک ہی جگہ نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ چہ نسبت خاک را بعالم پاک والا معاملہ ہے اور دوسرے اس لئے کہ ولی خان کے لیے ہم نے کانفرنس کے ایک اور پروگرام میں نشست بک کی تھی' یہ پروگرام مزاح نگار یا مزاح گو حضرات کی بجائے سنجیدہ سیاسی اور علمی شخصیتوں سے ترتیب دیا جائے گا مگر اس کی انفرادیت یہ ہوگی کہ لوگ اس کے شرکاء کی سنجیدہ باتوں سے اسی طرح محظوظ ہوں گے جس طرح مزاح نگاروں سے ہوتے ہیں' چنانچہ اس نشست میں ولی خان سے ان کی زیر طبع کتاب "حقائق حقدس" کا کوئی باب سنا جا سکتا ہے۔ نوابزادہ مظہر علی خان' سیفہ نصیرائے شیخ اور اسی طرح کے دوسرے نوابوں اور سکھوں سے سوشلزم کے حق میں لیکچر دلوائے جا سکتے ہیں' عبداللہ ملک یا حمید اختر اس نشست میں "سوویت روس میں آزادی تحریر و تقریر" کے موضوع پر پیپر پڑھ سکتے ہیں۔ شیعہ سنی اتحاد کے موضوع پر علامہ نصیر الاجتہادی اور شاہ بلیغ الدین کی تقریریں کروائی جا سکتی ہیں' غرضیکہ اس نشست میں تقریباً ہر موضوع پر پوری سنجیدگی سے بات کی

جا سکتی ہے اور سامعین اس پر جی کھول کر ہنس بھی سکتے ہیں بشرطیکہ مقررین کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے۔

اگر طنز و مزاح کانفرنس کے منتظمین ہماری ان تجاویز سے اتفاق کریں تو آخر میں ایک مشورہ ہم مزید دے سکتے ہیں جس سے یہ کانفرنس بین الاقوامی صورت اختیار کر سکتی ہے اور وہ یہ کہ روس کے گورباچوف اور امریکہ کے ریگن سے اس موقع پر خصوصی پیغامات منگوائے جائیں جو ظاہر ہے امن عالم کے قیام اور ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ ختم کرنے وغیرہ کے موقف پر مشتمل ہوں گے یہ پیغامات اس وقت پڑھ کر سنائے جائیں جب کسی بور سے مضمون کے بعد حاضرین سخت بیزار بیٹھے ہوں تاکہ یہ پیغام ان کی بوریت کو ختم کریں اور وہ کھلکھلا کر ہنس سکیں کیونکہ سچ بات یہ ہے کہ آنجہانی نارمن وزڈم پیٹر سیلرز تھری سٹوجز اور جیری لوئس وغیرہ ان بین الاقوامی مزاحیوں کے سامنے بالکل ہیچ نظر آتے ہیں۔ دھوبی تو بھول ہی گیا اس کانفرنس کا اختتام بھی تو ہونا ہے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت کے لئے علامہ احسان الٰہی ظہیر سے زیادہ موزوں کون سی ذات گرامی ہو سکتی ہے۔ اس نشست کے مقرر خصوصی میاں فضل حق ٹھیکیدار ہوں تو یہ سیشن لاجواب قرار دیا جائے گا۔

◆◆◆

کیلنڈر اور تھرمامیٹر

گھنٹہ گھر والے فیصل آباد میں پنجاب میڈیکل کالج کی سٹوڈنٹس یونین نے گزشتہ ہفتے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ مشاعرے کے منتظمین نے محفل کے اختتام پر شعراء کو مختلف دنامنز کی چند بوتلیں اور ایک ایک تھرمامیٹر بطور تحفہ پیش کیا۔ ایک مشاعرہ لاہور میں قومی بچت سکیم والوں نے بھی منعقد کیا تھا اور یہاں منتظمین نے شعراء کو ایک ایک کیلنڈر اور ایک ایک شیشی پرفیوم کا تحفہ دیا۔

اور ظاہر ہے تحفہ کی قدر و قیمت کا اندازہ اس پر لکھی قیمت سے نہیں بلکہ دینے والے کے جذبہ محبت اور خلوص سے ہوتا ہے چنانچہ قومی بچت والوں نے گر شاعروں کو کیلنڈر اور پرفیوم کی شیشی کا تحفہ دیا تو ایک طرف علامتی طور پر اپنی محبت کا اظہار کیا اور دوسری طرف اپنے محکمے کے نام کی لاج بھی رکھ لی ورنہ اپنے ایل ڈی اے کا شعبہ آب رسانی بھی تو ہے۔ نام "آب رسانی" ہے کام "یذ رسانی" یعنی لوگوں کا پانی بند کرنا ہے جبکہ قومی بچت والے اگر بچت کا نام لیتے ہیں تو مشاعروں وغیرہ میں بچت کر کے دکھاتے بھی ہیں۔ ویسے منیر نیازی کا کہنا ہے کہ بچت کے فوائد بتانے کے لئے حکومت کو اس بچت کے محکمے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ چیز تو ہماری گھٹی میں پڑی ہے کہ ہم تو وہ لوگ ہیں جو اپنے دل کی بات بھی چھپا جاتے ہیں بہرحال قومی بچت والوں نے شاعروں کو کلینڈر دیا کہ اسے گھر میں لٹکاؤ اور اپنی آمدنی کو مہینے کے دنوں خصوصاً آخری دنوں میں تقسیم کر کے خرچ کرو۔ عطر دیا کہ جب تمہارا پسینہ خشک ہو تو اسے کپڑوں پر لگاؤ اور کیلنڈر کی ان آخری تاریخوں کو بھول جاؤ۔

مگر سچ پوچھیں تو ہمیں مزا میڈیکل کالج والوں کی جدت طبع کا آیا ہے۔ انہوں نے شعراء کو تحفے کے طور پر دنامنز پیش کی ہیں۔ ہمیں ڈاکٹروں سے ہمیشہ ہی گلہ رہا ہے کہ ان کی تشخیص ٹھیک نہیں ہوتی مگر اس بار ہم ان کے قائل ہو گئے ہیں کہ کم از کم شعراء کے سلسلے میں ان کی تشخیص بالکل صحیح ہے۔ بیشتر شعراء کا کلام پڑھ کر ہم خود اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انہیں دنامنز کی شدید ضرورت ہے تاہم ہماری رائے اس معاملے میں دقیق نہیں تھی اب ڈاکٹروں نے اس کی تصدیق کی ہے تو ہمیں کافی اطمینان ہوا ہے۔

ویسے ہماری نظروں میں کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جن کا علاج صرف دنامنز سے ممکن نہیں بلکہ انہیں اس کے علاوہ بھی ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ اور اب اس ضمن میں صرف شاعر کی قید بھی کیا رکھی ہے چنانچہ ادیب اور دانشوروں کو بھی اس زمرے میں شامل کر لیا جائے تو ہمارا دھیان جناب حنیف رامے کی طرف جاتا ہے کہ وہ کافی عرصہ پیشتر پنجاب کی وزارت عالیہ کے بلند پایہ تخت سے نیچے

کرتے تھے جس سے انہیں خاصی رغبت رہی آئی تھیں لہٰذا بہتر ہوگا کہ اگر وہ اس ضمن میں مزید سستی نہ کریں اور اولین فرصت میں ''مخمس'' کا ٹیکہ لگوا لیں۔ اسی طرح مولانا کوثر نیازی جب سے اقتدار سے الگ ہوئے ہیں ان کی شاعری سے وہ سوز اور اثر انگیزی رخصت ہوگئی جو حضرت جوش ملیح آبادی ایسے ''میں نہ مانوں'' شاعر سے بھی داد وصول کر لیتی تھی۔ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ مولانا اس ضمن میں کسی ڈاکٹر بلکہ ڈاکٹر مبشر حسن سے مشورہ کریں۔ ڈاکٹر مبشر حسن اگرچہ انجینئر ہیں لیکن ان کے مشورے تو اقتصادیات سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں قیمتی سمجھے جاتے تھے۔ جہاں تک خود ڈاکٹر مبشر حسن کا تعلق ہے ان کی دانش کا بازار بھی اقتدار اور رخصتی کے بعد سے کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ روزانہ شام کو لکشمی چوک کے کسی ڈھابے سے ''تلیاں'' چسوائیں کہ شرع میں شرم نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے ایک دوست طاہر محمد خان بھی کسی زمانے میں افسانے وغیرہ لکھتے رہے ہیں اور اقتدار سے علیحدگی کے بعد وہ شاید

''افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا''

والا ریکارڈ سننے پر ہی اکتفا کرتے رہے ہیں، کیونکہ اس دوران ان کی کوئی تحریر سامنے نہیں آئی۔ ان کے لئے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ صرف وٹامن ای استعمال کریں لیکن ہمارے مشورے پر عمل کرنے سے پہلے بہتر ہوگا اگر وہ کسی ڈاکٹر سے پوچھ لیں کہ یہ وٹامن ای کس قسم کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے؟ یونہی کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

مگر یہ بات تو کہیں کی کہیں پہنچ گئی، گفتگو کا آغاز تو میڈیکل کالج فیصل آباد کی سٹوڈنٹس یونین کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعرے کے ذکر سے ہوا تھا جہاں محفل کے اختتام پر شعراء کو وٹامن اور ایک ایک تھرمامیٹر کا تحفہ پیش کیا گیا۔ ہم نے اپنی گفتگو کا رخ وٹامنز کی طرف پھیر دیا اور چکر میں اس تھرمامیٹر کو بطور تحفہ پیش کرنے کی معنویت فراموش کر گئے۔ ہمارے خیال میں تو مستقبل کے ان ڈاکٹروں نے اس ضمن میں بھی شعراء کی نبضوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے وہ جان گئے ہیں کہ ان دنوں بعض شعراء بھی سیاست دانوں کی طرح درجہ حرارت ماپنے والے آلے بنے ہوئے ہیں چنانچہ ان کا پارہ اس حرارت کے مطابق اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ مگر آلے اور آلۂ کار میں ایک نازک سا فرق موجود ہے اور پرابلم یہ ہے کہ ان دنوں کچھ شعراء آلۂ حرارت ماپنے والے آلے کم اور آلۂ کار زیادہ بنے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر لوگ چونکہ صرف ڈاکٹر ہوتے ہیں اس لئے انہوں نے بلا تمیز رنگ و نسل سب کے ہاتھ میں تھرمامیٹر دے دیئے۔ حالانکہ انہیں ان میں سے بعض کو درجہ حرارت ماپنے والا آلہ دکھا کر پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کرنا چاہیے تھا کہ آلے اور آلۂ کار کا فرق اسی صورت میں معلوم ہو سکتا ہے۔

قبول اسلام!

یک دن خوش کن خبر اخبار میں شائع ہوئی کہ ممتاز جاپانی پہلوان انوکی عنقریب اسلام قبول کرلیں گے اس سے قبل ان کا پروگرام یوگنڈا کے صدر جناب عدی امین سے دو ہاتھ کرنے کا ہے یعنی ان سے کشتی لڑنے کا ہے۔ یہ دونوں خبریں ایک ساتھ شائع ہوئی ہیں اور دونوں خبریں اپنی اپنی جگہ دھوری ہیں۔ یعنی نہ تو یہ بتایا گیا ہے کہ انوکی نے اسلام کی حقانیت کیونکر تسلیم کی ورنہ خبر میں بتایا گیا ہے کہ جناب عدی امین سے انوکی کی جو کشتی ہورہی ہے دونوں میں سے اس کا چیلنج کس نے دیا تھا؟

چونکہ یہ دونوں خبریں ادھوری ہیں اس لئے حقیقت حال تک مکمل رسائی تو ممکن نہیں بس اس ضمن میں قیاس کے گھوڑے ہی دوڑائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً اس خبر کے پہلے جزو کے بارے میں ہمارا یہ خیال ہے کہ انوکی کو اسلام کے مطالعے کا موقع کم ہی ملا ہوگا۔ اس لئے اس نے اسلام قبول کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ شاید اسلام کے علاوہ مسلمانوں کے اخلاق سے بھی متاثر ہوکر کیا ہے کہ مسلمان لوگ مقابلے کے دوران محض مہمان کی دل جوئی کے لیے اس سے ہار جاتے ہیں۔ اس شبے کو تقویت یوں بھی ملتی ہے کہ شائع شدہ خبر کے مطابق اس نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اپنے اس فیصلے پر ابھی عمل درآمد نہیں کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ابھی اس نے دو اور مسلمانوں یعنی عدی امین اور ہمارا پہلوان سے کشتی لڑنی ہے۔ اگر ان دو مسلمان پہلوانوں نے بھی مقابلے کے دوران اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا تو پھر اسے اسلام قبول کرنے میں یقیناً کوئی تامل نہیں ہوگا!

اس خبر کے دوسرے جزو یعنی عدی امین سے کشتی کا معاملہ بھی پوری طرح واضح نہیں ہے۔ اس ضمن میں ہمارا اندازہ یہ ہے کہ یہ چیلنج جناب عدی امین ہی نے دیا ہے۔ انہوں نے ایک دفعہ لندن کی ملکہ الزبتھ کو شہزادی این کے لئے رشتے کا پیغام بھی بھجوایا تھا اور کہا تھا کہ ان میں کیا کمی ہے؟ وہ خوب صورت ہیں طاقتور ہیں اور پھر یہ کہ بارروزگار ہیں۔ ان سے اچھا رشتہ شہزادی این کو کہاں ملے گا؟ مگر ملکہ الزبتھ اور شہزادی این نے ان کا یہ "چیلنج" قبول نہ کیا اور اس پر "وائے افسوس" کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے!

اب اگر جاپانی پہلوان انوکی نے جناب عدی امین کا چیلنج قبول کر لیا ہے تو ظاہر ہے اس نے مقابلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ تاہم اگر واقعی یہ مقابلہ ہوتا ہے تو ہم ابھی سے یہ پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ جناب عدی امین اس معرکے میں بھی کامیاب ہوں گے کہ انہوں نے تو بڑے بڑے سیاسی سورماؤں کو ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں بیچارا انوکی کس کھیت کی مولی ہے؟ اس

صورت میں انوکی کو مایوس ہونے کی بجائے مقابلے کے لئے کسی اور مسلمان سے رجوع کرنا چاہیے۔ ہم اس سلسلے میں پورے عجز و انکسار کے ساتھ سچے شاعر و رکالم نگار دوست خالد احمد کا نام پیش کرتے ہیں جن کے متعلق ہمارے ایک دوست نے کہا ہے۔

رزم حق و باطل ہو تو ریشم کی طرح نرم
اور حلقہ یاراں ہو تو فولاد ہے خالد!

ہمیں یقین ہے کہ انوکی پہلوان مقابلے کے دوران ہمارے خالد پہلوان کے اخلاق عالیہ سے بہت متاثر ہوگا اور یوں اسلام قبول کرنے کے فیصلے میں اسے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنے میں خاصی مدد ملے گی!

مگر سوال یہ ہے کہ ہم انوکی کے اسلام قبول کرنے کے ضمن میں اتنے انہماک کا مظاہرہ کیوں کر رہے ہیں؟ اس کا سیدھا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ چونکہ بحمداللہ ہم خود مسلمان ہیں اس لئے امت مسلمہ میں ایک بین الاقوامی شہرت کی شخصیت کے داخل ہونے پر ہماری مسرت اتنی ناقابل فہم نہیں ہے ورا اس کا "الٹا" جواب یہ ہے کہ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو بڑی سے بڑی طاقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور پنجے سے پنجہ ملا کر بات کر سکیں۔ کسی بڑی طاقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والے یوں تو ہمارے درمیان بہت سے لوگ موجود رہے ہیں لیکن وہ اس دوران ایک آنکھ میچ لیتے تھے۔ اسی طرح کسی بڑی طاقت سے پنجے سے پنجہ ملا کر بھی یہ لوگ بات کرتے تھے لیکن اس دوران آہستہ آہستہ سے اپنی انگلی اس کی ہتھیلی پر پھیر دیتے تھے۔ انوکی لورا کشتی کرنے والے پہلوان نہیں ہیں وہ اگر ہم لوگوں میں شامل ہو گیا تو بھی ایسا نہیں کرے گا!

اے مین کالڈ ٹائیگر!

آج ایک سینما کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم نے ایک فلم کا سائن بورڈ دیکھا ہے اور انسپائر ہوئے ہیں۔ فلم کا نام "اے مین کالڈ ٹائیگر" (A Man Called Tiger) ہے اور نمائش کنندگان نے اس کا ترجمہ "شیر کا بچہ" کیا ہے۔ سینما کے باہر اس فلم سے متعلق مختلف پوسٹر لگے ہوئے ہیں' جن میں سے ایک میں فلم کے ہیرو جمی وانگ یو کو کرانے کے جوہر دکھاتے اور مقابل کو پیٹ پکڑے دکھایا گیا ہے۔ ایک پوسٹر میں نیم عریاں حسینہ نظر آرہی ہے۔ جس کے بالائی حصے کی "غیر ضروری وضاحت" کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ بہت "توپ" قسم کی عورت ہے ایک اور منظر میں ہیرو اور ہیروئن کو ایک دوسرے کی شہ رگ سے قریب دکھایا گیا ہے ممکن ہے اکبر الٰہ آبادی کے ایک شعر کی روشنی میں یہ دونوں گریجویٹ ہوں اور "علمی مباحثے" کر رہے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ "فلمی مباحثے" کر رہے ہوں!

یہ فلم حال ہی میں ریلیز ہوئی ہے اور یوں ہم ابھی تک نہیں دیکھ سکے مگر اس کے جاپانی ہیرو یعنی جمی وانگ یو کی ایک فلم ہم اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں جس کا ترجمہ نمائش کنندگان نے "کنگ فو کا بادشاہ" کیا تھا۔ اس فلم سے ہمیں پتہ چلا تھا کہ محترم جمی وانگ یو صاحب المعروف شیر کا بچہ مخالفین کے ہڈی توڑنے کے ماہر ہیں۔ اگر صف اعداء بھی ان کے مقابل ہو تو وہ کیسے کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں۔ قدرت نے انہیں ذہن رسا تو عطا نہیں کیا چنانچہ وہ اکثر "ٹریپ" میں آجاتے ہیں مگر اپنے "پینتروں" کی وجہ سے ہر بار بڑی صفائی سے بچ نکلتے ہیں دراصل وانگ جمی یو صاحب المعروف شیر کا بچہ ماہر یہ پینترے بدلنے کے ہیں چنانچہ وہ مخالفین کے وار سے بچنے کے لئے بڑی پھرتی کے ساتھ کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب ہو جاتے ہیں' قلابازیاں لگانے لگتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ علق سے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخالفین کی طرف سے کسی وار کے بغیر ہی وہ محض عادتاً یا احتیاطاً کھڑے کھڑے قلابازیاں لگانے لگتے ہیں۔ شیر کے بچے کی ایک دلچسپ حرکت یہ بھی ہے جس سے دوران فلم انسان کے بچے خصوصی طور پر محظوظ ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ چنا سارا زور ہاتھ کی ایک انگلی پر ڈال کر دوسر کے بل کھڑے ہو جاتے ہیں اور چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ جمی وانگ یو صاحب نے اردو شاعری کا مطالعہ نہیں فرمایا ورنہ ہم یہ شعر ان کی نذر کرتے۔

اس نقش پا کے سجدے نے اتنا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ظاہر ہے کہ اس حرکی وضاحت کی ضرورت تو نہیں کہ شیر کے بچے کے یہ سارے کمالات دراصل ہدایت کار کے کمال ہوتے ہیں۔ متعدد مقامات پر کیمرہ مین کیمرہ ٹرک کے ذریعے جمی وانگ یو کو "اصلی شیر دا بچہ" ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ فلم کی دنیا حقیقت کی دنیا سے کوسوں دور ہوتی ہے چنانچہ جمی وانگ یو تو ہو سکتے ہیں شیر کے بچے نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ کھلن صورتحال تو کیا "معمولی صورت حال" کا سامنا بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ جب سٹوڈیو سے باہر ہوتے ہیں دوبارہ سٹوڈیو کے اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں!

مگر محترم جمی وانگ صاحب کے بارے میں ہم نے یہ سب باتیں ان کی سابقہ فلم "کنگ فو کا بادشاہ" کو مدنظر رکھتے ہوئے کہی ہیں کیونکہ لڑکی مارکٹائی اور حسن و عشق کی چاشنی سے لبریز یہ شاہکار ہم ماضی میں دیکھ چکے ہیں جبکہ ان کی نئی فلم "اے مین کالڈ ٹائیگر" ہم نے ابھی نہیں دیکھی اخباروں میں اس کا اشتہار پڑھا ہے اور سینما کے باہر اس کے پوسٹر دیکھے ہیں۔ اب دو چار دنوں میں یہ فلم دیکھیں گے تو بتائیں گے کہ کیسی ہے، اور کتنے دنوں چلے گی!

◆◆◆

جان بچانے کے طریقے!

جان کی حفاظت تو شریعت کی رو سے بھی ضروری ہے چنانچہ ہمیں چاہیے کہ اپنی جان بچانے کے لئے منہ بند رکھیں کیونکہ شہر میں گرد و غبار بہت ہے۔ ہم اگر منہ بند رکھیں گے تو گرد و غبار سے بھی محفوظ رہیں گے البتہ منہ اگر مکمل طور پر بند رکھنا ممکن نہ ہو تو درمیان میں تھوڑا بہت کھول بھی لیں تاکہ کم سے کم گرد و غبار اندر جائے۔ جیسی مت کے بیوقوف منہ پر کپڑا باندھ کر گھروں سے نکلتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ فضا میں موجود کیڑوں مکوڑوں کو کہ جو بیا وجہ منہ میں چلے جاتے ہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتے۔ حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ وہ ان کی جان بچانے کے بجائے اپنی جان بچانے کے لیے منہ پر کپڑا باندھ کر نکلتے ہیں۔ اور یوں روزانہ اس پاؤ بھر مٹی سے محفوظ رہتے ہیں جو منہ کھولنے کی صورت میں معدوں میں پہنچ کر جم جاتی ہے اور انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ ویسے ہمارے نزدیک اگر مزید احتیاط مقصود ہو تو سروں پر بھی کس کر رومال باندھ کر گھر سے نکلنا چاہیے کہ ایک تو ہوا تیز چلنے کی صورت میں سر ننگا نہیں ہوتا اور دوسرے سر میں خاک نہیں پڑتی۔ ہمارے سگے بھائی تو اس سلسلے میں بہت محتاط ہیں وہ سر بھی باندھ کر رکھتے ہیں منہ کو بھی مونچھوں اور داڑھی سے ڈھانپے رکھتے ہیں اور کچھ بھی پہنتے ہیں ان سطور میں سر پر ٹوپی رکھنے کا مشورہ ہم نے اس لئے نہیں دیا کہ ان دنوں ٹوپی ذرا سی ہوا میں سر سے اتر جاتی ہے کیونکہ سروں پر بال بہت کم رہ گئے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کے ایک دفعہ "بال چر" ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اس کے سر کے بال اڑ گئے اور پھر سر کے بال بھی جڑ سے اکھڑ گئے۔ اس نے اپنے ایک ہمسائے کو یہ صورت حال بتائی تو ہمسائے نے اسے ایک طبیب کا پتہ دیا اور کہا کہ ان کے پاس جاؤ کیونکہ میرے ایک عزیز دوست کو بھی "بال چر" ہو گیا تھا مگر اللہ نے بڑا کرم کیا۔ اس طبیب نے میرے دوست سے کہا تم پنج وقت نماز پڑھا کرو اور سر پر ٹوپی رکھا کرو چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس پر ہمارے دوست نے اپنے ہمسائے سے پوچھا کہ اس سے تمہارے دوست کا "بال چر" ٹھیک ہو گیا؟ ہمسائے نے کہا کہ اللہ نے بڑا کرم کیا۔ "بال چر" تو ٹھیک نہیں ہوا مگر میرا وہ دوست اب پنج وقت نماز پڑھتا ہے اور سر پر ہمیشہ ٹوپی رکھتا ہے۔ مگر سچ پوچھیں تو ہمیں ایسے طبیب بالکل اچھے نہیں لگتے جو "بال چر" تو جوں کا توں رہنے دیں اور سارا زور نماز پڑھنے اور سر پر ٹوپیاں پہنانے میں صرف کر دیں۔

خیر یہ تو بات یونہی درمیان میں آ گئی۔ ہم تو ان سطور میں جان بچانے کے طریقوں پر روشنی ڈال رہے تھے سو جان بچانے کا

ایک بہترین طریقہ یہ بھی ہے کہ کھانا ہمیشہ اعلیٰ دسترخواں پر کھایا جائے۔ چھوٹے موٹے لوگوں کے ساتھ چھوٹے موٹے ہوٹلوں میں بیٹھ کر کھانا کھانے سے پیٹ کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ کھانا حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق نہیں ہوتا۔ بڑے لوگوں کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے سے کم از کم پیٹ کی بیماریاں نہیں ہوتیں۔ صرف دل کی بیماری کا اندیشہ ہے بقول اقبال:

"فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟"

مگر اقبال کی سبھی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے' کیونکہ اگر صاحبانِ اقتدار کا ساتھ دیا جائے تو "بیماری دل" بھی ایک کوالیفکیشن بن جاتی ہے اور شکم کی بیماریوں سے بھی انسان محفوظ رہتا ہے۔ یوں بھی یہاں ہم جان بچانے کی بات کر رہے ہیں' روح کی حفاظت کرنے کے طریقے بیان نہیں کر رہے ہیں۔ اقبال کی باتوں پر جائیں تو وہ

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ایسی شکم دشمن باتیں بھی کرتا ہے۔ یہ تو شرفا کو بھوکوں مروانے والی باتیں ہیں۔ اس قسم کے رزق سے اگر پرواز میں کوتاہی آتی ہے تو بصورت دیگر یہ "پرواز" ہی "کینسل" ہو جاتی ہے۔ سو جان بچانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دسترخوان کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے!

ور اگر بالفرض محال کسی دوست کو ہماری طرف سے پیش کردہ جان بچانے کے ان طریقوں سے اختلاف ہو اور وہ سمجھتا ہو کہ منہ بند رکھنے اور اعلیٰ دسترخوان کا انتخاب کرنے سے جان بچ جاتی ہے مگر ایمان خراب ہوتا ہے تو ان کے لئے بھی ہماری زنبیل میں ایک مشورہ موجود ہے اور وہ یہ کہ جان بھی بچ جائے گی' ایمان بھی محفوظ رہے گا۔ کیونکہ جب دل سے سارے وسوسے' سارے حدشے اور سارے خوف دور ہو جائیں' تو پھر کوئی چیز کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ حتیٰ کہ موت بھی منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ جان بچانے کا سب سے اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ جان بچانے کا خیال دل سے نکال دیا جائے۔ سو جو دوست ہمارے اس مشورے کو صائب سمجھیں' وہ اپنے قفل کھول دیں' نیز جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو' اس رزق پر موت کو ترجیح دیں کہ اب تو جان اسی صورت میں بچ سکتی ہے ورنہ "موسیٰ نسیا موت توں' تے اگے کھڑی موت" ایسی صورت حال بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

◆◆◆

کچھ وزیروں کے بارے میں!

زندگی کچھ اتنی مصروف ہوگئی ہے کہ اب اپنے بال بچوں کے لئے بھی وقت نہیں ملتا۔ باقی باتیں چھوڑیں' جب سے کابینہ بنی ہے بچے کہہ رہے ہیں ابو ہمیں وزیر دکھاؤ' لیکن ہم ان کی یہ خواہش بھی پوری نہیں کر سکے۔ بچوں پر ہی کیا موقوف' خود ہم نے ابھی تک اپنی ہی خواہش پوری نہیں کی۔ اس دوران وزیروں کے اعزاز میں دیئے گئے کئی استقبالیوں کے دعوت نامے موصول ہوئے ہم نے ہر بار جی میں ٹھانی کہ اس بار ضرور شریک ہوں گے مگر کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آئی اور یوں ہم وزیر صاحبان کے دیدار سے محروم رہ گئے۔ ایک بار صبح صبح بیک وقت دو تین وزیروں سے ملاقات کی سبیل پیدا ہوئی مگر ہم نے سوچا کہ نہار منہ ملنا مناسب نہیں۔ نہار منہ ان کے جو بیانات پڑھ لیتے ہیں وہ کافی ہیں۔

بات تو ہم یہ کر رہے تھے کہ اپنی آزمی ترجیحی مصروفیات کی وجہ سے ابھی تک ہم اپنے وزیروں میں سے کسی سے مل ہی نہ سکے جب کہ ان میں سے ایک وزیر تو ایسے بھی ہیں جن سے ملنے کے حوالے سے ایک شاعر نے کہا ہے۔

اے دوست کسی ہم دم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

اور یہ نویں نکور صوبائی وزیر اپنے نور شریف ہیں جنہیں بلا خوف و خطر پنجاب کی کابینہ کا "سوہنا منڈا" قرار دیا جا سکتا ہے اندر باہر سے یہ خوبصورت نوجوان اگر وزیر بنا ہے تو ظاہر ہے سوچ سمجھ کر ہی بنا ہوگا۔ لیکن صوبائی وزیر بننے کے بعد سے ہماری ملاقات ابھی ان سے بھی نہیں ہوئی۔ وزیروں کے حوالے سے ہمارے ایک دوست نے سلیس پنجابی میں ہمیں طعنہ دیا ہے جس کا مہذب اردو میں ترجمہ یہ ہے کہ تم کیسے وزیر آبادی ہو کہ وزیروں سے ملنے سے گھبراتے ہو؟ ہم نے ان کے جواب میں "باشد خموشی" والی پالیسی پر عمل کیا لیکن آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ جتنے ہم مصروف ہیں اس سے زیادہ ہمارے یہ وزیر صاحبان مصروف ہیں۔ پچھلے دنوں سندھ کابینہ کے ایک وزیر کے بارے میں ایک سیاسی ڈائری نویس نے اطلاع دی تھی کہ جب ایک وزیر کے کمرے میں ملاقاتیوں کا ایک جم غفیر صبح سے دوپہر 3 بجے تک جمع رہا اور ان میں سے کسی نے ملنے کا نام نہ لیا تو وزیر صاحب کے اشارے پر ایک صاحب نے ملاقاتیوں کے اس ہجوم کو مطلع کیا کہ وزیر صاحب کو سخت بھوک لگی ہے چنانچہ وہ اب کھانا کھانا چاہتے ہیں اس پر سب ملاقاتی ایک ایک

کر کے کمرے سے باہر نکل گئے اور تھوڑی دیر بعد ہاتھ دھو کر کمرے میں واپس آ گئے۔ اس پر وزیر صاحب کا پارہ چڑھ گیا اور انہوں نے تقریباً چیخ کر کہا ''تم لوگ مجھے کھانے بھی نہیں دو گے؟'' ظاہر ہے انہوں نے ایسا سارے دن کی تھکن اور کھچاؤ کی وجہ سے غصے کے عالم میں کہا' ورنہ ملاقاتیوں کا بھی یہ منشا نہیں تھا' بے چارے تو صرف یہ چاہتے ہوں گے کہ مل کے کھایا جائے!

جیسا کہ ہم نے اپنے کالم کے آغاز میں بتایا کہ اپنی نامعقول مصروفیات کی وجہ سے ان استقبالیوں میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ جو نئے وزیروں کو خوش آمدید کہنے کے لئے مختلف حلقوں کی طرف سے دیئے گئے لیکن ہمارے ایک دوست نے جو ایسے استقبالیوں میں شرکت کے رسیا ہیں ہمیں بتایا کہ یہ استقبالیے زیادہ تر ان لوگوں نے دیئے جن کا تجربہ اس میدان میں بہت وسیع ہے اور ہر دور میں اس طرح کی ضیافتوں کا اہتمام کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایسے مواقع پر خطبہ استقبالیہ پیش کرنے کے ضمن میں انہیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا' لہٰذا انہوں نے اپنے پرانے خطبے نکالے اور ان استقبالیہ میں پرانے ناموں کی جگہ نئے نام ڈال کر پڑھ دیئے۔ ہمیں اپنے دوست کی اس بات پر یقین نہ آیا' کیونکہ ایسا تو تب ممکن تھا' اگر آج جو وزیر بنے ہیں وہ گزشتہ کل کے وزیروں جیسے ہی ہوتے' اگر نئے وزیر اپنے علم' قابلیت' عادات واطوار اور طور طریقوں میں گزشتہ وزیروں سے مختلف ہیں' تو پھر ان خطبہ خانوں کی بڑی زیادتی ہے کہ انہوں نے پرانے استقبالیہ خطبے پڑھے' اگر تیر چلایا تو صرف یہ کہ ان میں سابقہ وزیروں کی جگہ نئے وزیروں کے نام ڈال دیئے!

''تھوبر توائے چرخ گرداں تھوا''

اقبال احمد خان کی ''مغویہ'' کار!

جس دن سے پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری اقبال احمد خان کی کار چوری ہوئی ہے اس دن سے وہ پہلے سے زیادہ ''شانت'' نظر آتے ہیں کہ رہزن کا جو تھوڑا بہت دھڑکا تھا' وہ بھی جاتا رہا۔ گزشتہ ہفتے لاہور میں ایک موٹر سائیکل سوار دوست نے اقبال احمد خان صاحب کو للت کے لیے سرگرداں دیکھا تو اس نے یہ فراخدلانہ پیش کش کی کہ وہ انہیں موٹر سائیکل پر کہیں بھی چھوڑ سکتے ہیں مگر مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل کو اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ فوری طور پر انہیں ایک کار میسر آ گئی۔ ویسے بھی مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت ابھی اتنی بھی گوری نہیں ہوئی کہ ایک دم کار سے سائیکل یا موٹر سائیکل پر آ جائے۔ جس دن آ گئی اس دن مسلم لیگ' حکومت کے بغیر ہی پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہوگی۔

اقبال احمد خان سے پہلے ایک اور مسلم لیگی رہنما کی کار چوری ہو چکی ہے۔ یہ کار راجہ ظفر الحق کی تھی مگر یہ گزشتہ حکومت کے دوران چوری ہوئی تھی لہٰذا راجہ صاحب کو تو ''چور'' کی تلاش میں زیادہ سرگرداں نہیں ہونا پڑا ہوگا البتہ مسئلہ تو اقبال احمد خان کی کار کا ہے کہ یہ ان کی اپنی حکومت کے دور میں چوری ہوئی ہے چنانچہ وہ زیادہ واویلا بھی نہیں کر سکتے حالانکہ ایک مجھ ہدر دوست نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنی کار کی چوری کی زیادہ سے زیادہ پبلسٹی کرائیں بلکہ ان کے رشتے داروں میں اگر دو چار کار کے مالکان ہیں تو ان کی کاریں چند دنوں کے لئے اپنے نام کرائیں' وہ ان کی سیاست پر ان کی غربت کے جو اثرات پڑے ہیں اس کا ازالہ ہو سکے مگر خان احمد صاحب نے اپنے مجھ ہدر دوست کا مشورہ قبول نہیں کیا جس پر ان کے دوست نے تقلین شاہ کے انداز میں کہا ''ہدایت لئدا تمیں ترقی نہیں کر سکدا!''

خان صاحب کی کار چوری میرے نزدیک ایک خاص تشویشناک امر ہے جس کا ثبوت یہ کالم ہے کیونکہ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں خواتین کے لونگ گواچنا شروع ہو گئے تھے اور اب آئی جے آئی کی حکومت میں مسلم لیگ گم ہو رہی ہے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ کار کی چوری کے اگلے روز ایک پولیس افسر نے خان صاحب سے پوچھا کہ خان صاحب آپ کو رات بھر نیند تو نہیں آئی ہوگی؟ خان صاحب نے کہا کہ نیند تو آپ کی حرام ہونی چاہیے کہ اس سے آپ کی کارکردگی پر حرف آتا ہے۔ مجھے یقین ہے خان صاحب نے پولیس آفیسر کو جب یہ جواب دیا ہوگا' ان کے ذہن میں حضرت عمر فاروق کا دور حکومت ہوگا!

آج سے تقریباً پندرہ برس قبل میرا البرٹا سکوز گم ہو گیا تھا جس پر میں نے ایک کالم "محترم چور صاحب" کے عنوان سے لکھا تھا اور پھر اس کالم پر ہی کالم نگار دوستوں نے ایک ایک کر کے کالم باندھے تھے جس سے محترم چور صاحب اتنے گھبرائے کہ سکوز واپس چھوڑ گئے۔ میں یہ بات خان صاحب کو تسلی دینے کے لئے نہیں کہہ رہا بلکہ پورے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ کچھ دنوں کے بعد خان صاحب کو بھی کار کسی سڑک کے کنارے کھڑی ملے گی اور مزید کچھ دنوں بعد یہ انکشاف ہوگا کہ چور خان صاحب کی کار چوری کے ارادے سے نہیں بلکہ محض واردات کی نیت سے "اغوا" کر کے لے گئے تھے چنانچہ وہ مقصد پورا ہونے کے بعد حق بحقدار رسید کے مصداق کار واپس چھوڑ جائیں گے بالکل اسی طرح جس طرح ماضی میں حکمران مسلم لیگ کے نام پر وارداتیں کرنے کے بعد مسلم لیگ چھوڑ دیتے تھے۔ ان دنوں بھی جاگیردار مسلم لیگ کے نام پر وارداتیں کر رہے ہیں۔

ممکن ہے خان صاحب کی کار ان دنوں انہی کے زیر استعمال ہو۔ "مغویہ" کی "بازیابی" کے لئے خان صاحب پیپلز پارٹی ہی جماعت کے کسی وڈیرے کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو جائیں تو کار سمیت ان کے باقی سارے مسئلے بھی حل ہو جائیں گے۔ سیاست میں انسان کو یا تو خود وڈیرا بننا پڑتا ہے یا پھر کسی وڈیرے کا مزارع' مگر خان صاحب ہیں کہ نہ خود وڈیرا بنتے ہیں نہ کسی وڈیرے کے مزارع' بس ایک عرصے سے ایک وڈیرے کی پیش گوئیوں پر گزارا کرتے چلے آ رہے ہیں۔

لیڈی ڈیانا' مولانا عبدالقادر آزاد اور امیر گلستان جنجوعہ!

لیڈی ڈیانا نے پاکستان آ کر اچھا نہیں کیا' لیڈی صاحبہ کی تصویریں اخباروں میں شائع ہوتی تھیں تو میرے جیسے ان کے عقیدت مند تک جی کو شاد کر دیتے تھے بلکہ ادھر ادھر سے ان کی تصویریں ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے جذبہ ارادت مندی کی تسکین کرتے تھے۔ یہ فقیر جب کبھی لندن جاتا تو فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے بھی احتیاطاً دائیں بائیں دیکھ لیتا کہ کہیں شہزادی صاحبہ "ہم رکاب" تو نہیں ہیں' یہ اس جذبہ ارادت مندی ہی کا کرشمہ تھا کہ راقم نے ان کے بارے میں کالموں کی تقریباً سنچری مکمل کی۔ شہزادہ چارلس کے خلاف لکھا' اس جاپانی پہلوان کے خلاف لکھا جو لیڈی صاحبہ کے عشق میں اتنا جلا ہوا کہ ان کی تصویر گود میں لے کر تصویر تروڑی اور یوں رقیب روسیاہ کا کردار ادا کیا لیکن سچی بات پوچھیں تو اب میں اپنے لکھے پر پشیماں ہوں۔ چنانچہ شہزادہ چارلس اور پہلوان جی سے معذرت کرنے کو جی چاہتا ہے کہ میں نے خوامخواہ ان شرفاء کی دل آزاری کی' اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے' انہیں بھی معاف فرمائے جو اتنا عرصہ میری دل آزاری کرتے رہے!

بات دراصل یوں ہے کہ شہزادی صاحبہ کی جو تصویریں اخباروں میں شائع ہوتی تھیں' وہ موٹا گردن تک ہوتی تھیں اور پھر تصویر کا معاملہ قریباً شنید ہی کا ہوتا ہے' شہزادی صاحبہ پاکستان تشریف لائیں تو اس "شنید" کے بعد "دید" کا مرحلہ آیا یعنی شہزادی صاحبہ کو سالم دیکھنے کا موقع ملا' بس یہیں سے شہزادی صاحبہ کی "بدقسمتی" کا آغاز ہوتا ہے۔ شفیق الرحمان نے ترک نادری کی پیروڈی میں نادر شاہ سے یہ جملہ کہلوایا ہے کہ "آج کل کے نوجوان بھی عجیب ہیں' ایک تل پر عاشق ہوتے ہیں اور سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں" ایک اسی طرح کے نوجوان نے شہزادی صاحبہ کو "سالم" دیکھا تو وہ بہت پریشان ہوا اور اسی پریشانی کے عالم میں اس نے عالم چنا کو یاد کیا اور کہا "اے بدنصیب انسان! تو اگر عورت ہوتا تو لیڈی ڈیانا ہوتا" میں نے اس نوجوان کو بہت ڈانٹا کہ بڑوں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کہتے' اس پر اس نے روہانسا ہو کر کہا "اسی لئے تو ایسی بات کی ہے کہ وہ مجھے بہت بڑی بڑی سی لگی ہیں" دراصل قصور اس نوجوان کا بھی نہیں اور قصور لیڈی صاحبہ کا بھی نہیں لگتا ہے کہ لیڈی صاحبہ بچوں کی پیدائش کے بعد ڈھنگ کی طرف زیادہ چڑھ گئی ہیں' جس کے نتیجے میں ان کا چہرہ پچک گیا ہے' جسم سوکھ گیا ہے اور یوں قد اصل سے بھی کہیں زیادہ لمبا بلکہ بھوتر اس لگنے لگا ہے جس کی وجہ سے یہ نوجوان اس "تل" پر "تملا" رہا ہے جس کی طفیل یہ سالم شہزادی پر عاشق ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے دورہ پاکستان کے دوران

لیڈی صاحب کے بہت سے عاشقوں کو اداس اور افسردہ پھرتے دیکھا ہے

"خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را!"

لیکن اللہ کی ذات بڑی بے نیاز ہے، وہ کیڑے کو پتھر میں بھی رزق دیتی ہے، اگر دورہ پاکستان کے دوران لیڈی صاحب سے کچھ "ووٹ" کم ہوئے ہیں تو چند ایک نئے ووٹ بنے بھی ہیں۔ بادشاہی مسجد کے خطیب مولانا عبدالقادر آزاد نے بادشاہی مسجد میں جس طرح لیڈی ڈیانا کا استقبال کیا ہے اس سے میری بات کی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن الحمداللہ مولانا کی نیت بالکل مختلف ہے، وہ لیڈی صاحب کو مشرف بہ اسلام کرنے کے خواہش مند لگتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سکرٹ میں ملبوس لیڈی صاحب کے سر پر دوپٹہ اوڑھا دیا تھا کہ بقول مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، لیڈی صاحب کو پاجامے کی ضرورت تھی۔ بعدازاں مولانا نے انہیں قرآن مجید کا ایک نسخہ پیش کیا اور ممکن ہے اپنی زبان سے بھی انہیں قبول اسلام کی دعوت دی ہو، مولانا کے ان اقدامات میں یقیناً ایک بڑی مصلحت پوشیدہ ہے مثلاً یہی کہ اگر لیڈی صاحب مولانا کی کوششوں سے اسلام قبول کر لیتی ہیں تو اس کے بعد شہزادہ چارلس کے عقد میں نہیں رہ سکیں گی۔

بہرحال لیڈی صاحب گزشتہ روز پاکستان کے چار روزہ کامیاب دورے کے بعد اپنے وطن روانہ ہو گئی ہیں، دو ہفتے بعد میں بھی چند دنوں کے لئے برطانیہ جا رہا ہوں لیکن اس دفعہ کسی اور کام سے جا رہا ہوں میں نے ٹیلی ویژن سے ان کے دورے کی جو رپورٹ دیکھی ہے اس میں سب سے زیادہ نہال میں نے گورنر سرحد امیر گلستان جنجوعہ کو پایا ہے، موصوف لیڈی کے سامنے "بچھے بچھے" جاتے پھر رہے تھے اور ان کے انگ انگ سے مسرت اور خوشی پھوٹ رہی تھی لگتا تھا لیڈی صاحب کی خدمت کر کے انہیں روحانی مسرت ہو رہی ہے۔ چنانچہ جنجوعہ صاحب مجھے لیڈی صاحب کے ان نئے ووٹوں سے ایک ووٹ محسوس ہوئے جو حالیہ دورہ پاکستان کے دوران لیڈی صاحب نے اپنے حسن سے نہیں، غالباً حسن اخلاق سے بنائے ہیں۔ مولانا عبدالقادر آزاد اور امیر گلستان جنجوعہ صاحب اگر لیڈی صاحبہ کو کوئی پیغام بھیجنا چاہیں تو بندہ اس "خدمت" کے لئے حاضر ہے۔ مولانا کے متعلق تو مجھے علم ہے کہ وہ اپنی چند تبلیغی کتابیں میرے ہاتھ روانہ فرمائیں گے تاکہ لیڈی صاحب جلد از جلد قبول اسلام کا اعلان فرمائیں اور یوں شہزادہ چارلس کے عقد سے "آزاد" ہوں، البتہ امیر گلستان جنجوعہ صاحب کے بارے میں، میں پورے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا ممکن ہے وہ اس سلسلے میں کسی کا احسان اٹھانے کے روادار نہ ہوں کہ اردو شاعری کی روایت تو یہی رہی ہے!

◆◆◆

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے!

ہمارے ہاں بہت سے "مریض" ایسے ہیں جو زندگی ڈاکٹر کے دیئے ہوئے شیڈول کے عین مطابق گزارتے ہوئے اور قدرت کے مرتب کئے ہوئے شیڈول کے مطابق انتقال کر جاتے ہیں' مگر کچھ اللہ کے بے نیاز بندے ایسے بھی ہیں جو بیماری میں بھی وہی کرتے ہیں جو عالم صحت میں کرتے تھے اور یوں "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے" والے مقولے کو عملی جامہ پہناتے نظر ہیں۔ یک اسی طرح کے "بد پرہیز" سگریٹ نوش نے کسی کو کہا سگریٹ نوشی سے باز آ جاؤ' یہ دراصل ایک طرح کی "سلو پائزننگ" ہے سگریٹ نوش نے کہا "مجھے بھی مرنے کی کوئی جلدی نہیں"

میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو شوگر کا مریض ہے اور باقاعدگی سے حلوہ پوری کا ناشتہ کرتا ہے۔ ایک دوست کو ہائی بلڈ پریشر ہے اور وہ جب بھی ہوتا ہے ہاتھ پکڑ کر رائل پارک لے جاتا ہے کہ پہلوان کے پائے کھاتے ہیں۔ میں ان دوستوں کو بہت سمجھاتا ہوں کہ بے شک خدا قادر مطلق ہے زندگی اور موت اسی کے اختیار میں ہے لیکن انسان کو اپنی طرف سے تو احتیاطی تدابیر کرنی چاہئیں مگر یہ جیالے ایک نہیں سنتے اور جواب میں عجیب و غریب قسم کی دلیلیں دیتے ہیں بلکہ لطیفے بھی سناتے ہیں۔ مثلاً ایک چودھری کی گائے چوری ہو گئی' اس نے سارے گاؤں کو جمع کیا۔ قرآن شریف ان کے ہاتھ میں تھما کر حلف اٹھوایا کہ "اگر گائے میں نے چوری کی ہو تو میرے بچے مریں" سب نے یہ حلف اٹھایا سمیت اس میراثی کے جس نے گائے چوری کی تھی۔ میراثی کے ایک جاننے والے نے بعد میں اسے پکڑ لیا اور کہا "تم عجیب آدمی ہو' میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ گائے تم نے چوری کی ہے مگر اس کے باوجود تم نے حلف اٹھایا کہ اگر میں نے گائے چوری کی ہو تو میرے بچے مریں!"

میراثی نے کہا "مولا خوش رکھے' بھوکے مرنے سے بہتر ہے کہ بچے دودھ پی کر مریں!" یہ بد پرہیز بھی اس قسم کی بات کرتے ہیں کہ بھوکا مرنے سے بہتر ہے انسان کھاتے پیتے مرے' یہ تو ایک مذہبی حوالہ بھی دیتے ہیں کہ پیٹ کی بیماری سے مرنے والا بھی شہید ہوتا ہے۔

تاہم اس ضمن میں کمال کا واقعہ میرے ایک دوست کا ہے' میرے اس دوست کو نہایت شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا' انہیں فوراً "انتہائی نگہداشت" کے کمرے میں داخل کیا گیا' آکسیجن لگا دی گئی اور وزیٹرز کو منع کر دیا گیا کہ وہ ان سے بات چیت نہ کریں۔ اگلے

روز میرے اس دوست نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو پتہ چلا کہ عزیزوں یا ہسپتال کے عملے میں سے وہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے اس نے آکسیجن، تاری، بستر سے اترا اور ایک لمبا برآمدہ عبور کر کے لفٹ تک پہنچا' لفٹ خراب تھی' چنانچہ دو منزلیں سیڑھیوں کے ذریعے طے کیں' وہاں سے دو سگریٹ لیے اور یکے بعد دیگرے دونوں سگریٹ پینے کے بعد واپس لفٹ تک گیا' لفٹ حسب سابق خراب تھی' چنانچہ دو منزلیں سیڑھیوں کے ذریعے طے کر کے اوپر پہنچا اور پھر طویل برآمدے سے گزرتے ہوئے میرے یہ دوست واپس اپنے کمرے میں گیا اور چارپائی پر بیٹھتے ہی خوف زدہ ہو گیا کہ یہ میں نے کیا کیا ہے؟ چنانچہ فوراً ڈاکٹر کو بلایا کہ ذرا مجھے چیک کریں' ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد کہا "جتنے تم آج ٹھیک ہو اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ شاباش پرہیز جاری رکھو!"

ان سطور سے میرا مقصود حاشا وکلا "بد پرہیزوں" کو بلا شیری دینا نہیں بلکہ ان دوستوں کو حوصلہ دینا ہے جو زندگی میں معمولی تکلیف بھی آئے تو حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں چنانچہ ایک سروے کے مطابق زیادہ اموات بیماری کی وجہ سے نہیں اس بیماری سے پیدا ہونے والے خوف و مایوسی کی وجہ سے ہوتی ہیں' انسان اگر بیماری کو زیادہ لفٹ نہ کرائے تو بیماری کچھ شرمسار ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے اور کسی "مستحق" کو جا چمٹتی ہے۔ اگر انسان کا حوصلہ بلند ہو اور خدا پر یقین کامل ہو تو وہ ہنستے ہنستے موت کا منہ پھیر دیتا ہے۔ انسان کو ڈاکٹروں کے مشوروں پر عمل ضرور کرنا چاہیے لیکن صرف اسی قدر جب قدر یہ ڈاکٹر اپنے مشوروں پہ خود عمل کرتے ہیں' اگر آپ سیر نہیں کرتے تو سیر نہ کرنے والوں کو موت کی جو "وعید" سنائی جاتی ہے' اس پر زیادہ کان نہ دھریں ورنہ سچ مچ "دھر" لئے جائیں گے کہ خوف اندیشوں کو حقیقت میں بدل دیتا ہے۔ یہی حال قوموں کا بھی ہے' ہر قوم میں خامیاں اور کوتاہیاں ہوتی ہیں لیکن اگر اس کی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا جائے تو اس کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں اور جس قوم کے حوصلے بلند ہوں' وہ پہاڑوں سے بھی ٹکرا جاتی ہے' آپ نہ ذاتی طور پر مایوس ہوں' نہ قوم کے بارے میں مایوسی پھیلائیں کہ جنگ کے دنوں میں مایوسی پھیلانا دشمن کی اولین ترجیحات میں شامل ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی بد پرہیزی جاری رہتی ہیں اور انہیں ضرور جاری رہنا چاہیے ورنہ آپ انسان سے "کیلکولیٹر" بن جائیں گے اور انسان کو انسان ہی رہنا چاہیے حساب کتاب والی مشین نہیں بننا چاہیے۔ "پاسبان عقل" ضرور ساتھ رکھنا چاہیے' لیکن اسے کبھی کبھی تب بھی چھوڑ دینا چاہیے!

◆◆◆

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے!

اے کالم نگار! بول کہ لب آزاد ہیں تیرے! جنرل فضل حق کو قتل کر دیا گیا' لوگوں کو بتا کہ اس قتل میں کون ملوث ہے؟ ''تکبیر'' کے ایڈیٹر محمد صلاح الدین کا گھر کراچی میں جلا دیا گیا' اے کالم نگار! بول کہ لب آزاد ہیں تیرے! لوگوں کو بتا کہ حملہ آور کون ہیں اور یہ بھی کہ اس حملے کا اہانت رسول سے کوئی دور کا تعلق بھی ہے کہ نہیں؟ اے کالم نگار! بول کہ لب آزاد ہیں تیرے! یہ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کیا ہے؟ یہ انجمن سپاہ صحابہ کیا ہے؟ یہ جئے سندھ کیا ہے؟ یہ ایم کیو ایم کیا ہے؟ یہ الذوالفقار کیا ہے؟ یہ جام صادق کیا ہے؟ اے کالم نگار! بول کہ لب آزاد ہیں تیرے! لوگوں کو بتا کہ ایک انگریزی اخبار نے شہید ضیاء الحق کی کروڑوں روپوں کی جائیداد کی تفصیل دستاویزات کے ساتھ شائع کی ہے' صحافیوں' دانشوروں' صوفیوں اور معززین کی ایک فہرست شائع ہوئی ہے جس میں ان رقومات کی تفصیل درج ہے جو انہیں حکومت کے خفیہ فنڈ سے ملتے رہے ہیں۔ اے کالم نگار! بول کہ لب آزاد ہیں تیرے! لوگوں کو بتا کہ ملک میں معاشی استحکام کے لئے صنعتیں لگانے کے پروگرام کو دشمن ملکوں اور اپوزیشن میں شامل بعض جماعتوں نے کس طرح سبوتاژ کیا؟ اے کالم نگار! بول کہ لب آزاد ہیں تیرے' لوگوں کو بتا کہ طلباء کے نام پر بنی ہوئی چند تنظیموں کا اصل کردار کیا ہے؟ اور دکانوں اور دیواروں پر لکھے ہوئے اس کے لیڈروں نے ڈکیتی' غنڈہ گردی اور قتل کی کتنی وارداتیں کی ہیں اور حکومتیں ان کی سرپرستی کیوں کرتی ہیں؟ اے کالم نگار! بول کہ لب آزاد ہیں تیرے' لوگوں کو بتا کہ پی پی پی ملتان کے ایک لیڈر کو انڈیا کے لئے کام کرنے کے الزام میں پکڑے کے بعد چھوڑا کیوں گیا تھا؟ حکومتیں ملکی استحکام کو خطرات سے دوچار کرنے والی قوتوں سے چشم پوشی بلکہ پردہ پوشی کیوں کرتی ہیں اور اپنے اقتدار کے لئے خطرہ بننے والی کسی قوت کو چشم زدن میں کس طرح گھیرے میں لیا جاتا ہے؟ اے کالم نگار! لوگوں کو بتا کہ ملک میں ناقص تعمیر کے ضمن میں جن سربراہ اور شخصیتوں کے خلاف کارروائی کی گئی ہے' ان میں سے کسی ایک کا بال بھی بیکا نہ ہوگا کہ ان کا تعلق ملک کی اس تین فیصد برگزیدہ کلاس سے ہے جن کے آرام و آسائش کے لئے ملک کی ستانوے فی صد آبادی کو بنیادی ضرورتوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ لوگوں کو بتا کہ غیر ملکی ایجنٹوں کا ایک جال ہے جو حاکم' خبر نویس' عوام اور سیاستدان کی ڈھال استعمال کر کے خفیہ ایجنسیوں کو کس طرح بے بس بنا دیتا ہے۔ جو ان کے بارے میں ٹھوس ثبوت فائلوں میں بند کرتی چلی جاتی ہے' محکمہ خارجہ اور داخلہ میں وہ کون لوگ ہیں جن پر ہاتھ ڈالنا کسی کے بس میں نہیں! اے کالم نگار! بول کہ لب آزاد ہیں تیرے! اور بتا

کہ کیا ہم واقعی آزاد قوم ہیں اور یہ آزادی کتنی بھی زیادہ دیر برقرار رہ سکے گی؟

اے کالم نگار! یہ تو قدرے بڑی باتیں ہیں' جن پر تیرے جیسا پاکستان کا چھوٹا عاشق شاید نہیں لکھ سکتا' چل تو اگر یہ باتیں نہیں لکھ سکتا تو عوام کو جہالتوں سے نکالنے کے لئے چھوٹی چھوٹی باتیں تو لکھ' لوگوں کو بتا کہ شہر میں فلاں فلاں قبر جعلی بزرگ کی ہے۔ اے کالم نگار! بول کے لب آزاد ہیں تیرے! کم از کم بتا تو بول کہ یہ بڑے بڑے سجادہ نشین جو اسلامی اصولوں کو منہ چڑھاتے ہوئے ہزاروں مربع اراضی کے مالک بنے بیٹھے ہیں' جو شراب پیتے ہیں' ریس کھیلتے ہیں اور اپنی جاگیروں اور سادہ لوح عقیدت مندوں کے بل بوتے پر اسمبلی کی نشستوں پر قابض ہو جاتے ہیں' قیامت کے دن تمہاری شفاعت نہیں کر سکیں گے کہ یہ وہاں خود جہنم کے نچلے ترین طبقے میں ہوں گے! اے کالم نگار! لوگوں کو بتا کہ ہمارے علماء اسلام کی جو تشریح کر رہے ہیں وہ دورِ ملوکیت کی ہے جو اس دور کے بادشاہوں کو بھی "سوٹ" کرتی تھی' اسلام کی اس تشریح و تعبیر کے مطابق "بادشاہوں" کی اولین ترجیح اتوار کی بجائے جمعے کی چھٹی' شراب پر پابندی' گانے بجانے پر پابندی' جوئے پر پابندی' ماہِ رمضان میں کھانے پینے پر پابندی' محرم میں ہنسنے ہنسانے پر پابندی' عورت کی آدھی گواہی' مردوں کو چار شادیوں کی آزادی' حدود آرڈیننس اور شریعت بل کا نفاذ' نفاذِ اسلام کے ضمن میں ترجیحات اس ملک کے لئے ہیں جس کی کم و بیش نوے فی صد آبادی نہ شراب پیتی ہے' نہ جوا کھیلتی ہے' نہ ماہِ رمضان میں کھاتی ہے' نہ محرم میں ہنساتی ہے اور نہ چار شادیاں کرتی ہے۔ اسے جن چیزوں سے بچانے کی ضرورت ہے وہ بیروزگاری' غربت' انہیں خورد برد' لوٹ' جاگیرداری' عاقبت اور وڈیرا شاہی ہے لیکن اسلامی نظام کی یہ ترجیحات "بادشاہوں" کو "سوٹ" نہیں کرتیں' ان چیزوں کو چھیڑے بغیر باقی اسلام کے نفاذ پر انہیں کوئی اعتراض نہیں کیونکہ ان "بادشاہوں" پر نہ حدود آرڈیننس نافذ ہوگا' نہ رمضان اور محرم کی پابندیاں' نہ جمعے کی چھٹی اور نہ جوئے پر پابندی کہ اس طبقے کے لئے ماہِ رمضان میں فائیو سٹار ہوٹل قانونی طور پر کھلے ہوتے ہیں' حدود آرڈیننس کی بات ہی فضول ہے کہ ان کے عشرت کدوں میں حدود نافذ کرنے والے خود شریکِ عشرت ہوتے ہیں' جمعہ یا اتوار کی چھٹی سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کے لئے ہر روز روزِ عید ہے' ہر شب شبِ برات اور جہاں تک جوئے کا تعلق ہے' جوا صرف وہ ہے جو مزدور لوگ چارپائی پر بیٹھ کر کھیلتے ہیں' جوا وہ نہیں ہے جو پابندی کے باوجود آج بر سرِ عام ریس کورس میں کھیلا جاتا ہے اور جسے "تفریح اہلِ ہوس" کا نام دیا گیا ہے' لہٰذا اے علمائے کرام ذرا سوچو کہ تم کون سا اسلام کس کے لئے نافذ کرنا چاہتے ہو؟ اور اس کے ذریعے کس طبقے کو بچانا چاہتے ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ آسان اسلام نافذ کر کے تم مشکل اسلام سے اپنی جان چھڑا رہے ہو؟

مگر علمائے کرام سے پہلے اے کالم نگار! تو بول کہ لب آزاد ہیں تیرے! مگر تو نہیں بولے گا کہ تجھے حاکموں' سیاستدانوں'

صحافیوں' افسروں' غیر ملکی ایجنٹوں' طالب علموں' سجادہ نشینوں اور ملاؤں سے ٹکر لینا پڑے گی' بلکہ خود جہالت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عوام بھی تجھے کلمہ حق نہیں کہنے دیں گے۔ اے کالم نگار! اگر تو نہیں بولے گا تو تیرا ملک جلا دیا جائے گا' مگر تجھے اپنا گھر عزیز ہے' لہٰذا اے کالم نگار! تو نے جو لکھنا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھ اور جو نہیں لکھنا' اس کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دے ورنہ تیرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔

اے کالم نگار! سچ لکھنا کوئی مشکل نہیں مگر سچ لکھنے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور تو تو الٹا "سچ" لکھنے کی قیمت وصول کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ لہٰذا اے کالم نگار! مت بول کہ تیرے لب آزاد نہیں ہیں۔

◆◆◆

میں نے کہا کہ کچھ نہیں' اس نے کہا ٹھیک ہے!

میں گزشتہ تین چار ماہ کے دوران کوئی کام نہیں لکھ سکا۔ بس اپنے قارئین کی مزے مزے کی باتیں سنتا رہا ہوں جو وہ خطوں میں' سر راہے ملاقات کے دوران اور ٹیلی فون پر کرتے رہے ہیں۔ میرے کالم نہ لکھنے کے حوالے سے ان میں بعض کے اندازے اور قیاسات بہت دلچسپ تھے بلکہ اس دوران میں نے اپنے بارے میں کچھ افواہیں بھی سنیں جو اتنی دل خوش کن تھیں کہ تردید کو جی نہیں چاہتا مگر آخر اللہ کو جان دینی ہے لہٰذا کیوں نہ صاف صاف بتادوں کہ پہلے میں اپنا سنڈی روم بنانے اور سنورنے میں لگا رہا۔ محض اس خیال سے اگر سنڈی قسمت میں نہیں تو کم از کم سنڈی روم تو ہو۔ اس کے بعد دو تین ہفتوں کے لئے یورپ چلا گیا اور واپسی پر کمر کی تکلیف نے اپنی پیٹ میں لے لیا۔ تاہم اتنا واضح رہے کہ دورہ یورپ اور کمر کی تکلیف کا آپس کا کوئی تعلق نہیں کہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میں نے کوئی وزنی چیز نہیں اٹھائی۔ چنانچہ سفر کے دوران اپنے سامان وغیرہ کے ضمن میں اپنے دوستوں کو زحمت دیتا رہا۔ واپسی پر میں نے ڈاکٹر کو چیک اپ کرایا تو اس نے مکمل آرام کا مشورہ دیا اور کہا کہ جسمانی تو کیا' کوئی دماغی کام بھی نہ کرنا' میں نے عرض کیا کہ ٹی وی سے ڈرامے کا وعدہ کر چکا ہوں' ڈاکٹر نے کہا ڈرامے کی خیر ہے' وہ لکھتے رہیں۔

ممکن ہے میری یہ وضاحت بلکہ وضاحتیں تسلی بخش نہ ہوں' چلیں ان کو رفع کریں' نمونے کے طور پر ایک اور وضاحت پیش کرتا ہوں۔

''گر قبول افتد زہے عز و شرف''

بات یہ ہے کہ میں لکھنے کے معاملے میں موڈ کا پابند ہوں بہت عرصے سے کوشش کر رہا ہوں کہ کالم سے میری کوئی غرض وابستہ ہو جائے تاکہ اسی بہانے کالم تو باقاعدگی سے لکھ لوں لیکن ''منزل'' کی طرف دو گام چلنا تو درکنار یہ ''منزل'' جب خود چل کر میرے سامنے آتی ہے تو اس عفریت کے خوفناک پنجے دیکھ کر مجھ پر لرزہ و ساطاری ہو جاتا ہے اور میں چیخ مار کر بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ میرا ایک شعر ہے چلیں چھوڑیں شعر کو ورنہ آپ میری یہ وضاحت یہ کہہ کر مسترد کر دیں گے کہ یہ وضاحت تو محض اپنا شعر سنانے کے لئے تھی۔

قارئین کرام کی تسلی اس وضاحت سے بھی نہ ہوئی تو میری زنبیل میں اسی طرح کا ایک اور ''دانہ'' موجود ہے' بات یہ ہے کہ کالم لکھتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں' ایک عرصے تک یہ کالم لکھنے کے بعد یہی سوچا کہ صبح جب کالم شائع ہوگا تو ہر طرف تھرتھلی مچ جائے

گی۔ خیر کی فتح ہوگی اور شر کے علمبردار منہ چھپاتے پھریں گے مگر یہ عقدہ بہت دیر بعد کھلا کہ قلم کے مقابلے میں پستول کی ہمیت زیادہ ہے۔ مجھے بتائیں کہ لکھنے سے آج تک ملک وقوم کا کونسا مسئلہ ہے جو حل ہوا ہے؟ ہمارے ایک سابق حکمران تھے جو ہمارے مروجہ اخلاقی معیاروں کے لحاظ سے گزشتہ سب حکمرانوں سے زیادہ نیک اور شریف تھے۔ وہ کالم نگاروں کو ان مسائل کی مسلسل نشاندہی پر کھل کر داد دیا کرتے تھے صرف انداز بیان کی داد دیتے تھے۔ سو ایک وقت آتا ہے کہ لکھنا لکھانا محض ذہنی عیاشی کے زمرے میں دکھائی دیتا ہے۔ گزشتہ دنوں مجھے بھی یہ عمل کچھ اسی "قماش" کا لگنے لگا تھا۔

میں نے اپنے قارئین کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اتنی وضاحتیں بیک وقت کر دی ہیں' وہ اگر چاہیں تو سب کی سب منظور کر لیں اور چاہیں تو ان میں سے کسی ایک کو صحیح سمجھ کر میری خطا میں معاف کر دیں اور اگر میری کسی وضاحت سے بھی مطمئن نہ ہوں بلکہ اتنی طویل غیر حاضری کو محض مری ہٹ دھرمی پر محمول کریں تو بھی ٹھیک ہے کہ اپنے پیاروں کے سامنے کون بول سکتا ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس کی پیروڈی انور مسعود نے یوں کی ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز اس نے کہا کہ کیا کہا؟
میں نے کہا کہ کچھ نہیں' اس نے کہا کہ ٹھیک ہے

میں نے بھی اس کالم میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کی ہے اگر بزم ناز سے "کیا کہا" کی آواز آئے تو سمجھ لیں کہ میں بھی دیکھ گیا ہوں' اس کے بعد اس شعر کو پیروڈی نہیں' میرے ضمن میں احوال واقعی سمجھا جائے۔ بڑی مہربانی ہوگی!

◆◆◆

اشتراکیت کے بعد سرمایہ کاری کا زوال!

سوویت یونین کے خاتمے کی خبر ایسی ہے کہ روز روشن کی طرح واضح ہونے کے باوجود اس پر یقین نہیں آتا۔ ایک ملک جو سپر پاور تھا' جس کی دہشت چار دانگ عالم میں تھی' اس طرح اچانک زمیں بوس ہو جائے جیسے کچی دیوار ہوتی ہے' ناقابل یقین ہے۔ دو چار بارشیں تو ہمارے دیہات کے مٹی کے مکان بھی سہ جاتے ہیں' یہ فولادی قلعہ تو ان مٹی کے مکانوں سے بھی کمزور نکلا۔ افغان جنگ کوئی ایسا بڑا فیکٹر نہیں تھا جو سوویت یونین کو لے بیٹھا۔ آخر امریکہ بھی تو جنگیں کرتا رہا ہے۔ ایک کمزوری اس نظام کے اندر تھی' ان دونوں چیزوں نے مل کر سوویت یونین کا جنازہ نکال دیا۔ اس تابوت میں آخری کیل حضرت گورباچوف تھے۔ چنانچہ گورباچوف کے پاکستانی نمائندوں کا اب تازہ "ورژن" یہ ہے کہ گورباچوف سی آئی اے کا ایجنٹ تھا۔ یہ گواہی گھر کی گواہی ہے' لہٰذا ماننا ہی پڑے گی۔

سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ ہوا تو ہمارے ہاں شدت غم سے کئی لوگوں کا ہارٹ فیل ہو گیا' روتے روتے لوگوں کی ہچکی بندھ گئی' مجھے یاد ہے اس روز والد محترم نماز کے دوران دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے تو انہوں نے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا' جس پر دوسرے نمازی بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکے۔ سوویت یونین سے محبت رکھنے والوں کو شاید ہمارے غم کا اندازہ اب ہوا ہو' ورنہ ہماری آہوں کے اثر کا بھی کہ پہلے پاکستان کو توڑنے والی شخصیات عبرتناک انجام سے دوچار ہوئیں' اب ان ملکوں کو بھی مکافات عمل کا سامنا ہے جنہوں نے سلطنت خداداد پاکستان دولخت کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ میرا ایمان ہے کہ سوویت یونین کے بعد انشاء اللہ بھارت کی باری ہے۔

اگرچہ پاکستان کو سوویت یونین کی طرف سے کبھی ٹھنڈی ہوا نہیں آئی' تاہم میرا خیال ہے کہ عالمی نقشے پر دو سپر پاورز کی موجودگی سے طاقت کا توازن ایک حد تک برقرار تھا جو اب بری طرح بگڑ گیا ہے اور امریکہ اب ساری دنیا میں "شوکریں" مارتا پھر رہا ہے۔ ایک دوست کا کہنا ہے کہ یہ صورتحال زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سوویت یونین ایسی طاقت کا زوال بذات خود اس امر کا ثبوت ہے کہ امریکہ بھی ایک دن اچانک دھڑام سے نیچے گر سکتا ہے۔ یہ بات اس وقت ناممکن نظر آتی تھی جس طرح سوویت یونین کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا ناممکن نظر آتا تھا۔ اس ضمن میں ایک بہت عمدہ بات پاکستان کے سیکرٹری جنرل خارجہ جناب اکرم ذکی نے گزشتہ پیر کو اسلام آباد میں ایک تقریب میں کہی۔ میں نے مہمان خصوصی جناب اکرم ذکی سے پہلے اپنی "صدارتی تقریر" میں

کہا کہ سوشلزم کے بعد سرمایہ داری نظام کی باری ہے۔ جناب اکرم ذکی نے میرے اس بیان کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ بظاہر تو یہ بات بالکل ناممکن نظر آتی ہے کیونکہ یہ جو نظام "سوشلزم" سرمایہ داری نظام کو ختم کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا' وہ خود ختم ہو گیا ہے لیکن یہ "ناممکن کام" ہو کر رہے گا۔ اس کے لیے اکرم ذکی صاحب نے دلیل یہ دی کہ سوشلزم اور سرمایہ داری نظام ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں تمام وسائل ایک محدود طبقے کے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور وہ ان وسائل کے بل بوتے پر ساری ویلیوز کو بدل کر رکھ دیتا ہے جب کہ سوشلزم میں بھی تمام وسائل ایک طبقے (حکمران پارٹی) کے پاس ہوتے ہیں اور مزید خطرناک بات یہ ہوتی ہے کہ اقتدار بھی اسی طبقے کے پاس ہوتا ہے چنانچہ یہ نظام اپنے منطقی انجام تک پہنچا۔ اب سرمایہ داری نظام کی باری ہے' جو اس نظام کا کاؤنٹر پارٹ ہے۔ اکرم ذکی کی یہ دلیل بہت وزنی ہے تاہم میرے نزدیک سوشلزم میں مساوات اور شرف انسانیت کا تصور (عملی طور پر خواہ ایسا نہ ہو سکا) اسلام کے بہت قریب ہے بلکہ اقبال کے مطابق بالشویک + خدا = اسلام ہے' جب کہ سرمایہ داری نظام دیکھنے میں انسان کا سب سے بڑا خیر خواہ لیکن انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس نظام کے "ہول سیل ڈیلر" امریکہ کی بدمعاشیاں بھی اب دنیا کے تمام انسانوں پر واضح ہو چکی ہے' لہٰذا اس نظام اور اس کے ہول سیل ڈیلر کو بھی اب برباد ہونا چاہیے۔

یوں تو عالم اسلام کے اتحاد کی ضرورت پہلے دن سے موجود رہی ہے تاہم حالیہ صورت حال میں یہ ایسی ضرورت ہے جسے نظر انداز کیا گیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ وسطی ایشیاء کی مسلم ریاستیں ایک طویل عرصے کے بعد آزاد ہوئی ہیں' اگر یہ بھی امریکی اثر و نفوذ میں چلی گئیں تو صرف مسلم امہ ہی نہیں' تمام اقوام عالم کی اس سے زیادہ بدقسمتی ممکن نہیں ہوگی۔ ہونا یہ چاہیے کہ سوویت یونین اور اشتراکیت کا خاتمہ امریکہ اور سرمایہ داری نظام کے زوال کا باعث بنے۔ تاریخ میں بہت ساری فتوحات ایسی ہیں جو عبرتناک شکست کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اور یوں اشتراکیت کی شکست بھی سرمایہ داری نظام کے زوال کا باعث بن سکتی ہے بشرطیکہ اقوام عالم اس نظام اور اس نظام کے "ترجمان" امریکہ کے راستے کی دیوار بن جائیں جو دنیا بھر کے انسانوں کا مشترکہ دشمن ہے۔ عالم اسلام اس ضمن میں بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے' خصوصاً پاکستان' افغانستان' ایران اور ترکی کی کنفیڈریشن جس کی سرحدیں تاشقند تک وسیع ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی ثابت ہو سکتی ہے۔ بظاہر یہ ایک دیوانے کا خواب ہے' مگر "دیوانوں" کے خواب سچے بھی تو نکل آیا کرتے ہیں۔

اقبال' اشفاق احمد اور ملا

ان دنوں اشفاق احمد دو دانشوروں کی بمباری کی زد میں ہیں' ان میں سے ایک مظفر علی سید اور دوسرے اپنے انتظار حسین ہیں۔ اشفاق احمد کو پیپلز پارٹی کے دور میں اردو سائنس بورڈ کی "ڈائریکٹری" سے بیک بینی دو گوش نکال باہر کیا گیا اور ان کی جگہ کشور ناہید کو بٹھا دیا گیا' جب حکومت بدلی تو اشفاق احمد دوبارہ نیمے میں تھے اور کشور ناہید باہر تھیں مگر اس ساری صورت حال سے فائدہ اگر کسی کو پہنچا ہے تو وہ پیر و مرشد اقبال ہیں اور وہ اس طرح کہ اشفاق احمد نے گزشتہ دنوں ایک اخباری انٹرویو میں اقبال کے بارے میں کچھ متنازعہ باتیں کہیں جس پر اقبال کے سلسلے میں پہلی بار مظفر علی سید اور انتظار حسین کے خون نے جوش مارا اور انہوں نے راشن لے کر اشفاق پر چڑھائی کر دی ورنہ کشور ناہید کی دوستیاں اقبال کے کام آئیں ورنہ میرے ان دوستوں کو تو میر کی غم پسندی ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ اقبال کی رجعیت کی طرف دھیان دے سکتے ویسے تو اقبال کے حوالے سے جو باتیں اشفاق احمد نے کہیں ہیں یہ ان کا تازہ نہیں خاصا پرانا موقف ہے اور میں ان کے اس موقف سے کبھی متفق نہیں ہو سکا۔ اشفاق احمد کا کہنا ہے کہ "اصلی تے وڈا" اقبال وہی ہے جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا ہے اور جذب مستی کے عالم میں الہامی شعر کہتا ہے۔ انہیں اس اقبال سے اتفاق نہیں ہے جو دن کے وقت مسائل پر سوچ بچار کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں خطبات تحریر کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہیں "سوز و ساز رومی" تو اچھا لگتا ہے لیکن "پیچ و تاب رازی" پر وہ پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ حالانکہ اقبال کا خمیر جذبے اور فکر سے اٹھا ہے۔ وہ "عشق" کے زیر دست پرچار کرتے ہیں لیکن "خرد" کو بھی رہنما مانتے ہیں خواہ یہ حیلے بہانے ہی سے منزل تک کیوں نہ پہنچائے۔

ہر دو بمنزلے رواں ہر دو امیر کارواں
عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

ویسے معاملہ گر یہیں تک رہتا تو بھی ٹھیک تھا لیکن اشفاق احمد نے آگے چل کر یہ بھی کہہ دیا کہ اسلامی قوانین کی تشریح کا حق جاوید اقبال کو نہیں بلکہ صرف "ملا" کو حاصل ہے جس نے اس میں اسپیشلائزیشن کیا ہے حالانکہ جس اقبال نے "ملا" کو رگید ہے وہ سوز و ساز رومی والا اقبال ہے جس کی بات اشفاق احمد کو اپیل کرتی ہے۔ بہر حال اس ضمن میں دلیل اشفاق صاحب کی یہ ہے کہ ایک شخص جس نے روم میں سب سے بڑی ڈگری حاصل کی ہو وہ بہت پڑھا لکھا بھی ہو اور روشن خیال بھی ہو لیکن اس کی ان تمام خوبیوں کے باوجود

اسے یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی مریض کے گردے کا آپریشن بھی کر ڈالے؟ بات اشفاق احمد کی بہت مزے کی ہے لیکن پہلے وہ یہ تو ثابت کریں کہ ۔ انسان اور خدا کے درمیان معاملات طے کرانے کے لئے کسی "مڈل مین" کی ضرورت نہیں پڑتی۔ حتیٰ کہ نکاح اور نماز جنازہ تک کے لئے کسی اسپیشلائزیشن کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ایک نکاح تو فیض صاحب نے بھی پڑھا دیا تھا اور گلاسکو کی جامع مسجد میں ایک نماز ہم نے احمد ندیم قاسمی کی امامت میں پڑھی۔ اگر ہم تاریخ کی طرف نہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور خلفائے راشدین کے زمانے میں "ملا" نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ جو حاکم ہوتا تھا وہ سپہ سالار بھی ہوتا تھا، جج بھی ہوتا تھا، امام بھی ہوتا تھا۔ یہ سارے خانے تو ہم لوگوں نے زوال کے زمانے میں بنائے ہیں۔

اگر اشفاق احمد اس کے جواب میں کہیں کہ اگر خانے بن ہی چکے ہیں تو پھر "ملا" کا کام "ملا" کے سپرد کر دیا جائے تو اس کے لئے پہلے "ملا" کو اپنی کریڈبلٹی ثابت کرنا ہوگی۔ گزشتہ چودہ سو برس میں اور خصوصاً گزشتہ نصف صدی کے دوران اسلام کو انتہائی پیچیدہ مسائل کا سامنا ہے جس کے لئے پوری سنجیدگی کے ساتھ زبردست اجتہاد کی ضرورت تھی اور یہ اجتہاد اسی صورت میں ممکن تھا جب ملا سائنسی دور سے پیدا شدہ پیچیدگیوں سے پوری طرح واقف ہوتا لیکن ایسا نہ ہونے کی صورت میں ہم کسی ایک مسئلے میں بھی اجتہاد سے کام نہیں لے سکے بلکہ انتہائی متشددرویہ اپنانے کے نتیجے میں ذہنوں میں تشکیک کا زہر پھیلتا جارہا ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات میں اجتہاد کی اہمیت پر جس شدومد سے اظہار کیا ہے افسوس کہ مسجد کے منبر سے کلام اقبال ترنم سے پڑھے جانے کے باوجود اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ اقبال قانون سازی کا حق پارلیمنٹ کو دیتے ہیں مگر مشائخ کی اکثریت انہیں "ولی اللہ" ماننے کے باوجود یہ حق اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔ اگر "خطبات" والے اقبال کی باتیں اتنی غیر اہم ہیں تو انتظار حسین نے بڑا اچھا سوال اٹھایا ہے کہ پاکستان کا تصور خطبہ الہ آباد میں دیا تھا۔ تو پھر اسے بھی کیوں نہ رد کیا جائے؟

اشفاق احمد نے بہت عرصہ قبل "نوائے وقت" کے لئے مجھے انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ "ملا" ان کا ہیرو ہے۔ "ملا" میرا بھی ہیرو ہے لیکن وہ ملا جو اسلام کی خودساختہ تعبیروں سے عوام کا گلا گھونٹنے کے درپے نہیں بلکہ اس اسلام کا داعی ہے جو دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ بدقسمتی سے ہمارا ملا اپنا سارا زور اس "اسلام" کو نافذ کرنے میں مصروف ہے جس کا دس کروڑ عوام کے دکھوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ابھی تک دنیا میں جتنے اتحاد وجود میں آئے ہیں وہ سب کے سب "حقوق اللہ" کے ضمن میں ہیں اور "حقوق اللہ" کی تشریح بھی "ملا" کی اپنی ہے جب کہ "حقوق العباد" کے سلسلے میں اس نے کبھی پیش رفت کی ہو اور اس کے لئے تحریک چلائی ہو تو براہ کرم مجھے مطلع کیا جائے۔ قائداعظم اور اقبال کا خواب پاکستان کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں ایک فلاحی مملکت بنانا تھا۔

اشفاق احمد اور ہم سب کو اس پاکستان کے "قیام" کی کوشش کرنا چاہیے۔ ملا کو ایسے اسلام یا پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں جس میں لوگوں کے مسئلے حل ہوتے ہوں۔ مگر اشفاق احمد ایسے صاحب نظر دانشور بھی اس سے غافل ہو گئے اور انہوں نے اپنی لگام ملا کے ہاتھ میں دے دی تو جس اسلام کی خاطر لاکھوں عصمتیں ہم نے قربان کی تھیں ان کا خون بہا کون ادا کرے گا؟

درآخر میں اشفاق احمد سے ایک ذاتی بات یہ ہے کہ بہت پیارے خان صاحب! اگر آپ نے "ملا" کو قانون سازی کا اختیار تفویض کر دیا تو آپ کے کچھ افسانے اور سفرنامے ضبط ہو جائیں گے۔ خصوصاً "سفر در سفر" میں باجی اور حقی والا قصہ۔ قدرت اللہ شہاب بھی اپنے تصوف کے باوجود اس کی زد میں آئیں گے اور ممتاز مفتی کی تو بیشتر تحریریں ضبط ہو سکتی ہیں بلکہ قرین امکان تو یہ ہے کہ خود مفتی کو ضبط کر لیا جائے۔ لہٰذا آپ کو میرزا غالب اور اقبال کی روحوں کا واسطہ آپ کو اپنی جمہوریت پسندی کا واسطہ اس ملک کے دس کروڑ عوام کے علاوہ شاعری فلم ڈرامہ مصوری اور موسیقی پر رحم فرمائیں۔ بے زبان عوام اور یہ بے زبان علوم و فنون آپ کو دعا دیں گے!

◆◆◆

طوطا کیا کہتا ہے؟

طوطے سے فال نکلوانے کا دھندا بڑی مزے کا ہے۔ "جوتشی" پنجرے کا دروازہ کھولتا ہے طوطا پھدکتا ہوا کارڈوں کے پاس جاتا ہے اور ایک کارڈ چونچ سے پکڑ کر واپس جوتشی کے پاس آ جاتا ہے۔ بس اسی کارڈ پر میری اور آپ کی قسمت کا حال لکھا ہوتا ہے اور ایک حد تک "جوتشی" اور طوطے کا بھی کہ گاہک سے جو دو چار روپے ملیں گے اس سے دونوں اپنا پیٹ بھریں گے تاہم ایک خبر کے فیچر نگار نے اس ضمن میں جدت یہ پیدا کی ہے کہ اپنی فال نکلوانے کی بجائے مشاہیر کی فال نکلوائی ہے اور یہ فال خاصی دلچسپ ہے اسلئے وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف کے متعلق طوطے کا کہنا ہے "تمہارے پچھلے چند مہینے بھاری گزرے ہیں' جو کچھ بھی ہوا تم جانتے ہو تمہارا ایک حاسد یک مخالف ہے جس کا رنگ گندمی ہے۔ اپنا بھید کسی کو نہ دینا' غصے سے پرہیز کرو' عنقریب کسی کام میں کامیابی ہوگی۔"

میاں صاحب کے پچھلے چند مہینے واقعی بھاری گزرے ہیں مگر مجھے پریشانی اس بات کی ہے کہ یہ خبر طوطوں تک بھی پہنچ گئی ہے۔ ویسے میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ میاں صاحب کی پریشانیوں میں ہاتھ کچھ "طوطوں" ہی کا تھا جو وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کا مالک انہیں رٹاتا رہتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ ان کا حاسد اور مخالف ہے جس کا رنگ گندمی ہے بہت گمراہ کن قسم کی نشانی ہے کیونکہ گندمی رنگ والے تو میاں صاحب کے ارد گرد بہت ہیں ور دوستوں کے روپ میں ہے۔ کراچی کے ایک گندمی رنگ والے کی سیاہ بلیک میلنگ سے وہ تو "تھونک" بھی آئے ہوئے ہیں بلکہ ایک کالے رنگ والا بھی ان کے لئے خاصی مشکلات پیدا کر رہا ہے' باقی رہا طوطے کا یہ مشورہ کہ میاں صاحب غصے سے پرہیز کریں تو زیادہ غصہ انہیں ایک سفید بلکہ سرخ و سپید رنگت والے بزرگ پر "آتا ہوگا لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ طوطے کی بات مانیں اور غصے سے پرہیز کریں کہ خاندان کے بزرگ "ٹوکا ٹاکی" کرتے ہی رہتے ہیں جو نوجوانوں کی بری لگتی ہیں تاہم میاں صاحب کے اصل حریف وہی ہیں جن سے وہ پہلے دن سے برسرپیکار ہیں' طوطے نے میاں صاحب کو یک خوشخبری بھی سنائی ہے۔ وہ یہ کہ انہیں عنقریب کسی کام میں کامیابی ہوگی! اب اللہ جانے اس کا اشارہ کس کام کی طرف ہے لیکن اگر یہ طوطا پیر پگاڑ کے ہاتھ لگ گیا تو اس بات پر وہ اس کی "گچی" ضرور مروڑ دیں گے۔

صوفی علی احمد نامی "جوتشی" کے اس طوطے نے صدر پاکستان غلام اسحاق خان کی فال بھی نکالی ہے جو یہ ہے "تم کوشش بہت کرتے ہو مگر کامیابی نہیں ہوتی کیونکہ تمہارا ستارہ گردش میں ہے' مخالف تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش میں ہیں۔ تم میٹھی زبان اور نرمی استعمال کرو تمہارا کام ایک بندے کی مدد اور کوشش سے ہوگا۔"

اب اللہ جانتے ہیں یا خود غلام اسحاق بہتر جانتے ہیں کہ وہ کس کام کے لئے کوشش کرتے ہیں اور کامیابی نہیں ہوتی۔ میرا دھیان چونکہ خوامخواہ ادھر ادھر بھٹکنے لگا ہے لہٰذا میں اس پر تبصرہ آرائی نہیں کروں گا البتہ جس ایک کام کی طرف میرا دھیان خصوصی طور پر گیا ہے وہ کام یک بندے کی مدد اور کوشش سے بھی نہیں ہوگا کہ وہ بندہ بھی اس مضمرات سے واقف ہے اور پوری قوم بھی۔ بلکہ خود غلام اسحاق خان ایسے زیرک بزرگ کے ذہن میں اس قسم کی کوئی بات آ ہی نہیں سکتی!"

طوطے نے محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی فال بھی نکالی ہے۔ جس کے مطابق "رسول برحق سے کامیابی ہوگی۔ لوگوں کی مکر و فریب سے ہوشیار اور خبردار رہو' سفر تیرے لئے بڑا مفید ثابت ہوگا' مقصد میں کامیابی ہوگی" محترمہ کو کامیابی تو تب ہوگی جب "دھاندلی" نہیں ہوگی ور "دھاندلی" تب نہیں ہوگی جب کامیابی ہوگی چنانچہ صوفی علی احمد کا یہ طوطا مجھے بہت سیاسی لگتا ہے کہ اس نے کامیابی کا لفظ بہت "ویک" معنوں استعمال کیا ہے ورنہ ہر ناکامی پر کسی جیالے کے ہاتھوں اس بیچارے طوطے کی شامت آ جاتی۔

طوطے کی فال یہ بھی بتاتی ہے کہ محترمہ کے لئے سفر بڑا مفید ثابت ہوگا اور مقصد میں کامیابی ہوگی۔ میرے خیال میں اس طوطے کا اشارہ سفر امریکہ کی طرف ہے مگر اس نادان طوطے کو یہ علم نہیں کہ امریکہ میں آج کل برف پڑ رہی ہے اور وہاں کا درجہ حرارت ہیلو زیرو ہے چنانچہ محترمہ کو ان دنوں وہاں سے فلو کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا'

طوطے نے ن سیاسی رہنماؤں کے علاوہ اداکارہ ریما اور عمران خان کی فالیں بھی نکالی ہیں لیکن ان کا ذکر تو میں تب کروں گا اگر پہلی فالوں پر میں نے طوطے کو داد دی ہو۔ ایک مشاعرے میں ایک شاعر نے اپنی غزل جیب میں ڈالی اور یہ کہہ کر اسٹیج سے اتر آیا کہ حضرات اجازت چاہتا ہوں غزل کے باقی شعر بھی ایسے ہی ہیں۔ صوفی علی احمد کے طوطے نے باقی جن لوگوں کی فال نکالی ہے' وہ بھی ایسی ہی ہیں جیسی اوپر بیان ہوئی ہیں۔ لہٰذا یہ تذکرہ ختم' البتہ کسی دن اس طوطے کو اپنی فال بھی نکالنی چاہیے!

◆◆◆

پاکستانی بال ٹھاکرے!

بھارت اس وقت جن مسائل کی زد میں ہے اس کی وجوہات کسی کم فہم "محب وطن بھارتی" کو معلوم نہیں ہو سکتی ان وجوہات کا صحیح ادراک ہم پاکستانیوں کو ہو سکتا ہے جو ایک فاصلے سے اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ بھارت میں رونما ہونے والے واقعات کو دیکھتے ہیں اور پھر ان سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ مثلاً کسی بھی ملک کی قومی سلامتی قوم کے تمام طبقوں میں اتحاد اور یکجہتی ہی سے ممکن ہے اس اتحاد و یکجہتی میں جتنی دراڑیں آتی جائیں گی ملک کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جائے گا اور پھر اسے تباہ کرنے کے لئے کسی بیرونی حملہ آور کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اندرا گاندھی نے جب گولڈن ٹیمپل پر حملہ کیا تو بھارت کے "محب وطن" ہندو عوام نے مبارک سلامت کے شور سے سارے ملک کو سر پر اٹھا لیا اور اندرا کا شمار اپنی مقدس دیویوں میں کرنے لگے۔ اندرا گاندھی اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے اکثریتی عوام یعنی ہندوؤں کی داد و واہ ہی چاہتی تھیں وہ انہیں مل گئی لیکن بھارت کے ہندو اور سکھ جو صدیوں سے سگے بھائیوں کی طرح ایک ساتھ رہتے تھے کم از کم صدیوں تک کے لئے ایک دوسرے سے دور ہو گئے جس کے نتیجے میں بھارت اس وقت اندرونی طور پر بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اندرا گاندھی کو اپنے "عورت" ہونے کا کمپلیکس تھا مشرقی پاکستان اور گولڈن ٹیمپل پر حملہ اپنی "مردانگی" کا ثبوت دینے کے لئے تھا لیکن یہ دونوں حملے بھارت کو کمزور بنانے کا باعث بنے۔ بھارت کے ہندو آج بھی اندرا کو حب الوطنی کی علامت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خاتون عملی طور پر بھارت کی سب سے بڑی دشمن ثابت ہوئی۔

ان دنوں بھارت کے "محب وطن" ہندوؤں کی سب سے مقبول شخصیت بال ٹھاکرے ہے جو بھارت میں ہندو ازم کا احیاء چاہتا ہے۔ بال ٹھاکرے ایک مذہبی جنونی ہے جو مسلمانوں اور سکھوں کو صرف ایک صورت میں زندہ رہنے کی اجازت دیتا ہے اگر یہ دونوں اقلیتیں ہندو کی غلام بن کر رہنا قبول کر لیں بصورت دیگر یہ ان کا نام و نشان تک مٹا دینا چاہتا ہے بھارتی ہندو ان دنوں اس جنونی شخص کے دیوانے ہو رہے ہیں اور خود ہندوؤں میں سے اس کے خلاف جو آوازیں اٹھتی ہیں ان کی حیثیت آٹے میں نمک یا نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہیں۔ "محب وطن" اور "سچے ہندو" یعنی بال ٹھاکرے کی وجہ سے بھارت کے غیر ہندو یا روادار کے قائل لوگ سخت گھٹن کا شکار ہو رہے ہیں لیکن یہ عوام عجیب چیز ہیں جو پورے خلوص کے ساتھ بال ٹھاکرے قسم کی چیزوں کو اپنے مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔

بھارت میں گزشتہ 45 برس صرف دو ایسی شخصیتیں ابھر کر سامنے آئیں جنہیں میں صحیح معنوں میں بھارت کا دوست تصور کرتا ہوں ایک مرارجی ڈیسائی جنہوں نے پاکستان کے خلاف جنونی سرگرمیاں ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تاکہ جنگی تیاریوں کے نام پر بھارتی عوام کو بھوکا مارنے کا سلسلہ ختم کیا جا سکے اور دوسرے وی پی سنگھ جنہوں نے نچلی ذات کے ہندوؤں اور بھارت کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں میں احساس تحفظ پیدا کرنے کی کوشش کی اور یوں قومی یکجہتی کو مضبوط کرنے کے لئے ٹھوس کردار ادا کیا لیکن بھارت کا اکثریتی طبقہ یعنی ''محب وطن ہندو'' ان دونوں لیڈروں کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ قوم بہت بدقسمت ہے جو کھوکھلے اور جذباتی نعروں کو حب الوطنی کے مترادف سمجھتی ہے!

ابھی تک جو میں نے کچھ کہا ہے وہ دراصل تمہید ہے اس بات کی جو مجھے ابھی کہنا ہے اور کہنا مجھے یہ ہے کہ جس طرح بھارت میں قومی سلامتی کے خلاف اٹھنے والے طوفانوں کا اندازہ ہم پاکستانی غیر جذباتی ہونے کی وجہ سے زیادہ بہتر انداز سے لگا سکتے ہیں اسی طرح پاکستان اس وقت جس بھنور میں پھنسا ہوا ہے اس کی وجوہ بھی ہم اگر غیر جذباتی انداز سے ہی تلاش کرنے کی کوشش کریں گے تو تبھی دریافت کر سکتے ہیں ورنہ اگر ہم اس جذباتی فضا کا حصہ بن جائیں گے جو لسانی اور مذہبی علیحدگی پسندوں نے ملک میں قائم کر رکھی ہے تو پھر ہمیں ''حب الوطنی'' کا کوئی دعویٰ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کھوکھلی حب الوطنی کے حامل ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھوں عمل میں آئی جو آج بھی ہمارے لاکھوں جذباتی عوام کے لیڈر ہیں۔ حالانکہ اس شخص کو نہ ملک عزیز تھا نہ عوام اسے صرف اپنے اقتدار سے دلچسپی تھی چنانچہ اقتدار کے لئے وہ 1972ء میں ''کامریڈ ذوالفقار علی بھٹو'' اور 1977ء میں ''مولوی ذوالفقار علی بھٹو'' بن گیا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے عوامل ایوب خان کے مارشل لاء میں سامنے آئے اور لسانی تحریکوں کی پرورش مرحوم ضیاء الحق کے زمانے میں ہوئی اور یہ دونوں عوام کے محبوب لیڈر ہیں۔ اسی طرح سندھ میں ان دنوں جو لسانی گروہ سرگرم عمل ہیں وہ سندھی عوام کے بدترین دشمن ہیں کہ کراچی کی ساری معیشت تباہ ہو کر رہ گئی ہے اور یوں دو وقت کی روٹی سے بے روزگار سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں مگر عوام انہیں اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں۔ مذہبی شعبے کا بھی یہی حال ہے چنانچہ ہمارے ہاں بیسیوں بال ٹھاکرے موجود ہیں جو خود مسلمانوں ہی میں نفاق پیدا کرنے کی کوششوں میں مشغول ہیں مگر یہ بال ٹھاکرے آنکھ کے بال کی طرح ہمیں نظر نہیں آتے۔

بھارت جانتا ہے کہ پاکستان کی سالمیت کو پارہ پارہ کرنے والی چیزیں کون سی ہیں چنانچہ مختلف ایجنسیوں کی رپورٹیں اس بات کی شاہد ہیں کہ سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں بھارتی ایجنٹ داخل کر دیئے گئے ہیں۔ جو ملک میں سیاسی اور مذہبی تنگ نظری کی فضا پیدا کرنے کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ کسی بھی قوم کے لئے سب سے بڑا زہر تنگ نظری ہے خواہ یہ سیاسی نوعیت کا ہو یا مذہبی نوعیت کا کسی بھی

قوم کو ہلاک کرنے کے لئے اس سے زیادہ سریع الاثر زہر ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔ وہ قوم کتنی بدقسمت ہے جو یہ زہر اپنی خوشی سے کھانا شروع کرے اور نہ کھانے والوں کو بدقسمت سمجھے!

◆◆◆

برطانوی سفارت خانے میں کوئی واقفیت ہے؟

لندن میں دیکھنے کی چیزیں یوں تو بہت سی ہیں تاہم ان میں سے پاکستانی منگیتروں کا مجمع بازار خصوصاً قابل دید ہے۔ قارئین کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ وہاں مجمعے کے مجمعے ایک بڑے میدان میں پاکستان سے منگوائے گئے منگیتروں کو کھڑا کر دیا جاتا ہے، اور پھر ان کی بولی لگتی ہے۔ جی نہیں والا قبلہ ایسی کوئی بات نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ آج سے تیس پینتیس برس قبل جو پاکستانی تلاش روزگار میں انگلستان گئے تھے ان کا ارادہ وہاں مستقل قیام کا نہیں تھا بلکہ بے چارے نے سوچا تو یہ تھا کہ چند برس محنت مزدوری کریں گے اور جب بہن بھائیوں کے لئے شادی کی رقم جمع ہو جائے گی تو واپس وطن آ جائیں گے۔ (آج بھی یورپ اور امریکہ جانے والے یہی سوچ کر جاتے ہیں) لیکن ہوا یوں کہ انہیں وہاں کی دنیا ہی مختلف نظر آئی نہ رشوت لینے کا چکر نہ لاقانونیت۔ بے چارے پریشان ہو گئے کہ قائداعظم نے جس پاکستان کا خواب دیکھا تھا کہیں وہ اس پاکستان میں تو نہیں آ گئے اور اگر یہ سچ ہے تو جس پاکستان سے وہ آئے ہیں وہ کون سا پاکستان تھا جہاں اسلام کے نام پر صرف تقریریں ہی تقریریں نافذ ہیں؟ تاہم یہ ان کا ابتدائی تاثر تھا جب انہوں نے اس ملک کو اپنا مستقل وطن بنانے کا ارادہ کر لیا تو ایک ایک کر کے اپنے عزیز و اقرباء کو بھی وہاں بلانا شروع کر دیا جب یہ پاکستانی بال بچے دار ہوئے اور ان کے بچے بچیوں کی تربیت اس معاشرے نے اپنے ڈھب پر کی تو جس خواب کو انہوں نے سہانا سمجھا تھا تو وہ انہیں بھیانک ڈراؤنا محسوس ہوا۔ لڑکے "چٹی چمڑی" کے دیوانے ہو گئے اور انہوں نے میموں کو بغلوں میں لے کر گھومنا شروع کر دیا اور گھر کی "مرغیوں" کو ثابت مسر کی دال سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ لیکن اس دنیا میں نظر انداز ہونا تو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ جو پاکستان لڑکیاں مغربی معاشرے میں انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بڑی پلی تھیں ان کی ایک تعداد نے اپنے پاکستانی نوجوانوں کی بے رخی دیکھ کر ان انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں کو اپنا ہمسفر بنایا جس کے نتیجے میں خون ریز لڑائیاں ہوئیں، بیٹیوں کو رسیوں سے باندھ کر گھروں میں بند کر دیا گیا، انہوں نے موقع ملتے ہی پولیس کو اطلاع کر دی اور پولیس ان لڑکیوں کے والدین کو گرفتار کر کے لے گئی۔ اس نوع کے صدموں سے والدین کو ہارٹ اٹیک ہوئے مگر یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے کہ فارسی کا ایک شعر ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تم نے مجھے باندھ کر دریا میں پھینک دیا ہے اور اوپر سے یہ بھی کہے جا رہے ہو کہ دیکھنا دامن گیلا نہ ہونے پائے' سو جب کسی باپ کی بیٹی کا دامن گیلا ہوتا ہے' اسے انگلستان کی تمام آسائشیں اور سہولتیں ایک ڈراؤنے خواب کی طرح لگنے لگتی ہیں۔ لیکن آسائشیں ہیروئن کے نشے کی طرح ہوتی ہیں' انہیں چھوڑنا کوئی آسان کام نہیں' چنانچہ جو پاکستانی اس نشے کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر واپس پاکستان آ جاتے ہیں اور یہاں بدترین حالات کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن جو ایسا نہیں کر پاتے' وہ دن کے سکون کے لئے پنج وقتہ نمازیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں' نئی مسجدوں کی تعمیر میں مشغول ہو جاتے ہیں' پاکستان سے علماء اور پیر فقیر منگوانا شروع کر دیتے ہیں جن میں سے کچھ "ہر چہ بادا باد" کہتے ہوئے خود بھی یہیں آباد ہو جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بچیوں کے دینی اور ثقافتی مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے یہ والدین پاکستان سے منگیتر منگواتے ہیں جو بڑے "چاؤ چاؤ" سے اپنے وطن کو خیر باد کہتے ہیں کہ آہا جی لندن میں جا کر رہیں گے!

اور کام کے شروع میں جن منگیتروں کا میں نے ذکر کیا تھا' وہ یہی مظلوم لوگ تھے' جن کی شادی کسی مظلوم لڑکی سے کر دی جاتی ہے اور پھر دونوں عمر بھر

آ عندلیب مل کر کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار' میں چلاؤں ہائے دل

کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ دراصل ہوتا یوں ہے کہ ایک دوسرے سے یکسر متضاد معاشروں میں پرورش پانے والے یہ کردار جب ایک دوسرے کے ساتھ شادی کے بندھن میں باندھ دیئے جاتے ہیں تو بیشتر صورتوں میں ان کی آپس میں نہیں بنتی' دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سمجھ نہیں پاتے' ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایڈجسٹ نہیں کر پاتے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب' نہ یہ آپس میں پہلے کبھی ملے ہیں اور نہ آئندہ کبھی مل سکیں گے۔ چنانچہ ان دونوں کی زندگیاں عذاب ہو جاتی ہیں اور یوں ان دونوں میں سے کوئی ظالم قرار دیئے جانے کا "مستحق" نہیں ہوتا کہ یہ بے چارے دونوں مظلوم ہوتے ہیں' البتہ ان "پاکستانی منگیتروں" کی بدقسمتی قدرے زیادہ ہے کہ وہاں پرورش پانے والے ان کے ہم عمر انہیں استہزائی نظروں سے دیکھتے ہیں' جیسے یہ قربانی کے بکرے ہوں جن کے "دو دانت" ہونے کی تصدیق کے بعد بکر منڈی سے لایا گیا ہو'

ڈیڑھ ماہ قبل گلاسکو کی جامع مسجد کی لائبریری میں ایک میٹنگ کے دوران جو اتفاق سے میری صدارت میں منعقد ہو رہی تھی' ایک مقرر نے تفصیل سے ان خدمات کا ذکر کیا جو انگلستان میں مقیم پاکستانیوں نے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں' کشمیر کی جنگ آزادی

اور افغانستان جنگ آزادی وغیرہ میں بھاری عطیوں کی صورت میں پاکستان ارسال کرنے کی صورت میں انجام دیں۔ ایک مقرر نے پاکستانیوں ان کی دینی خدمات کی بھی تفصیل بیان کی جو وہ انگلستان میں اسلام کی روشنی پھیلانے اور اپنے بچوں کو اچھا مسلمان بنانے کے لئے انجام دے رہے ہیں' جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکے ہیں تو میں نے آخر میں کہا کہ آپ لوگ یہاں بیٹھ کر اسلام اور پاکستان کے لئے جس مشنری جذبے سے کام کر رہے ہیں' اتنا تو ہمارے لوگ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی نہیں کرتے چنانچہ میں آپ کو اس کارنامے پر زبردست خراج تحسین پیش کرتا ہوں' تاہم آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ پسند کریں گے کہ پاکستانی مسلمانوں کی مزید تعداد یہاں آ کر آباد ہو تاکہ اسلام اور پاکستان کے استحکام کے لئے جو گراں قدر خدمات آپ انجام دے رہے ہیں' اس میں وہ آپ کے دست و بازو بن سکیں؟ اس پر حاضرین میں موجود گلاسکو کی ایک معروف شخصیت نے چیخ کر کہا ہرگز نہیں کیونکہ یہاں رہنے کی جو قیمت ہمیں ادا کرنا پڑ رہی ہے' ہم کبھی نہیں چاہیں گے کہ وہ قیمت کسی اور پاکستانی مسلمان کو بھی ادا کرنا پڑے۔

یہ چیخ آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے تو مجھے جھرجھری سے آ جاتی ہے اور میں کالم لکھنے میں بیٹھ جاتا ہوں کہ

''جس کو ہو جان و دل عزیز اس گلی میں جائے کیوں؟''

اور ہر بار میرا اس نوع کا کالم پڑھنے کے بعد دو چار نوجوان میرے پاس آتے ہیں اور لجاجت بھرے لہجے میں کہتے ہیں ''قاضی صاحب! برطانوی سفارت خانے میں کوئی واقفیت ہے..... ویزہ لینا ہے!''

◆◆◆

ناکردہ گناہ!

1991ء کے آغاز میں' میں نے سوچا تھا کہ سال کے اختتام تک' میں یہ کچھ کروں گا لیکن 1991ء مجھے خاصا جلد باز قسم کا سال محسوس ہوا کہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا' اگر یہ سال پلک جھپکتے میں نہ گزرتا تو میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیتا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی' مثلاً میرا ارادہ بلیک میلر قسم کا صحافی بننے کا تھا مگر حاشا وکلا' مستقلاً نہیں' بس دو چار کروڑ روپے بنانے کے بعد باقی عمر یادِ الٰہی میں بسر کر دیتا' ایک اور دو سیاست میں آنے کا بھی تھا' روزانہ رسی کا ایک سانپ بنا کر حکمرانوں کے سامنے چھوڑ دیتا اور وہ بے چارے روزانہ اس سے ڈر جاتے ہیں اور میں دیوار کے پیچھے چھپ کر ان کی سراسیمگی سے لطف اندوز ہوتا۔ 1991ء کے آغاز میں' میں نے کسی بینک سے قرضہ لیے اور اسے معاف کرانے کا پروگرام بھی بنایا تھا تاکہ میرا شمار بھی بڑے لوگوں میں ہو لیکن افسوس کہ یہ کام بھی نہ کر سکا اور یوں میں چھوٹے کا چھوٹا ہی رہا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروں گا یعنی کراچی موٹر وے کا ٹھیکہ لوں گا لیکن

''پر خیاں آیا کہ'' سوئی بے وطن ہو جائے گا''

چنانچہ یہ آئیڈیا بھی میں نے ڈراپ کر دیا۔ 1991ء میں' میں نے اس طرح کے کئی منصوبے بنائے تھے' مثلاً اپنی سوانح حیات لکھنے کا منصوبہ بھی اس میں شامل تھا اور اس کا مقصد محض 1965ء کی جنگ کے حوالے سے بہت بڑے بڑے انکشافات کرنا تھا۔ اگرچہ وہ میرا زمانہ طالب علمی تھی لیکن حب الوطنی کے جذبے کے تحت شہری دفاع کی تربیت حاصل کرنے کے بعد میں نے علاقے کا وارڈن مقرر ہوا تھا اور شہری دفاع کی وردی پہنے راتوں کو اپنے دوستوں کے ساتھ گلیوں بازاروں میں گھوما کرتا تھا۔ 1965ء کی جنگ کے بارے میں من مانے انکشافات کرنے کے لئے یہ کافی تھا' اس گزشتہ کے دوران ایک پروگرام میں نے یہ بھی ترتیب دیا تھا کہ اپنے بہت سے سیاستدانوں' علمائے کرام' دانشوروں اور صحافیوں کی طرح میں بھی اپنا ''تعلق'' کسی سفارت خانے سے قائم کروں گا تاکہ ڈالرز' درہم' تومن' دینار اور ریال وغیرہ کما سکوں کہ ہمارے ہاں یہ کام نہ صرف یہ کہ غداری کی ذیل میں نہیں آتا بلکہ الٹا انسان اونچے جوڑوں میں آ جاتا ہے لیکن افسوس کہ بزدلی کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ ایک اور کام جو میں 1991ء میں کرتے کرتے رہ گیا' وہ صدر غلام اسحاق خان اور وزیراعظم میاں نواز شریف میں پھوٹ ڈلوانے کا تھا مگر پھر یہ سوچ کر اس منصوبے میں

ہاتھ دھلائیں کہ طرفین اس ضمن میں بھی "خود انحصاری" کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔

یہ تو وہ کام ہیں جو میں 1991ء میں ملکی سطح پر کرنا چاہتا تھا اور میں نے بوجوہ ارادہ ترک کر دیا لیکن کچھ منصوبے بین الاقوامی نوعیت کے تھے مثلاً میرا ارادہ بش کو ہٹا کر اس کی جگہ خود لینے کا تھا تا کہ "امن عالم" کے قیام میں جو تھوڑی بہت کسر ہے وہ بھی پوری ہو جائے لیکن مجھے گورباچوف نے یہی کہہ کر منع کر دیا کہ اس بے وقوف کے منہ نہ لگو مجھے گورباچوف کے منہ سے "بے وقوف" کا لفظ اتنا اچھا لگا کہ میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ 1991ء میں میں نے ایک پروگرام یہ بنایا تھا کہ اس وقت جب کشمیر اور کشمیری پاکستان کے بازوؤں میں آنے کے لئے بیتاب ہیں کچھ قربان کرنے پر تلے ہوئے ہیں میں حکومت کو کشمیریوں کی تحریک کے حوالے سے سرد مہری کی پالیسی اپنانے کا مشورہ دوں جیسے کہ ماضی میں ہماری حکومتیں دو تین مواقع پر ایسا کر کے کشمیریوں کو پیچھے دھکیل چکی ہیں لیکن خود کو وہاں کیوں پڑوں؟ ایک ارادہ میرا یہ بھی تھا کہ افغان مسلمانوں کے دلوں میں پاکستانی عوام کے لئے محبت کا جو بے زوال جذبہ پیدا ہو چکا ہے اسے زائل کرنے کے لئے حکومت کو کچھ ایسا مشورہ دیا جائے اور اسے اپنا بوجھ کسی ایسے پلڑے میں ڈالنے کے لئے کہا جائے جس سے ساری "کچی کرائی" پر پانی پھر جائے مگر پھر سوچا کہ امریکہ اس مہم کو انجام دینے کے لئے پہلے ہی بہت زور لگا رہا ہے مجھے اپنا زور ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ اور اس طرح کے بہت سے دوسرے خیالات تھے جو 1991ء کے دوران میرے ذہن میں آتے رہتے ہیں لیکن میں مختلف وجوہ کی بناء پر انہیں عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کتنا گھٹیا آدمی ہوں جو ملک قوم اور انسانیت کے مفاد کو پس پشت ڈال کر صرف اپنا یا دشمنوں کا فائدہ سوچتا رہا۔ اگر آپ اس طرز عمل کو گھٹیا سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے اس صورتحال میں آپ اس طرح کے ان تمام لوگوں کے چہروں پر سے نقاب نوچ لیں جو آپ کے درمیان انتہائی معزز روپ میں موجود ہیں تا کہ 1991ء میں تو جو ہوا سو ہوا 1992ء میں یہ سب کچھ نہ ہو سکے!

غصہ کمہار پر!

''گزشتہ روز میں نے ملکہ ترنم کا گایا

''میرا حسن مصالحے دار وے ذرا چکھ لے سجنا!''

سنا تو مصالحے دار کھانوں کا رسیا ہونے کے باوجود اس دیگ کا دانہ چکھنے کو جی نہیں چاہا۔

کچھ یہی معاملہ اخباری بیانات کے ساتھ بھی ہے۔ میں جب کسی لیڈر کا بیان پڑھتا ہوں تو وہ لیڈر اپنی اصلی شکل میں میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیان کا مزا غارت ہو جاتا ہے۔ مختلف شعراء کا کلام پڑھتے ہوئے بھی میں اسی کیفیت سے گزرتا ہوں جس کے نتیجے میں ان کی شاعری پھیکی پھیکی سی لگنے لگتی ہے' کبھی کسی مزاحیہ کالم پر میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور کبھی سنجیدہ سا اداریہ پڑھتے ہوئے میری ہنسی نکل جاتی ہے۔ گزشتہ روز ایک دوست سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں اپنا یہ پرابلم بتایا اور کہا کہ اس کی وجہ سے بہت عذاب میں ہوں' اس نے میرا مسئلہ حل کرنے کی بجائے مجھے ایک صوفی کا قصہ سنایا کہ انہیں انسان اصل شکلوں میں نظر آنے لگتے تھے یعنی باتیں کرتے کرتے کسی انسان کی شکل لنگور کی سی ہو جاتی' کوئی کتا بن جاتا اور کوئی اچھا خاصا بظاہر معتبر انسان سور کی شکل میں سامنے آ جاتا چنانچہ اس صوفی نے انسانوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اور پھر یہ قصہ سنانے کے بعد دوست نے مجھ سے پوچھا کہ کیا صوفی تو نہیں ہو گئے؟ یہ سن کر میں نے دوست کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر سارے تمہاری طرح حسن ظن سے کام لینے لگیں تو یہ دنیا جنت بن جائے لیکن اگر کسی صوفی نے سن لیا کہ تم نے مجھے صوفی کہا ہے تو تمہاری اصلی شکل بھی اس پر آشکارا ہو جائے گی لہٰذا آئندہ اس طرح کی غیر محتاط گفتگو سے احتراز کرو!

اس دوست سے مایوس ہو کر میں نے ایک اور دوست سے اپنے مسئلے کا حل پوچھتے ہوئے کہا کہ ایک وقت تھا سیاستدانوں کے بیانات' شاعروں کا کلام' دانشوروں کی حکمت بھری باتیں' مشائخ کے روحانی مکاشفے بہت لطف دیتے تھے لیکن جب سے سیاستدانوں کو بے اصولی کی سولی پر ٹنگے دیکھا ہے' جب سے شاعروں کا ظاہر ان کے باطن سے جدا پایا ہے' جب سے دانشوروں کی نظریں ان کے پیٹ سے لگی ہیں اور جب سے مشائخ کو پلاٹوں کی باتیں کرتے سنا ہے' سیاسی بیانوں' غزلوں' نظموں' دانشورانہ گفتگوؤں اور روحانی مکاشفوں کا مزا جاتا رہا ہے۔ بتاؤ کیا کروں؟ دوست نے کہا بے حس ہو جاؤ! مجھے دل میں دوست کے مشورے پر بہت ہنسی آئی

کہ مجھے یہ احساس ہوتا ہے مگر میں نے اپنی عزت رکھنے کے لئے اثبات میں سر ہلا دیا جیسے اس نے میرے بارے میں صحیح اندازہ لگایا ہو!

آخر میں میرا دھیان ایک ایسے دوست کی طرف گیا جو صائب مشورے دینے کے لئے دوستوں کے حلقے میں بہت مشہور ہے چنانچہ میں نے اس کا دروازہ جا کھٹکھٹایا اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ دوست نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا تمہاری خاموشی سننے کے لئے نہیں' تمہارا جواب سننے کے لئے آیا ہوں۔ اس پر وہ بولا "تم اپنی تعریف میں جو کہنا چاہتے تھے' وہ تم نے کہہ دیا' تم مجھے جو سنانا چاہتے تھے میں نے سن لیا۔ اب کیا چاہتے ہو؟ میں نے پوچھا "کیا مطلب؟" بولا مطلب بہت واضح ہے کہ تم نے معاشرے کے مختلف طبقوں میں پائی جانے والی منافقت پر اظہار تاسف کیا جس میں بالواسطہ طور تمہاری اپنی پارسائی کا بیان شامل تھا۔ ہمارے ہاں ہیروئن پینے والا شرابی کو طعنہ دیتا ہے' شرابی اسمگلر کو طعنے مارتا ہے' اسمگلر سیاستدانوں کی غداری کی بات کرتا ہے' سیاستدان صاحبان اقتدار پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور صاحبان اقتدار اپوزیشن والوں کے لتے لیتے ہیں اور یوں ہم سب اپنے اپنے گناہوں سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں' تم بھی ہو گئے ہو اب گھر کی راہ لو!" میں نے اپنے گھر کی راہ لی' رستے میں مجھے ایک بجلی کا کھمبا نظر آیا میں نے ایک ڈلی اینٹ اٹھا کر اس پر دے ماری' یہ وہ اینٹ تھی جو میں اپنے اس نام نہاد دوست کے سر پر مارنا چاہتا تھا۔

آگے پٹڑی ختم ہوگئی ہے!

میں اس دفعہ اپنے قارئین کے لئے لندن سے ایک "برانڈ نیو" لطیفہ بھی بطور تحفہ اپنے ہمراہ لایا ہوں اور یہ لطیفہ سوشلزم کے حوالے سے ہے۔ "روی" بیان کرتا ہے کہ سوشلزم کی ٹرین چلتے چلتے رک گئی تو لینن ٹرین سے باہر نکلے اور پوچھا کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا کہ آگے پٹڑی ختم ہوگئی ہے۔ لینن نے کہا کہ ہمت کرو اور نئی پٹڑی بچھاؤ۔ چنانچہ سوشلزم کی ٹرین دوبارہ روانہ ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد ٹرین چلتے چلتے دوبارہ رک گئی تو اسٹالن ٹرین سے باہر آئے اور پوچھا کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا کہ آگے پٹڑی ختم ہوگئی ہے۔ سٹالن نے پستول نکال اور یہ جواب دینے والے کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ ٹرین ایک بار پھر چلی مگر تھوڑی دیر بعد اچانک رک گئی۔ اس بار خروشچیف باہر آئے اور پوچھا کیا معاملہ ہے؟ بتایا گیا کہ آگے پٹڑی ختم ہوگئی ہے۔ خروشچیف نے کہا کوئی بات نہیں پچھلی پٹڑی آگے بچھا کر کام چلاؤ چنانچہ ٹرین ایک دفعہ پھر روانہ ہوگئی مگر کچھ دور جا کر رک گئی تو برزنیف باہر آئے اور پوچھا کیا معاملہ ہے؟ بتایا گیا کہ آگے پٹڑی ختم ہوگئی ہے۔ برزنیف نے کہا کوئی بات نہیں آدھے مسافروں سے کہو کہ وہ گاڑی سے باہر آجائیں اور کھڑکیوں کے پردے گرا کر ٹرین کو زور زور سے ہلکولے دیں تاکہ اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کو یہ تاثر ملے کہ گاڑی چل رہی ہے۔ سو ایسا ہی کیا گیا جب کچھ دیر بعد پھر شور مچا کہ ٹرین رک گئی ہے تو گورباچوف باہر آئے اور پوچھا کیا معاملہ ہے؟ بتایا گیا کہ آگے پٹڑی ختم ہوگئی ہے۔ گورباچوف نے کہا کوئی بات نہیں کھڑکیوں کے پردے اٹھا دو اور سب مسافروں سے کہو کہ وہ کھڑکی میں سر باہر نکال کر زور زور سے چلانا شروع کر دیں کہ آگے پٹڑی ختم ہوگئی ہے۔ لو گو آگے پٹڑی ختم ہوگئی ہے!

میں نے یہ لطیفہ سن کر فیبین کلچرل اکیڈمی برطانیہ کے چیئرمین مجاہد ترمذی سے کہا کہ برادر "یہ لطیفہ تو بالکل "نواں نکور" ہے اور اپنی ساخت اور مواد کے لحاظ سے یا سر کی بھی نہیں لگتا" آپ نے کہاں سے سن لیا؟ بولے دو دن پہلے براہ راست روسیوں کے منہ سے سن کر آرہا ہوں۔ سو ان دنوں روس میں گردش کرنے والا یہ لطیفہ اپنے اندر سوشلزم کے حوالے سے ایک جہان معنی رکھتا ہے۔ اس میں طنز نہیں ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو سوشلسٹ قیادت کی سوچوں اور طرز عمل کا نہایت خوب صورت تجزیہ ہے۔ لینن سے لے کر گورباچوف تک سوشلزم پر جو کچھ گزری اس پر اس سے بہتر انداز میں تبصرہ کرنا ممکن نہیں۔ سوشلزم کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ سرمایہ داری نظام کی چیرہ دستیوں کے آگے ہاتھ باندھنے کے ضمن میں اس نظام نے بہت اہم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں مغرب

میں اور کچھ نہیں تو "انس کو سرمایہ داری" وجود میں آئی جس میں اپنے مقصد کے لئے صارفین سے لے کر وٹروں تک کو ان کی "حسب منشاء" استعمال کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک سوشلزم کے عبرتناک زوال کی دو وجوہ ہیں۔ ایک وجہ خود سوشلسٹ ہیں' روسی قیادت نے عوام پر سوشلزم نافذ کیا اور پنے عشرت کدے آباد رکھے۔ عوام کو ایک ڈبل روٹی خریدنے کے لئے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑا کر دیا اور خود کیک کھاتے رہے۔ کھجور کے درخت کے نیچے اینٹ کو سرہانہ بنا کر سونے والے امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب پتہ چلا کہ مصر کا گورنر شاندار محل میں رہتا ہے اور اس نے اپنے دروازے پر دربان بھی کھڑا کیا ہوا ہے جو سائلوں اور فریادیوں کو اندر داخل ہونے سے روکتا ہے تو انہوں نے اس گورنر کو معزول کیا اور چند بکریاں یہ کہہ کر اس کے سپرد کیں کہ آئندہ یہ بکریاں چرایا کرو۔ گورنر بننے سے پہلے بھی تم یہی کام کیا کرتے تھے۔ سوشلسٹ قیادت نے اگر خدا کو دیس نکالا نہ دیا ہوتا تو شاید ان کے اندر بھی وہ انقلاب جنم لیتا جو باہر سے وجود میں نہیں آ سکتا مگر اس کے نتیجے میں انہیں بھی بڑے بڑے محلوں کی بجائے فرش پر سونا پڑتا اور جو روکھی سوکھی وہ عوام کو کھلاتے تھے وہ خود انہیں بھی کھانا پڑتی!

سوشلزم کے زوال کی دوسری وجہ انسان کی اپنی ہوس' لالچ اور طمع بھی ہے' وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے اپنے مالی مفادات پر زد برداشت نہیں کر سکتا۔

لطیفہ

"اگر تمہارے پاس دو گھر ہوں تو تم کیا کرو گے؟"

"ایک گھر کسی رفاہی ادارے کے لئے وقف کر دوں گا؟"

"اگر دو کاریں ہوں؟"

"ایک کار کسی ضرورت مند ادارے کو بطور عطیہ دے دوں گا!"

"اگر تمہارے پاس دو بھینسیں ہوں؟"

"دونوں اپنے پاس رکھوں گا!"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لئے کہ میرے پاس دو بھینسیں ہیں!"

پس ثابت ہوا کہ انسان باتیں بہت کرتا ہے لیکن اپنے بھائی بندوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے تیار وہ اپنی مملکت سے

باآسانی دستبردار نہیں ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جب انتقال ہوا تو بہت سے قبیلوں نے بغاوت کردی۔ ان قبائلی رہنماؤں نے کہا کہ حضور کو نبی بھی مانتے ہیں' قرآن کو خدا کی کتاب بھی تسلیم کرتے ہیں نماز پڑھنے کو بھی تیار ہیں' روزے بھی رکھیں گے لیکن یہ جو زکوٰۃ ہے وہ ہم ادا نہیں کریں گے مگر حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ تمہارا سارا ایمان اس وقت تک ناقص ہے جب تک تم اپنے دھن میں سے شراکت برداشت نہیں کرتے۔ موجودہ دور میں ایران کا انقلاب بہت مثبت بنیادوں پر عمل میں آیا لیکن ایرانی عوام کی بہت بڑی تعداد اندر سے اس انقلاب سے سخت نالاں ہے۔

ایک تو سرمایہ دارانہ انقلاب کی صورت میں یہ انقلاب "بدست دیگراں افتاد" ہے اور دوسرا یہ انقلاب لوگوں سے کچھ مانگتا بھی ہے۔ چنانچہ میری پیش گوئی ہے کہ جلد یا بدیر ایران میں اس انقلاب کے خلاف زبردست بغاوت ہوگی جس میں انقلاب دشمن قوتیں بالآخر فتح یاب ہوں گی کہ انسان اپنی طبع کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ داری نظام اس وقت دنیا کا مقبول ترین نظام ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی لالچ' ہوس اور خود غرضی کو نہ صرف یہ کہ کنٹرول نہیں کرتا بلکہ اسے تیز سے تیز تر کرتا چلا جاتا ہے۔ سو حاصل کلام یہ ہے کہ سوشلزم ایک تو اپنے اندرونی نقائص اور دوسرے انسان کے اندرونی نقائص کی بنا پر بہت بری طرح ناکام ہوا ہے۔ اگر دنیا امن اور سلامتی چاہتی ہے تو اسے حضرت عمر فاروق کے دور حکومت کو ایک مثالی عہد کے طور پر سامنے رکھ کر اور اس میں موجودہ دور کے تقاضوں کی "آمیزش" کر کے ایک نظام وضع کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو سرمایہ داری نظام کا عفریت انسان کی ساری قدروں کو نگل جائے گا اور اس "جہل خرد" کے نتیجے میں

"گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے"

والی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اب انسان کے پاس نئے نظام کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ آگے بڑھنے کی ہمت ختم ہو گئی ہے!

"وی سی" یا "وی سی آر"؟

گزشتہ روز خبر پڑھی کہ حکومت یونیورسٹیوں کے بحران پر قابو پانے کا ارادہ رکھتی ہے تو دل بہت خوش ہوا کہ چلو وائس چانسلر اور پروفیسر حضرات پھر "اپ گریڈ" ہو کر کم از کم کلرک اور ہیڈ کلرک اتنی عزت تو حاصل کر ہی سکیں گے کیونکہ یونیورسٹیوں کی موجودہ صورت حال میں طالب علموں کے ہاتھوں ان کی جو درگت بنتی ہے بلکہ جو "حیثیت" متعین ہوتی ہے وہ "قاصد" اور "نائب قاصد" سے زیادہ نہیں' لگتا ہے میں کچھ مبالغے سے کام لے گیا ہوں۔ کیونکہ قاصد اور نائب قاصد کو بہر حال غسل خانے میں بند نہیں کیا جاتا اور نہ ان پر پتھراؤ کیا جاتا ہے یہ "سنگساری" تو وائس چانسلروں اور یونیورسٹیوں کے سینئر پروفیسروں ہی کا مقدر بنتی ہے تاہم جب میں نے مذکورہ خبر کا غور سے مطالعہ کیا تو میری ساری مسرت کافور ہو گئی کیونکہ یونیورسٹیوں کے جس بحران پر قابو پانے کے عزم کا اظہار کیا گیا تھا وہ صرف مالی بحران تھا۔ اس میں اساتذہ اور وائس چانسلروں کی حرمت بحال کرنے کا کوئی وعدہ شامل نہیں تھا۔

یہ کالم لکھنے سے میرا مقصود یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز' پرو وائس چانسلرز اور پروفیسرز کی بنی ہوئی "ٹور" کو ختم کرنا نہیں' جو عام لوگوں کے ذہنوں میں قائم ہے۔ عام لوگ تو یونیورسٹی کانووکیشن کی محض تصویریں ہی اخباروں میں دیکھتے ہیں جن میں وائس چانسلر حضرات دستار فضیلت سر پر رکھے' گاؤن پہنے' پروفیسر حضرات کا جلوس لیڈ کرتے نہایت باوقار انداز میں سٹیج کی طرف جاتے نظر آتے ہیں۔ نہایت مدبرانہ انداز میں عینک ایک خاص زاویے پر رکھ کر خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام نے انہیں کتنا بڑا مرتبہ اور کس قدر عزت و وقار بخشا ہے مگر حقیقت حال سے تو یہ بیچارے وائس چانسلر حضرات ہی واقف ہوتے ہیں کیونکہ ان دنوں طالب علموں نے وی سی کو وی سی آر بنا دیا ہے۔ اس میں طالب علم جو کیسٹ ڈالتے ہیں صرف وہی چلتی ہے۔ یہ وی سی صاحبان اگر تھوڑی سی مزاحمت بھی کریں تو انہیں غسل خانے میں بند کر دیا جاتا ہے اور سنگ باری کر کے ان کے دفتر کے شیشے توڑ دیئے جاتے ہیں بلکہ کئی دفعہ تو محض اس مفروضے کے تحت یہ سب کچھ کیا جاتا ہے کہ جو فیصلہ طالب علم رہنما فرما چکے ہیں۔ کہیں وائس چانسلر یا ان کی بنائی ہوئی کمیٹی اس کے خلاف فیصلہ صادر نہ کر دے' ممکن ہے کسی زمانے میں طالب علموں کی کوئی نظریاتی تنظیم اساتذہ کے ادب آداب کا خیال رکھتی ہو یا انصاف کے راستے میں رکاوٹ نہ بنتی ہو لیکن اب تو بساط مکمل طور پر الٹی جا چکی ہے اور کسی ملکی قانون تو کیا' کسی دینی یا اخلاقی اصول کی بھی پروا نہیں کی جاتی اور یوں جو لوگ اس قسم کی نظریاتی تنظیموں سے حسن ظن رکھتے

تھے' مشکل وقت میں ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہوتے تھے۔ وہ سخت ذہن الوژن ہیں اور سوچتے ہیں کہ یک طویل عرصے کی نظریاتی تربیت' رت جگے اور پورے معاشرے کو حضور کے اسوہ حسنہ میں ڈھالنے کے خواب' اگر ایک ذرا سی مصلحت کے سامنے دم توڑ دیتے ہیں تو کوئی بڑی مصلحت درپیش ہونے کی صورت میں' صورت حال کیا ہوتی ہوگی؟

مجھے لگتا ہے کہ بات کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگئی ہے حالانکہ کالم نگار اگر سنجیدہ ہو جائے تو وہ کچھ تحویل سا لگنے لگتا ہے' لہٰذا مجھے اپنے اس دوست کی بات پر کان دھرنا چاہیے جو میرے پاس بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تم خوامخواہ بے چارے طالب علموں کے پیچھے پڑے ہو' طالب علم تو آخر طالب علم ہیں' تم ان سے اتنی بوقت کی توقع کیوں رکھتے ہو۔ بات کرنی ہے تو طالب علم تنظیموں کے مربیوں سے کرو کہ وہ اپنے بچوں کو سمجھائیں کہ جو کچھ یہ کرتے ہیں وہ ان کے بڑوں کے کھاتے میں جاتا ہے۔ اور صحیح طور پر جاتا ہے' دوسری بات میرے دوست نے یہ کہی ہے کہ حکومت سے یونیورسٹیوں کی مرمت کرنے کا مطالبہ کرنے کی بجائے براہ راست یہ اپیل یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں سے کرو کہ وہ اپنی اور یونیورسٹیوں کی عزت بحال کریں اور ان کی خودی پیدا کرنے کے لئے انہیں ٹیپو سلطان کا قول بھی یاد دلاؤ۔ تاہم مجھے اپنے دوست کی دوسری بات سے اختلاف ہے کیونکہ یہ بے چارے اگر اس چکر میں پڑ گئے تو ان کی نوکری چلی جائے گی۔ اور پھر ان کی یہ نوکری کون بحال کرائے گا؟ حبیب جالب نے کسی زمانے میں فیض احمد فیض کے بارے میں یہ شعر کہا تھا۔

جگا نہ شہ کے مصاحب کو خواب سے ورنہ
اگر یہ جاگ اٹھا نوکری سے جائے گا

جو یک فقرہ سے ان شرفاء پر بھی صادق آتا ہے ایسا نہیں کہ حکومت انہیں خوشی سے نوکری سے نکالے گی بلکہ طلبہ کے مطالبے پر ایسے وی سی صاحبان کو جو طلبہ کا وی سی آر بننے سے انکار کریں گے بادل نخواستہ نوکری سے جواب دے دیا جائے گا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ حکومت کے لئے "امن وامان کا مسئلہ" پیدا کرنے کا باعث بنیں گے۔ لہٰذا یہ "طائرلاہوتی" ساری عمر طلبہ تنظیموں کے سامنے رکوع کی حالت میں رہتے ہیں اور یہ صورت حال پشاور سے کراچی تک قائم ودائم ہے۔ سو اگر ہمارے چوٹی کے سکالرز اور سینئر پروفیسر ہی خودی کو بلند نہیں کرنا چاہتے اور خود کو اپنے خدا کی بجائے طلبہ کے سامنے ہی جواب دہ سمجھتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ حکومت یونیورسٹیوں کے مالی بحران پر قابو پائے۔ اخلاقی بحران سے کسی قوم کا کیا بگڑتا ہے؟

◆◆◆

تھینک یو سوری ایکسکیوزمی!

انگریزوں کو تین لفظ ادا کرنے کا بہت شوق ہے' تھینک یو سوری ایکسکیوزمی' تھینک یو کی تکرار تو اتنی ہوتی ہے کہ کہنے اور سننے والے دونوں ہلکان ہو جاتے ہیں۔ دکاندار چیز بیچتے وقت تھینک یو کہتے ہیں اور گاہک چیز خریدتے ہوئے تھینک یو کہتا ہے حتیٰ کہ گاڑی میں بیٹھے ہونے کی صورت میں بھی وہ سلام کر کے تھینک یو کا فریضہ انجام دیتا ہے' یہی حال سوری اور ایکسکیوزمی کا بھی ہے۔ سوری اس وقت کہا جاتا ہے جب ذرا سی غلطی ہو جائے بعض دفعہ تو احتیاطاً بھی سوری کہہ دیا جاتا ہے۔ ایکسکیوزمی عموماً مخاطب کرنے کے لئے کہا جاتا ہے اور یہ الفاظ ہم ایسے راہوریوں کو بھی "لندن یاترا" کے دوران اتنی دفعہ سننا پڑتے ہیں کہ راہور یاد آنے لگتا ہے جہاں کسی کا شکریہ ادا کرنا یا سوری کہنا غیرت کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ اگر میرے پنجابی کے "اہل رہاں" دوست ناراض نہ ہوں تو یہ ماننے میں حرج نہیں ہماری زبان میں "شکریہ" کے لئے سرے سے کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ شکریہ اردو کا لفظ ہے' مہربانی اردو کا لفظ ہے' اللہ بھلا کرے' کہا جائے تو لگتا ہے کہ "مولا خوش رکھے" قسم کی چیز ہے۔ تاہم اردو میں یہ لفظ موجود ہونے کے باوجود اس کے استعمال کو چنداں مناسب نہیں سمجھا جاتا' چنانچہ ہم لوگ من حیث القوم یعنی چاروں صوبوں کے لوگ شکریہ وغیرہ کہنا نہیں جانتے' میں اس کی وجہ تلاش کرتا رہا ہوں اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ تینوں لفظ تعلقات میں ایک طرح کی بیگانگی ظاہر کرتے ہیں' کسی کے پاؤں پر آ جائے تو پاؤں روندنے والا سوری نہیں کہتا اور دوسرے "اندھے ہو' نظر نہیں آتا؟" کہہ کر حساب برابر کر دیتا ہے۔ اگر شروع ہی میں "سوری" کہہ دیا جائے تو اس سے ایک تو انگریز مردود کی تنقید کا پہلو نکلتا ہے اور دوسرے زبان یا زبان درزی کا چسکا پورا نہیں ہوتا!

عربی کا ایک مقولہ ہے جس کا آسان اردو ترجمہ "جیسی روح ویسے فرشتے" ہے۔ ہمارے سیاستدان اور صاحبان اقتدار بھی چونکہ ہم ہی میں سے ہیں لہٰذا متذکرہ بالا تینوں لفظ ان کی زبان پر بھی نہیں چڑھتے۔ یہ دونوں طبقے یعنی حزب اختلاف اور حزب اقتدار ایک دوسرے کا نہ شکریہ ادا کرتے ہیں' نہ کبھی معذرت کرتے ہیں اور نہ کبھی "معاف کیجئے گا" کہتے ہوئے ایک دوسرے سے شائستگی کے ساتھ راستہ مانگتے ہیں بلکہ جسے موقع ملتا ہے وہ "الا اللہ" کہہ کر دوسرے پر چڑھ دوڑتا ہے۔ ان دنوں میاں نواز شریف کی حکومت نہ صرف یہ کہ اپوزیشن بلکہ حلیف جماعتوں کی چاند ماری کی بھی زد میں آئی ہوئی ہے۔ حلیف جماعتوں میں سے کچھ کے گلے شکوے تو بالکل بجا ہیں لیکن ان میں ایک آدھ جماعت ایسی بھی ہے جو وزیر اعظم کو اپنا سٹیٹو بنانا چاہتی ہے کہ وہ جو ڈکٹیٹ کریں' سر موانحراف

نہ کریں۔ وزیر اعظم اور حذب کردہ جماعت کے رہنما کے درمیان ممکن ہے کبھی اس نوع کا ڈائیلاگ بھی ہوا ہو۔

"آپ تو خواہ مخواہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں آپ فرمائیں کیا چھ ماہ پیشتر آپ کے کہنے پر میں نے آپ کے ڈیڑھ سو دہشت گرد رہا نہیں کیے؟"

"بالکل کیے تھے!"

"چار ماہ پیشتر میں نے آپ کے چار سو آدمی مختلف محکموں میں بھرتی نہیں کرائے؟"

"کرائے تھے!"

"آپ کے کہنے پر گزشتہ ماہ میں نے اپنے حامیوں کے ایک موثر گروپ کو ناراض نہیں کیا؟"

"کیا تھا!"

"ابھی پرسوں میں نے آپ کے کہنے پر اپنا ایک اہم فیصلہ تبدیل نہیں کیا؟"

"کیا ہے!"

"تو پھر آپ شکریے کا ایک لفظ کہنے کے بجائے ہم سے ناراض کیوں ہیں؟"

"کمال ہے صاحب! آپ کو ہماری ناراضگی کی وجہ کا بھی علم نہیں! آپ پرسوں کی بات کر رہے ہیں آپ یہ بتائیں کہ کل کا دن جو خالی گزر گیا ہے اس میں آپ نے ہمارے لئے کیا کیا؟"

سو ہمارے وزیر اعظم کو اپنی اس حلیف کو خوش رکھنے کے لئے ہر روز کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن چونکہ "شکریہ" کا لفظ ہماری قوم کے مزاج میں شامل نہیں لہٰذا جناب وزیر اعظم اس لفظ سے محروم رہتے ہیں اسی طرح "سوری" کا لفظ حکومت اور اپوزیشن کی زبان کے الفاظ پوزیشن کے ذہنوں سے محو ہو چکے ہیں۔ لگتا ہے حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے سیاست دانوں کو انگلستان گئے کافی روز ہو گئے ہیں اگر ہو سکے تو کسی "ویک اینڈ" پر ایک چکر ادھر کا لگا لیں تا کہ تھینک یو سوری اور ایکسکیوز می کے الفاظ ان کے حافظے میں تازہ ہو سکیں۔ میں بھی محض یہ سبق یاد کرنے کے لئے اس دفعہ انگلستان گیا تھا ورنہ سردیوں میں وہاں جا کر "بے پردہ میمیں" دیکھنے کا کیا تک تھا؟

◆◆◆

مسجد قرطبہ کے میناروں سے سرگوشی کرتا آسمان!

اکتوبر کے آخری ہفتے میں لے دور حضرت شاہ نے ہسپانیہ (اسپین) سرزمین پر قدم رکھا تو اس کے گلی کوچوں میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے دیوانہ وار گھومتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوا کہ ہم کسی اجنبی سرزمین میں گھوم رہے ہیں کہ طارق بن زیاد کی سرزمین ہمارے لئے اجنبی کیسے ہو سکتی ہے؟ کھجور کے درختوں، نارنگیوں کے باغات اور سرخ مٹی والی یہ زمین پاؤں پکڑ پکڑ لیتی تھی۔ غرناطہ کی ایک سڑک کے کنارے قطار اندر قطار کھڑے کھجور کے درختوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے سڑک پر گری پکی ہوئی کھجوروں میں سے ایک کھجور منہ میں ڈالی کہ کھجور کے یہ درخت عبدالرحمن اول نے سرزمین ہسپانیہ میں لگائے تھے اور میں نے اس کھجور کی حلاوت میں صدیوں کا ذائقہ محسوس کیا!

پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے عظیم الشان الحمرا پیلس میں ٹورسٹوں کے ساتھ گھومتے ہوئے بھی میں نے خود کو ٹورسٹ محسوس نہیں کیا کہ میں ہی تو اس خزانے کا وارث تھا۔ الحمرا کی ایک ایک اینٹ پر "لا غالب الا اللہ" (اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں) کے الفاظ کندہ تھے اور یہ الفاظ اس وقت لکھے گئے تھے جب شہنشاہ خود کو خدا سمجھا کرتے تھے۔ فنون لطیفہ کے سرپرست جس مسلمان بادشاہ نے یہ محل تعمیر کیا تھا اس کی بادشاہت نہ رہی' یہ محل بھی اپنی اصلی شکل میں قائم نہ رہا' لیکن خدا کی بادشاہی آج بھی تمام کائناتوں میں قائم و دائم ہے کہ ساری کائناتوں کا مالک وہی ہے ایک ٹورسٹ بار بار مجھ سے پوچھا کہ اس محل کے در و دیوار پر ایک ہی عبارت جگہ جگہ لکھی ہوئی ہے' یہ کیا ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ اللہ کے غالب ہونے کا اقرار ہے۔ اللہ کا نام سن کر وہ چونکی اور اس نے کہا کہ ہم لوگ جب کسی بات پر حیران ہوتے ہیں تو ہسپانی زبان میں "ہوئیہ" کہتے ہیں اور میں اس کی بات پر چونکا کہ مسلمان اسپین سے چلے گئے' پیچھے اللہ کا نام چھوڑ گئے۔

اسپین میں اب مسلمان کہیں نظر نہیں آتے' جب مسلمانوں پر زوال آیا تو انہیں چن چن کر قتل کر دیا گیا اور یوں ان کی نسل ختم کر دی گئی' ایک ہزار سالہ حکومت کے بعد زوال کی کئی وجوہ تلاش کی جا سکتی ہیں لیکن ابن خلدون کے نظریہ تاریخ کے مطابق کسی قوم کا عروج و زوال ایک ایسا عمل ہے جیسا ایک بیج سے پودے کا پھوٹنا اس کا بڑا ہونا' ثمر آور ہونا اور بالآخر روبہ زوال ہونا۔ میں وہاں

ان "موروں" (مسلمان) کی تلاش کرتا رہا جن کے قدموں کی آہٹ سننے کے لئے اقبال آج بھی بے قرار ہے۔

کون سی منزل میں ہے کون سی وادی میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں

مگر مجھے وہاں کوئی "مور" نظر نہیں آیا۔ فٹ پاتھ پر گڑیاں بیچتے ہوئے ایک سیاہ فام سے میں نے یونہی پوچھا "آر یو مسلم" اس نے کہا "یس!" اور پھر خاموشی سے کلمہ پڑھا "اشہد الا الٰہ الا اللہ واشہد محمد عبدہ ورسولہ" اس سیاہ فام مسلمان کا تعلق سینیگال سے تھا اور وہ حصول رزق کے لئے اسپین میں آباد ہو گیا تھا۔ اب ہم رزق کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں' پہلے خدا کا پیغام دنیا میں پھیلانے کے لیے اپنے آرام دہ گھروں سے بہت دور نکل جایا کرتے تھے اور جن کشتیوں پر سوار ہو کر ساحلوں پر اترتے تھے' ان کشتیوں کو جلا دینے کا حکم دیتے تھے کہ واپسی کا خیال دلوں میں نہ آئے!

غرناطہ سے قرطبہ کی طرف جاتے ہوئے پھر وہی کھجوروں کے جھنڈ ہم پاکستانی زائرین کو یہ احساس دلانے کے لئے ہمارے راستوں میں کھڑے تھے کہ تم یہاں اجنبی نہیں ہو' ہم تمہارے کلمہ گو بھائیوں کی نشانی ہیں لیکن مسجد قرطبہ میں داخل ہوتے ہوئے یہ تسلیاں میرے کسی کام نہ آئیں اور اس ناقابل یقین حد تک خوب صورت مسجد کی تنہایاں دیکھ کر میری آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر رابرٹ مسجد قرطبہ کو دنیا کی خوب صورت عمارت قرار دیتا ہے' اس کی نظریں یہیں تک جا سکتی تھیں' اس کے لئے یہ جاننا مشکل ہے کہ یہ محض سنگ و خشت سے بنی ہوئی عمارت نہیں ہے' اس میں ان مسلمان غازیوں' مجاہدوں اور شہیدوں کے دل دھڑکتے ہیں جنہوں نے جہالت میں ڈوبے ہوئے یورپ کو علم کی روشنی سے روشناس کرایا اور یوں اس مسجد کے چہرے پر پھیلا ہو صدیوں کا نور ہی اس کی خوب صورتی ہے۔ اس مسجد کی تنہائی دور کرنے کے لئے یورپ کے "لبرل" باسیوں نے اس کے بیچ حصے میں چرچ بنا دیا تھا جو آج بھی ان کی "فراخدلی" کا ثبوت دینے کے لئے موجود ہے۔ چنانچہ جب میں اس مسجد کے بے شمار ستونوں میں سے ایک ستون کے پیچھے اپنے خدا کے حضور سجدہ ریز تھا' چرچ کی گھنٹیاں مسلسل سنائی دے رہی تھیں!

مسجد کے مین گیٹ سے باہر ایک اسپینش نوجوان سر پر ہیٹ پہنے بانسری نما کوئی چیز بج رہا تھا اور گھیرے دار سکرٹ پہنے ہوئی اس کی گرل فرینڈ اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے میں مشغول تھی۔ تھوڑی دیر بعد نوجوان نے جیب سے سگریٹ اور ہیروئن نکالی اور پھر دونوں بھرے ہوئے سگریٹ کا دھواں مسجد قرطبہ کی فضاؤں میں بکھیرنے لگے جس پر میں اور حضرت شاہ مسجد کے برابر میں بہتے ہوئے دریائے کبیر کی طرف نکل گئے مگر وہاں دریا کی جگہ گھنی جھاڑیاں، گی ہوئی تھیں ہم بہت دیر تک پل پر کہنیوں جمائے یونہی

کھڑے رہے۔ اقبال نے وہاں کھڑے ہو کر ایک تنے رہنے کا خواب دیکھا تھا۔ حضرت شاہ نے ایک نظر خشک دریا پر ڈالی اور پھر اقبال کے شعر

اب روان کیوں تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پڑھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا "قاضی صاحب! اقبال جو خواب دیکھ رہا ہے کیا اس کی تعبیر کبھی نظر آئے گی؟" میں نے اس دردمند دوست کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "ایک دن وہ سحر بھی انشاء اللہ پوری طرح بے حجاب ہو گی جو ابھی ہماری نظروں سے اوجھل ہے کہ اقبال کا کوئی خواب بے تعبیر سامنے نہ آئی ہو!" اور پھر ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مسجد قرطبہ کے دامن میں آ گئے جس کے میناروں سے مسکراتا ہوا آسمان آنے والے خوبصورت دنوں کے حوالے سے سرگوشی کرتا محسوس ہوتا تھا!

◆◆◆

خدانخواستہ خدانخواستہ!

لندن کے ہیتھرو ائیرپورٹ تک پہنچنے کے لیے اعجاز کو جگہ جگہ ٹریفک سگنل پر رکنا پڑا ایسے کراسنگ پر بھی جہاں دائیں بائیں سے کوئی ٹریفک آتی دکھائی نہیں دیتی تھی اس لیے اس کے صبر ہونے تک اس "کشتہ رسوم و قیود" برطانوی معاشرے کے فرد اعجاز کو بریکیں لگانا پڑتیں۔ میں سگریٹ کی خالی ڈبیہ کھڑکی سے باہر پھینکنے لگا تو اعجاز نے میرے عزائم بھانپ کر ڈبیہ میرے ہاتھ سے لی اور اسے ڈیش بورڈ پر سجا دیا کہ وہ بعد میں اسے کسی ڈسٹ بن میں پھینک دے گا۔ ہائی وے پر آنے کے بعد بھی موصوف اسی قسم کی احتیاطوں کا مظاہرہ فرماتے رہے کہ اگر آہستہ چلنا ہے تو بائیں ہاتھ والی لین میں گاڑی موڑ لیں' ذرا تیز چلنا ہے تو دائیں والی لین میں آ گئے اور مزید تیز رفتاری کو جی چاہا تو دائیں ہاتھ والی لین کو اپنا لیا۔ اس قوم کو وقت ضائع کرنے کا اتنا شوق ہے کہ لین بدلنے سے پہلے اشارہ دے کر کتنی دیر اس لین میں چلتے بھی رہتے ہیں!

ہیتھرو ائیرپورٹ پر بھی پابندیوں کا یہی عالم تھا کہیں پورٹر کی بجائے اپنا سامان خود اٹھانے کی پابندی' کہیں قطار لگانے کی پابندی' قدم قدم پر تیر کے نشانوں کی پابندی کہ ادھر جانا ہے تو تیر کو فالو کرتے جائیں' ادھر جانا تو بھی تیر کو فالو کرتے جائیں اور یوں بھٹکنے کا شوق پورا نہیں ہوتا جگہ جگہ ٹکٹ بنے ہوئے ہیں' چنانچہ کسی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر "آزادی عمل" کا موقع ہی نہیں ملتا' قدم قدم پر ٹیلی فون ہیں' جس سے جستجو کی لذت جاتی رہی ہے' مجھے زیادہ افسوس اس بات کا ہوا کہ لندن میں مقیم ہمارے پاکستانی بھائیوں کا بھی اس ماحول میں دم نہیں گھٹتا' جب کہ میرے لیے تو سانس لینا بھی دشوار ہو گیا تھا چنانچہ جب میں پی آئی اے کے جمبو جیٹ میں داخل ہوا تو میں نے اطمینان اور سکون کا ایک لمبا سانس لیا' مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے گھر میں آ گیا ہوں!

جمبو جیٹ جب ہزاروں فٹ بلندیوں پر پرواز کرنے لگا تو میں نے برابر سے گزرتے ہوئے ایک اسٹیورٹ سے کہا "اگر زحمت نہ ہو تو فلم چلا دیں" انہوں نے شائستگی سے فرمایا کہ "استنبول کے بعد چلائیں گے" "استنبول تین گھنٹے بعد" آگیا جہاز نے دوبارہ پرواز شروع کی تو میں نے اسی اسٹیورٹ سے فلم چلانے کی فرمائش کی' انہوں نے معذرت کی اور کہا کہ دراصل کل سے ہمارے وی سی آر میں کچھ خرابی ہے جس کی وجہ سے وہ تعمیل ارشاد نہیں کر سکیں گے۔ میں نے کہا چلیں ہیڈ فون ہی عنایت فرمائیں تاکہ ہم میوزک سے جی بہلائیں۔ فرمانے لگے یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ ہمارا پورا سسٹم کل سے خراب ہے' حالانکہ ان کا وعدہ استنبول کے بعد فلم اور میوزک آن

کرنے کا تھا۔ جب وہ جانے لگے تو میں نے کہا آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آپ کا قلم اور میموری کا سسٹم کل سے نہیں کم از کم ایک مہینے سے خراب ہے کیونکہ یک ماں قبل میں اسی طیارے میں لندن آیا تھا اور اس وقت بھی صورت حال جوں کی توں تھی۔ انہوں نے، گرچہ میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن سچی بات ہے کہ اس سوال جواب میں میرے پیسے پورے ہو گئے اسی قسم کی ریاکاریوں، غفلتوں اور دوسروں کو بے وقوف بنانے کے ہتھکنڈوں ہی سے تو ہمارے ہاں زندگی گزارنے کا مزا آتا ہے۔ لیکن میرے ہم سفر عزیز صاحب بہت بدمزہ ہو رہے تھے کہ پاکستان نژاد برطانوی نیشنل ہیں اور اب بڑے چاؤ سے آٹھ سال بعد وطن واپس جا رہے تھے!

''ہم لوگ کب بدلیں گے؟'' عزیز صاحب نے بڑی دردمندی سے کہا ''خدانہ کرے کہ ہم کبھی بدلیں'' میں نے فوراً ان کی بات کاٹی ''اگر خدانخواستہ ہم بدل گئے تو مغرب والوں کی طرح ہمارے ہاں بھی قدم قدم پر قاعدے قانون کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امیر غریب کا فرق کم ہو جائے گا، سبھی لوگ خوش حال ہو جائیں گے جس سے خوش حالی کا مزا جاتا رہے گا۔ لوگ عزت نفس کے چکر میں پڑ جائیں گے جس سے افسری ماتحتی میں بھی کوئی فرق نہیں رہے گا لہٰذا عزیز صاحب خدا کے لئے اپنے الفاظ واپس لیں!''

عزیز صاحب نے الفاظ واپس نہیں لئے بلکہ وہ گرنیل کرتے ہوئے اسلام آباد ائرپورٹ پر اترے، اور اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گئے میں نے کنکشنگ فلائٹ پکڑی اور لاہور پہنچ گیا۔ لاہور ائرپورٹ پر پھر وہی دل خوش کن سماں تھا۔ کم از کم پندرہ بیس پورٹر ٹرالیاں لئے مسافروں کے ایک شارے کے منتظر تھے ایک پورٹر نے میرا سامان اٹھا کر ٹرالی میں رکھا اور میرے آگے آگے چلنے لگا اور میں اپنے دونوں خالی ہاتھوں کا مصرف سوچتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بالآخر میں نے یہ ہاتھ اپنی پتلون کی جیبوں میں ڈال لئے۔ باہر بچے گاڑی لے آئے ہوئے تھے میں نے پورٹر کو ٹپ دی اس نے میرے بچوں کو دعائیں دیں جھک کر سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ گزشتہ یک ماہ میں اتنی دعاؤں اور سلاموں کے لئے ترسا ہوا تھا!

لندن میں پیدل چلنے والوں کو غیر ضروری طور پر اہمیت دی جاتی ہے وہ اگر سڑک کراس کر رہے ہوں تو گاڑی ان کے احترام میں اس طرح روک دی جاتی ہے جیسے شہنشاہ کی سواری جا رہی ہو حالانکہ پیدل چلنے والوں کو تنگ کرنے کا اپنا ہی ایک مزہ ہے چنانچہ اپنے گھر تک ڈرائیو کرتے ہوئے میں نے اس طرح کا کوئی پر لطف موقع ہاتھ سے جانے دیا۔ ایک ٹریفک سگنل پر مجھے گاڑی روکنا پڑی تو پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تین چار فقیر ادھر ادھر سے آ گئے۔ میں نے اپنے بچوں کو بتایا کہ ان لوگوں کی مدد بالکل نہیں کرنی چاہیے کہ انہیں مانگنے کا چسکا پڑا ہوا ہے اور پھر میں نے کار کے شیشے چڑھائے اس طرح حقارت سے کار کے شیشے چڑھانے کا بھی اپنا

ہی مزہ ہے' رستے میں' میں نے سگریٹ کی خالی ڈبیہ گھما کر سڑک پر جو پھینکی جو ہوا میں اڑتی ہوئی ایک سائیکل سوار کی لمبی سی ناک سے جا ٹکرائی جس سے اس کا ہینڈل ڈول گیا اور وہ گرتے گرتے بچا' مارے ہنسی کے میرا برا حال ہوا۔ کار میں بچوں نے بہت گند ڈالا ہوا تھا' چپس کے خالی پیکٹ' کیلوں کے چھلکے اور پتہ نہیں کیا الا بلا جمع کیا ہوا تھا' میں نے انہیں ڈانٹا اور صفائی کی تلقین کرتے ہوئے یہ سارا کوڑا کرکٹ باہر سڑک پر پھینک دیا گھر کے راستے میں ساری ٹریفک اپنی مرضی سے چل رہی تھی' کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے ایک شخص اپنی دونوں ٹانگوں میں سے ہاتھ گزار کر کان پکڑے مرغا بنا ہوا تھا' مرغا بنانے والا شخص بید سے اس کی پٹائی بھی کر رہا تھا اور کچھ لوگ پوری محویت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے' ایک ماہ سے آنکھیں اس طرح کے منظر دیکھنے کو ترس گئیں تھیں۔ شرف انسانیت' شرف انسانیت' کان پک گئے تھے شرف انسانیت کی باتیں سنتے سنتے! اب گھر قریب آ رہا تھا میں نے صبح سے شام تک گرد و پیش میں دکھائی دینے والے مناظر کے بارے میں سوچا تھا۔ تھانے کچہریاں آئیں' فیکٹریاں اور ورکشاپوں میں کام کرتے بچے یاد آئے' سفارشیں یاد آئیں' کروڑوں روپے معاف ہونے والے قرضے یاد آئے' سیاست دان اور صاحبان اقتدار یاد آئے اور میں نے سوچا ان لوگوں کے دم قدم سے ہمارے ملک میں کتنی رونقیں ہیں۔ خدانخواستہ اگر عزیز صاحب کی دعا قبول ہو گئی تو ہم سب کا کیا بنے گا؟ ان سب کا کیا بنے گا؟

◆◆◆

ملک کا سب سے بڑا مسئلہ!

میں نے گھر سے "نوائے وقت" جانے کے لئے گاڑی سٹارٹ کی تو تھوڑی دیر بعد وہ بند ہو گئی اور پھر میری تمام تر کوشش کے باوجود وہ سٹارٹ نہ ہو سکی۔ میں اپنے گھر کے قریب واقع ایک ورکشاپ میں سے مکینک کو لے کر آیا جس کی کوششوں سے تھوڑی دیر بعد ہی گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔ میں نے خرابی کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ پٹرول میں کچرا آ گیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ گزشتہ روز میں نے اپنے قابل اعتماد پٹرول پمپ کی بجائے ایک دوسرے پٹرول پمپ سے پٹرول لیا تھا اور یہ غالباً اسی وقت سے میرے ذہن میں موجود تھا کہ ناقص پٹرول کی وجہ سے گاڑی میں ضرور کوئی خرابی پیدا ہو گی۔

گھر سے سٹیج بلاک تک کی سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے اور گاڑی کو جو ہچکولے لگ رہے تھے وہ ہم دونوں کا ستیاناس کرنے کے لئے کافی تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ گندے نالے سے دودھی چوک کی طرف مڑنے کے بعد سڑک ہموار ہو گی اور میں اقبال ٹاؤن کی مین روڈ پر آ گیا اور یہاں بھی اسی طرح کا کوئی پرابلم نہ تھا البتہ یہاں کارپوریشن کا گندگی سے بھرا ہوا ٹرک میرے آگے لگ گیا اور چاروں طرف سے کھلا ہونے کے وجہ سے اس میں سے غلاظت نکل نکل کر سڑک پر بہہ رہی تھی جس سے پوری فضاء متعفن ہو گئی تھی۔ میں نے ہارن پہ ہارن دیئے مگر ٹرک ڈرائیور کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور وہ سڑک کے عین درمیان میں ٹرک دوڑاتا رہا۔ خدا خدا کر کے اس ظالم کا دل پسیجا اور میں اسے اوورٹیک کرنے میں کامیاب ہو گیا!

وحدت روڈ پر بائیں جانب کے بعد سڑک بہت بہتر ہو گئی تھی چنانچہ میں نے کار کی رفتار مزید تیز کر دی مگر کچھ دیر بعد مجھے بریک لگانا پڑی کہ ایک دس بارہ سالہ دونوں پاؤں سے معذور بچی گھسٹ گھسٹ کر سڑک پار کر رہی تھی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ زمین پر کیڑے مکوڑے کی طرح رینگتی ہوئی یہ بچی کار کی سکرین میں سے نظر آ گئی ورنہ اس کا حشر بھی زمین پر رینگنے والے دوسرے کیڑوں مکوڑوں جیسا ہوتا۔ وحدت روڈ کے اختتام پر ایک سگریٹ کی دکان کے پاس میں نے کار روکی۔ آٹھ نو سال کا ایک بچہ آرڈر لینے کے لئے دوڑا دوڑا میرے پاس آیا' اتنی ہی عمر کے ایک دوسرے بچے نے میلے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ایک میلے کچیلے کپڑے سے میری کار کو مزید چمکانا شروع کر دیا' برقع میں ملبوس ایک عورت چند ماہ کی بچی گود میں لئے ہوئے میرے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ اتنے میں لڑکا سگریٹ لے آیا تھا۔ میں نے چینج ان سب میں تقسیم کر دیا اور بائیں ہاتھ مڑ کر فیروز پور روڈ پر آ گیا۔

رحمان پورہ میں' میں نے نے اپنے درزی سے کپڑے لانا تھے چنانچہ میں فیروز پور روڈ پر ذرا سا چلنے کے بعد بائیں ہاتھ رحمان پورے کی طرف مڑ گیا۔ ٹیلر ماسٹر دکان میں موجود نہیں تھا' میری نظر سڑک کے دوسرے کنارے پر گئی تو وہ منہ دیوار کی طرف کئے کھڑا تھا' تھوڑی دیر بعد وہ ازار بند باندھتا ہوا دکان میں داخل ہوا' میں نے کہا ماسٹر جی! سر عام یہ حرکت کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی؟ ماسٹر جی نے گردن جھکا کر کہا۔ "آتی ہے جی! لیکن اس پورے علاقے میں ٹائلٹ نہیں ہے' اگر زیادہ دیر شرم ضبط کیا جائے تو اس سے کئی گنا شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے!" ماسٹر نے ڈاکوؤں' زنا بالجبر' قتل اور سکینڈلز کی خبروں سے بھرے ہوئے ایک اخبار میں میرے کپڑے لپیٹے اور مجھے تھما دیئے!

واپس فیروز پور روڈ آنے کے بعد میرا رخ اچھرے موڑ کی طرف تھا۔ اچھرے موڑ پر ڈیڑھ دو سو کے قریب مزدور ہاتھ میں برش' کوچی اور کدالیں وغیرہ پکڑے کھڑے تھے' مضافات سے مزدوری کی تلاش میں آنے والے یہ لوگ روزانہ شہر کے مختلف چوراہوں میں کھڑے نظر آتے ہیں اور روزانہ خالی گھروں میں لوٹ جاتے ہیں' جہاں ان کے بچوں کی گرسنہ آنکھیں ان کی منتظر ہوتی ہیں چنانچہ میرے لئے یہ منظر نیا نہیں تھا۔ شمع سینما سے آگے دائیں ہاتھ پر جیل کے دروازے کے باہر بیسیوں عورتیں' بچے اور بوڑھے اپنے ان لواحقین سے ملنے آئے تھے جن پر ابھی جرم ثابت نہیں ہوا لیکن وہ برسوں سے اس حوالاتی جیل میں بند ہیں۔ آگے چل کر چند دو ہیں مدقوق سے چہرے نظر آئے' یہ سب ننگے پاؤں تھے' ان کے کپڑے بوسیدہ تھے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ آگے آگے ڈھول بج رہا تھا اور پیچھے چار افراد ایک سبز رنگ کی چادر کو چاروں کونوں سے پکڑے چل رہے تھے۔ ان کی کوئی مراد بر آئی تھی چنانچہ وہ کسی بزرگ کے مزار پر شکرانے کے لئے چادر چڑھانے جا رہے تھے' رستے میں دیواریں جعلی حکیموں اور جعلی ڈاکٹروں کے اشتہارات سے بھری پڑی تھیں۔ جعلی لیڈروں کے بڑے بڑے پوسٹر بھی دیواروں پر لگے تھے۔ میں نے گاڑی مزنگ چونگی سے کوئنز روڈ کی طرف موڑ لی۔

یہاں نئی نکور چمکتی دمکتی کاروں کے شوروم تھے۔ لاکھوں روپے مالیت کی ان کاروں کے خریدار یہاں نوٹوں سے بھرا بریف کیس لاتے ہیں اور نئے ماڈل کی کار لے کر اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ جہاں تمام افراد خانہ کی الگ الگ کاریں پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ پلازہ سینما سے چند قدم آگے جانے کے بعد میں نے اپنی گاڑی بائیں جانب موڑی اور "نوائے وقت" کے دفتر کے سامنے کھڑی کر کے اوپر میگزین سیکشن میں چلا آیا اور اپنی ڈاک کھول کر دیکھنے لگا۔

پہلا خط تاندلیانوالہ کے ایک قاری کا تھا' اس نے لکھا تھا۔

''قاسمی صاحب! آپ اکثر ادھر ادھر کے موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں' جن کا ہمارے اصل مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں ملک کا سب سے بڑا مسئلہ اخبارات میں خواتین کی تصویروں کی اشاعت کا ہے۔ یہ تصویریں دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور شرمندگی سے میری آنکھیں جھک جاتی ہیں' کیا ہم نے پاکستان اسی لئے بنایا تھا کہ.....''

◆◆◆